قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ
اردو دنیا
دھلی
Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ہندوستان کی دو عظیم شخصیات

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

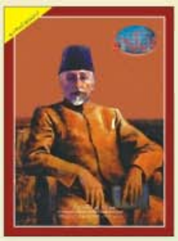

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:03 مارچ 2015

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
شائستہ یوسف — غضنفر اقبال 9

زبان و تعلیم
ہندوستان میں خطاطی کا ارتقا اور چند ہندو خوشنویس — عبداللہ عثمانی 11
ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی اہمیت اور مستقبل — دلجیت ورما 14

ادبی مباحث
غالب کے فارسی و اردو ہم معانی اشعار — عبدالحق 17

جاوید نامہ-اقبال — سید تقی عابدی 21
رتن ناتھ سرشار کے ناول — علی احمد فاطمی 24
مثنوی 'سحر البیان' اور 'ہندوستانی معاشرت' — فرزانہ نسیم 28
اردو میں تخلص کی روایات — شمیم احمد صدیقی 31

خراج عقیدت
بیادِ سید حامد — مظفر حسین سید 33
آر کے لکشمن — لئیق رضوی 37

شخصیت
جون ایلیا-فرد اور شاعر — عظیم اقبال 40

ہماری مطبوعات
راج کاج — آچاریہ چانکیہ
مترجم: شان الحق حقی 42

تہذیب و ثقافت
ہولی-یکجہتی کی علامت — سیدہ شان معراج 47

ادب و فلسفہ
بیان کی تلاش — محمود شیخ 50

نفسیات
ڈی بونو کی چھ مفکرانہ ٹوپیاں اور اردو تدریس — محمد قمر سلیم 55

فلم
مجروح سلطان پوری غزل گوئی سے فلمی شاعری تک — انجینئر محی بخش قادری 58

طب
ابو مروان عبدالملک ابن زہر دنیا کا ایک اہم طبیب — عبدالناصر فاروقی 62

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 65

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 76

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 78

ہماری بات

مارچ کے مہینے کو اگر ہم اردو کا مہینہ کہیں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان و ادب کی سب سے برگزیدہ شخصیت امیر خسرو کی ولادت اسی ماہ ہوئی تھی۔ کسی بھی زبان کے ادب کی شروعات شاعری سے ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ شاعری ہر زبان کے ادب کی بنیاد ہوتی ہے اور وہی کسی زبان کو باقاعدہ زبان کا درجہ دلاتی ہے۔ شاعری کے بعد کہیں جا کر ادب کی تخلیق کا عمل نثر کا جامہ پہنتا ہے۔ شاعری کا تخلیقی عمل شروع نہ ہو تو زبان ایک مختصر سے علاقے کی بولی یا بولنے کا ایک طریقہ بن کر رہ جائے جس کی نہ عمر زیادہ ہوگی نہ علاقہ بڑا ہوگا۔ اردو کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ سنسکرت، پراکرت، فارسی، عربی، ترکی اور کھڑی بولی کی آمیزش سے ہندآریائی زبانوں کے خاندان میں جو نئی طرح کی عوامی بول چال سات آٹھ سو برس پہلے پروان چڑھ رہی تھی، فارسی کے عظیم صوفی شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی نے اس کی انگلی نہ تھامی ہوتی اور ملی جلی ہندوستانی تہذیب کے منظوم اظہار اور بیان کا ذریعہ اس بول چال کو نہ بنایا ہوتا تو وہ آج کی اردو زبان اور اردو تہذیب نہ بنتی۔ اور اگر بن بھی جاتی تو پھر شاید اس کا نام کچھ اور ہوتا، اور شکل اور ساخت بھی کسی اور طرح کی ہوتی۔

یہ طوطیِ ہند امیر ابوالحسن یمین الدین خسرو کی، اسلامی تصوف و روحانیت کے فلسفے اور خالص ہندوستانی تہذیب کے رنگ میں رچی بسی، اپنی وضع کی انوکھی انسان دوست شخصیت کا فیض تھا — اور ہے، کہ اردو کسی ایک مذہب، عقیدے یا مسلک کی نہیں بلکہ شمالی و جنوبی ہند کے وسیع خطے کی بیش تر آبادیوں کی زبان بن کر سامنے آئی اور رفتہ رفتہ پورے ملک میں عوامی رابطے کی زبان بن گئی۔ جس طرح ہندوستانی بھگتی سنگیت کو قوالی، اور شاستریہ سنگیت کو خیال و ترانہ امیر خسرو کی دین ہیں اسی طرح اردو زبان بھی ایک طرح سے ان ہی کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ جس کے ادب کو انھوں نے پہلی بار غزل کی صنف سے متعارف کرایا اور خمسہ و مثنوی کو اپنے فارسی کلام کی بدولت رواج دیا۔ 3 مارچ (1253 عیسوی) اردو کے اس اولین شاعر اور عظیم صوفی کا یوم پیدائش ہے، جسے قومی اردو کونسل نے حکومت کی منظوری سے یوم اردو کے طور پر منانے کی شروعات کی ہے۔

'اردو دنیا' کا فروری 2015 کا شمارہ پریس میں جا چکا تھا کہ اطلاع آئی، ہندوستان کے آج تک کے سب سے مشہور کارٹونسٹ آر کے لکشمن ہمارے بیچ نہیں رہے۔ راسی پورم کرشنا سوامی لکشمن، انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ ادیب اور فکشن نگار، جناب آر کے نرائن کے چھوٹے بھائی تھے جن کا 13 مئی 2001 کو 95 برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔ بڑے بھائی کی طرح آر کے لکشمن نے بھی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ انھیں دنیا کے چند اہم ترین کارٹونسٹوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ہندوستانی صحافت میں کارٹون نگاری — خاص طور سے سیاسی کارٹون نگاری کے ایک پورے عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ عام ہندوستانی شہری یا 'کامن مین' ان کا سب سے مقبول کارٹون کیریکٹر تھا جو روزانہ اخبار میں You Said It کے عنوان سے شائع ہونے والے ان کے کاٹون کالم کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ فارغ البال سر اور ٹوتھ برش جیسی موچھوں والا ادھیڑ عمر کا یہ Common Man یا عام آدمی کبھی کسی نیتا کا بھاشن سننے والوں میں بیٹھا ملتا، کبھی کسی دفتر میں جھانکتا ہوا نظر آتا اور کبھی کسی وزیر کی اپنے ماتحتوں یا ساتھیوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو سنتے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ لکشمن تقریباً ہر روز ہماری سیاسی سماجی زندگی کا کوئی آڑا ترچھا منظر چن کر فنکارانہ چابک دستی سے طنزیہ مزاحیہ انداز میں پیش کر دیتے تھے اور یہ 'عام آدمی' اس منظر کو کسی عام سی جگہ پر حیرت، استعجاب، استہزا، مایوسی، شک اور آگہی جیسے مختلف تاثرات اور زاویوں سے دیکھتا ہوا نظر آیا کرتا تھا۔ مگر یہ بولتا کبھی نہیں تھا۔ اس کردار کو کبھی زبان کھولتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اس کی خاموشی ہی اپنے آپ میں ایک بھرپور تبصرہ ہوا کرتی تھی۔ کارٹون نویسی کی یہ اتنی زبردست اور پراثر تکنیک تھی کہ لوگوں نے اس کردار کے مجسمے تک بنوا دیے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ شاید پہلا موقع تھا جب کسی کارٹونی کردار کے بت بنوائے گئے۔ لکشمن کو ان کی زندگی میں پدم وبھوشن جیسا اعلیٰ سرکاری اعزاز بھی دیا گیا جو بھارت رتن سے صرف ایک درجہ نیچے ہے۔ لیکن ان کے لیے 'کامن مین' کے مجسموں سے بڑا کوئی اور اعزاز نہیں تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مجسمے آنے والی نہ جانے کتنی نسلوں کو آر کے لکشمن کی یاد دلاتے رہیں گے۔ 'اردو دنیا' کی طرف سے ہم اس شاندار شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ اردو کے نہایت معتبر اور معزز شاعر ڈاکٹر کلیم عاجز کے رحلت فرمانے کی خبر نے دلوں کو غم سے بھر دیا ہے۔ مشاعروں کے تعلق سے ڈاکٹر عاجز دنیا بھر میں مشہور تھے۔ لیکن ان کا اصل امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے داغ اور جگر کے مکتب ہائے فکر و سخن والی کلاسیکی اردو غزل کو جدیدیت کا جامہ پہنایا۔ پچھلے دس پندرہ سال سے انھوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ مشاعروں کا گرتا ہوا معیار ان کی طبیعت پر گراں گزرنے لگا تھا۔ پدم شری ڈاکٹر کلیم عاجز کو قومی اردو کونسل خراج عقیدت پیش کرتی ہے 'اردو دنیا' کے آئندہ شمارے میں ہماری کوشش رہے گی کہ عاجز صاحب کے فن اور شخصیت پر تفصیلی گفتگو ہو تاکہ نئی نسل کو گزشتہ صدی کے اس منفرد شاعر کی اہمیت و عظمت سے واقفیت ہو سکے۔

آخر میں 'اردو دنیا' کے تمام قارئین قومی اردو کونسل کی طرف سے ہولی کی پرخلوص مبارکباد قبول فرمائیں!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

ڈاکٹر ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' کا نئے سال کا پہلا شمارہ حسن طباعت اور کتابت اور اس سے بڑھ کر اعلیٰ پایے کے ادبی اور حددرجہ معلوماتی مضامین اور مقالات پر مشتمل موصول ہوا۔ اس کے حسب ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ کور اسٹوری- حالی صدی کے تحت: حالی کی شخصیت خود نوشت اور مکاتیب کے آئینے میں، حالی تنقید کا اخلاقی پہلو، حالی بہ حیثیت شاعر، موازنہ حالی وشبلی۔ زبان وتعلیم کے تحت: ملک میں اردو کے حالات اعداد وشمار کی روشنی میں، ادبی مباحث کے تحت اردو ناول میں سادیت پسندی، شہر بین کے تحت: اورنگ آباد کتابوں کی دنیا کے تحت تبصرہ وتعارف، ان مضامین کی اشاعت پر آنجناب دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ حالی کے کسی مضمون میں ان کی مغرب سے حددرجہ مرعوبیت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ اس کا ذکر ہے کہ محقق علامہ شبلی حالی پر زیادہ فوقیت رکھتے تھے۔

فیض اللہ خاں

محلّہ: فیض اللہ خان، خان صاحب کی ڈیوڑھی، دربھنگہ (بہار)

'اردو دنیا' کے تازہ شمارے میں الطاف حسین حالی کا گوشہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مضامین دیکھے۔ قدرے مایوسی ہوئی۔ امید تھی کہ 'یادگارِ غالب' یا 'مقدمۂ شعر و شاعری' پر کچھ چشم کشا باتیں پڑھنے کو ملیں گی۔ لیکن افسوس کہ مضامین میں وہ بات نہ تھی۔ حالی جیسی عظیم ادبی شخصیت کو خراجِ عقیدت ہی پیش کرنا تھا تو ذرا ڈھنگ سے یہ کام ہونا چاہیے تھا۔ اب قلم میں زنگ لگ گیا ہے۔ لوگ سرسری انداز سے لکھتے ہیں اور اگر حالی کے یہاں کوئی بات قابلِ گرفت ہے تو بلا خوف اس کی گرفت بھی کرنی چاہیے۔ ادب میں اختلاف اور نئی باتوں ہی سے ترقی پیدا ہوتی ہے۔ ادب کے فارمیٹ کے تحت بہت سی باتوں سے بحث کی گنجائش موجود تھی کاش کوئی مطمحِ نظر کے ساتھ لکھتا بھی!

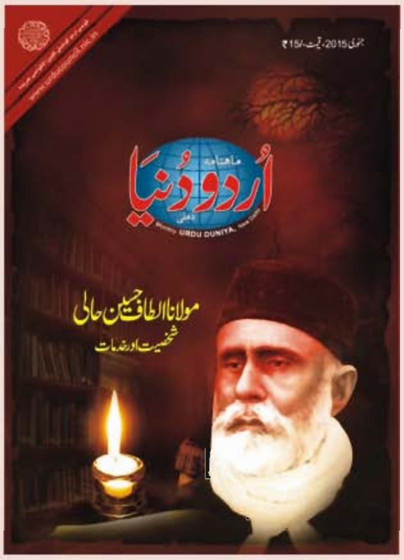

کرشن بھاوک

کوٹھی نمبر 201-A، گلی نمبر 18-k، گورونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' کا جنوری ماہ کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے کے آغاز میں 'آپ کی بات' میں شامل ایک مراسلہ نگار مصطفیٰ ندیم خاں غوری صاحب نے 'لغت' لفظ کے واحد ہونے پر مونث ہونے اور اسی لفظ کی جمع 'لغات' لفظ کے مذکر ہونے کی صورت میں استعمال ہونے پر اعتراض کیا ہے۔ اس خاکسار نے متعدد لغات کی بنا پر ہی ایسا خیال گزشتہ شمارے کے خط میں ظاہر کیا تھا۔ اسی شمارے میں لفظ 'رسم' مونث ہے، لیکن اسی کے جمع لفظ مذکر ہی ہوتا ہے اور اس لفظ 'رسوم' کی بجائے دوبارہ جمع لفظ 'رسومات' کا استعمال کیا گیا ہے۔ (صفحہ 51) 'رسوم' کے مذکر ہونے کی ہی درجہ بندی لغات میں ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح ندیم صاحب نے اپنے خط میں 'قدم' لفظ کی جمع 'اقدام' اور 'اقدامات' دونوں الفاظ کو صحیح قرار دینے کی زبردست وکالت کی ہے۔ عموماً علما وفضلا رواج وارتقائے زبان کے نام پر ایسے برخلافِ قاعدہ الفاظ کی پیروی کیا کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں آئے دن ٹی وی پر بھی سیریلوں میں حالاتوں۔ جذباتوں، اخبارات وغیرہ دوہرے جمع والے الفاظ کا دھڑلے سے تصرف ہوتا دیکھ کر شرمندگی کا احساس مجھ جیسے اردو زبان کے دلدادہ کرتے رہتے ہیں۔ کیا ہم نئی نسلوں کے طلبا کو یہی سکھانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں کہ جمع الفاظ کے طور پر 'اقدام' اور 'اقدامات'۔ نیز 'حالات' و 'حالاتوں' اور 'جذبات' و 'جذباتوں' دونوں ہی تصرف صحیح ہیں اور امتحانات میں بھی دونوں طرح کا تصرف کرنے والے طلبا کو برابر کے نمبروں کا حقدار مانا جائے گا؟ ہندی اور پنجابی اخبارات میں اکثر سرخیوں تک میں 'بوال مچ گیا' لکھا جاتا ہے، جو کہ 'وبال' لفظ کا بھی سراسر غلط تصرف ہے۔ اسی شمارے میں جناب محمد سلمان بلرام پوری نے میرتقی میر پر مبنی اپنے مضمون میں 'ذکرِ میر' جیسی اعلیٰ پائے کی کتاب کے ترجمے میں ایک اقتباس کے تحت اس فقرے میں صحیح تصرف 'وبال' ہی لکھا ہے۔ ''بے عشق زندگی وبال ہے'' (صفحہ 54) مرزا غالب کا بھی ایک شعر اسی صحیح املا 'وبال' کی ہی یوں توثیق وتائید کرتا ہے۔ ''فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں، میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔''

تو کیا علما فقط تصرف کی بنا پر ہی دونوں طرح سے مستعمل الفاظ 'بوال' اور 'وبال' کے املا کو صحیح گردانیں گے؟ اردو میں ترکی زبان کے ایک لفظ 'تمغا' کو بھی بعض اوقات 'تغما' یا 'تغمہ' کی صورت میں مستعمل دیکھا گیا ہے۔ تو کیا مروجہ ہونے کے موجب ایسے تمام تر الفاظ کی دونوں ہی صورتوں کو ٹھیک کہا جائے گا؟

ڈاکٹر شمس بدایونی

58، نیو آزاد پورم کالونی، عزت نگر، بریلی

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ملا۔ مولانا حالی پر گوشہ شائع کرکے آپ نے حالی صدی کا تھوڑا بہت حق ادا کردیا ہے۔ مضامین کے عنوانات میں تنوع ہے۔

ایک گزارش بڑے ادب کے ساتھ۔ تاریخوں کے اندراج میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ آپ کے اداریے میں حالی کی وفات کی تاریخ 31 دسمبر 1914 لکھی ہے۔ صحیح یکم جنوری 1915 ہے۔

حالی کی سوانح سے متعلق تاریخوں پر جم کر تحقیق نہیں ہوسکی ہے۔ ادھر حالی وشبلی صدی سیمیناروں میں بھی حالی کے سوانح سے متعلق کوئی مقالہ نہیں پڑھا گیا اور بعض غلط سنین اور تاریخیں دہرائی گئیں۔

حالی کی وفات کی تاریخ کے متعدد اندراج ملتے ہیں۔ 30 دسمبر، 31 دسمبر، یکم جنوری۔ ان میں سے کون سی صحیح ہے؟ 'وفیات مشاہیر اردو' میں 31 دسمبر ہے (ص: 204)۔ 'قاموس المشاہیر' جلد 1، طبع جدید میں 30 دسمبر ہے (ص: 189)۔ حالی کے شاگرد نظامی بدایونی کی مرتبہ کتاب کسوف الشمسین (مطبوعہ بدایوں 1915) میں لکھا ہے:

''امسال سالِ ہجری اور سالِ عیسوی دونوں کا روز آخر روئے علم وادب غم کدہ دنیا کے لیے نچوڑ کا دن تھا۔ ہنوز 1333 ہجری کے شروع ہونے میں ایک شب باقی تھی کہ داعی اجل نے شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کو جامِ فنا پلا دیا اور اسی طرح 1915 کی نمود کو ایک دن رہا تھا کہ ہادم اللذات نے شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی کے عیش زندگی کا خاتمہ کر دیا۔'' (ص:1)

حامد حسن قادری (ف 1964) نے قرآن کریم کی آیت (یٰسین، آیت 11) کے ایک ٹکڑے سے حالی کا سالِ وفات 1914 ہی برآمد کیا ہے: فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ (1914) لیکن نظامی کی مرتبہ کتاب کسوف الشمسین ہی میں حکیم کفیل الدین عالی بدایونی (ف 1959) کا ایک تاریخی قطعہ شامل ہے جس کے مصرعہ دوم سے شبلی کا سالِ وفات 1914 اور مصرعہ چہارم سے حالی کا سالِ وفات 1915 برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

حالی و شبلی سے قابل نامور اہلِ قلم (شبلی)
داغِ علمی دے گئے ہیں آفتابِ علم کو
1914
رونقِ میخانۂ مضموں نگاری اٹھ گئی (حالی)
روتے ہیں احباب مستانِ شرابِ علم کو
1915

(ص 48)

مالک رام نے تذکرہ ماہ و سال میں یکم جنوری 1915 کا اندراج کیا ہے (ص: 125)۔ متعدد تاریخیں رواج پاجانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ حالی کی وفات کے واقعے سے لوگ عام طور پر ناواقف رہے۔ 31 دسمبر 1914 اور یکم جنوری 1915 کی درمیانی شب کو دو بجے حالی کا وصال ہوا تھا (دیکھیے مقالہ حالی کے سوانح، از ڈاکٹر خلیق انجم، مشمولہ حالی نمبر، غالب نامہ دہلی، جولائی 2002، ص: 119)۔ شمسی نظام الاوقات کی رو سے 12 بجے شب کے بعد دوسرا دن اور اگلی تاریخ شروع ہوجاتی ہے۔ اس لیے یکم جنوری کو اختیار کرلیا گیا، اور یہ درست ہے۔ آئندہ بھی اسی تاریخ کا اندراج کیا جانا چاہیے۔

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اترپردیش، مقام: ٹانڈہ ضلع رامپور

اردو دنیا جنوری 2015 کا شمارہ وقت سے مل گیا۔ سرورق پر مولانا حالی کی بہترین اور پرکشش خوبصورت تصویر نے شمارے کو اور بھی زیادہ بیش قیمت بنا دیا۔ شمارے میں محترمہ ثنا کوثر اور محترمہ فریدہ خاتون کے حالی کی شخصیت اور فن سے متعلق مضامین بے حد پسند آئے۔ اردو کونسل کے چیئرمین پدم شری مظفر حسین کی خصوصی گفتگو بے حد متاثر کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ عبدالعلیم قدوائی کا مضمون 'ملک میں اردو کے حالات اعداد وشمار کی روشنی میں' کافی معلوماتی ہے۔

مصطفی ندیم خاں غوری

پلاٹ نمبر 4، زرینہ منزل، ورنداون کالونی قدیم جالنہ ضلع جالنہ مہاراشٹر

پچھلے سال دسمبر 27 کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں قومی اردو کونسل کے کتابی اور تہذیبی میلے کی افتتاحی تقریب میں شرکت کا شرف حاصل ہوا جس کی خوشنمائی اور تزئین دیکھتے ہی بنتی تھی جسے اردو کے چاہنے والوں کی شرکت نے اور سنوار دیا تھا۔ 'اردو دنیا' جنوری 2015 نئے سال کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ حسین سوغاتیں اپنے دامن میں سمیٹ لایا جن میں سب سے دلکش سوغات کور اسٹوری حالی صدی ہے جو کوئی 36 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ تمام تر عمدہ نگارشات جو علم میں اضافہ کرتی ہی چلی جاتی ہیں۔ صفحہ 14 اور 15 پر دیا گیا مضمون حالی کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ انگریزی دانی سے حالی کا کوئی تعلق ہے نہ ایسے بیان کا کوئی محل یا جواز۔ اس سے قدردانی میں کوتاہی کا امکان رہتا ہے۔ دیگر مشمولات میں مرزا حامد بیگ سے لیا گیا انٹرویو نہایت اثرانگیز ہے۔ کونسل کے وائس چیئرمین محترم مظفر حسین سے کی گئی خصوصی گفتگو نہایت سلجھی ہوئی ہے۔ صفحہ 6 پر 'ہندوستانی مسلمان' پر کیا گیا تبصرہ تذبذب کا شکار محسوس ہوتا ہے۔

اسلم مرزا

8 سالم کامپلیکس، پہلی منزل، برہانی نیشنل انگلش ہائی اسکول، اورنگ آباد

'اردو دنیا' جنوری 2015 کا شمارہ پڑھا۔ حالی صدی کے ضمن میں شامل تمام مضامین معلومات افزا اور نئے انداز سے لکھے گئے ہیں۔ شہزاد انجم کا مضمون 'حالی کی عشقیہ شاعری' خصوصی طور پر پسند آیا۔ شاہد اختر انصاری نے مظفر حسین صاحب سے جو گفتگو کی ہے اس سے مظفر حسین صاحب کے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ڈائرکٹر صاحب اور مظفر حسین صاحب کونسل کو مزید اونچائیوں سے ہمکنار کریں گے۔

مرزا حامد بیگ کا انٹرویو بے حد اہم ہے۔ 'شہربین' کے زیرعنوان 'شہر اردو اورنگ آباد' پر رفعت سعید قریشی کی تحریر عمدہ ہے۔ اورنگ آباد کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق اردو کے منظرنامے پر وہ مزید روشنی ڈالتے تو بہتر ہوتا۔ انھوں نے تاریخ پر زیادہ توجہ دی ہے۔ ان کے مضمون میں اورنگ آباد میں منعقدہ کتابی میلے کا بھی ذکر آگیا جس میں آپ بہ نفس نفیس تشریف فرما تھے۔ آپ نے اس میلے میں جو مثبت کردار ادا کیا اسے اہلیان اورنگ آباد شاید ہی کبھی فراموش کرسکیں۔

انوار فلک

جے آئی ٹی کالج، مشرقی چمپارن، موتیہاری، چندنبارہ

جنوری 2015 کے شمارے سے اس بات سے واقفیت ہوئی کہ حالی ہی اردو کے ناقد اول ہیں جنھوں نے اردو کی شعری اصناف، غزل، قصیدے اور مثنوی کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے فکری وفنی بنیادوں پر ان کا محاسبہ کیا۔ انھوں نے ادبی تنقید، سوانح نگاری، انشاپردازی سے اردو کو چمکایا۔ یوں تو سارے مضامین اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں مگر اسما مسعود کے مضمون کا عنوان انقلابی اور حیات مستعار میں کامیابی کا روح رواں ثابت ہوا۔ محمد سلمان بلرام پوری نے میر کی شاعری میں عشق کے رنگ کو بہت اچھے انداز سے واضح کیا۔ ہاں 'یادگارِ غالب کا آخری باب' میں ایک جگہ قصیدہ لکھا ہے جو قصیدے ہونا چاہیے۔

شمس الھدیٰ انصاری (علیگ)

چھوٹے حاجی صاحب، نشاط نگر، واسع پور، دھنباد

جنوری 2015 کا 'اردو دنیا' بروقت ڈاک سے دستیاب ہوا۔ نابغۂ روزگار ہستی مولانا الطاف حسین حالی کا اجمالی گوشہ شائع فرماکر آپ نے شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ حالی سرسید کے رفقا میں بہت نمایاں تھے۔ سرسید کے تعلیمی مشن میں حالی نے سرسید کا بھرپور ساتھ دیا۔ دونوں عظیم ہستیوں کے افکار میں مکمل مطابقت تھی۔ حالی نے سرسید پر ایک سیر حاصل سوانح لکھی 'حیاتِ جاوید' لیکن اس ضمن میں رسالہ اردو دنیا خاموش ہے۔

ڈاکٹر معراج الدین خاں

صدر شعبہ اردو ایم این آر اے پی جی کالج، نانپارہ بہرائچ

اردو دنیا، جنوری 2015 کا شمارہ نظرنواز ہوا، شمارہ

نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی کے ذریعے مرزا حامد بیگ صاحب کا انٹرویو حاصل شمارہ ہے۔ مضامین میں ڈاکٹر ندیم احمد، پروفیسر شہزاد انجم کے مضامین جامع اور تحقیقی ہیں۔ ڈاکٹر طاہر صاحب نے حالی اور شبلی کا بخوبی موازنہ کیا ہے۔ زرینہ خانم کا مضمون 'اردو ناول میں سادیت پسندی' اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے کیونکہ میں فکشن کا طالب علم ہوں اور میری تحقیق کا موضوع ناول تھا۔ اس لیے مزید میری دلچسپی کا باعث بنا۔ اردو ناول میں مختلف قسم کے تجربات کیے گئے ہیں سادیت یا ساکیت کا تعلق نفسیات سے ہے یہ ایک قسم کی ذہنی بیداری ہے۔ برٹش مصنفہ ای ایل جیمس کا ناول 'ففٹی شیڈس آف گرے' اسی قبیل کا ناول ہے جس میں امیر تاجر 'گریشچین گرے' اور کمسن طالبہ اینا سٹیا اسٹیل کی کہانی ہے جس میں ہنٹر کے ذریعے اذیت کے ساتھ جنسی لطف پہنچاتا ہے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم

صدر شعبۂ اردو، جمشید پور، ویمنس کالج

سال نو 2015 کی پرخلوص مبارکباد! نہایت مشکور ہوں کہ اردو دنیا بروقت دستیاب ہو رہا ہے اور اس کے خوبصورت سرورق کے ساتھ ساتھ پرمغز اور نئی اطلاعات وتحقیقات سے بھرپور مضامین سے ذہن کو سرشاریاں حاصل ہو رہی ہیں۔ حالی کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر مرکوز یہ شمارہ حالی سے متعلق کئی نئے انکشاف کرتا ہے۔ حالی کی ذات اردو شعر وادب میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اداریہ کی بصیرت افروز گفتگو، خطوط کے گوشے، انٹرویو، زبان وتعلیم، شہربین، کریئر، کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ، خبرنامہ، تبصرہ وتعارف، ان سارے مشمولات نے 'اردو دنیا' کو شاہکار بنادیا ہے۔

فیض سیفی

چندن بارہ، مشرقی چمپارن، بہار

نئے سال کے پہلے ماہ میں اردو ادب کے پہلے تنقید نگار مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت اور ان کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، اس شمارے کے موصول ہونے سے پہلے تک یہ بندۂ خدا صرف ان کے اسم گرامی سے ہی واقف تھا پھر اس ہردلعزیز رسالہ، منبع علم و ادب، چشمۂ فکر وفن نے ہم قارئین کو اس عبقری شخصیت کے روشن حیات، لافانی خدمات اور اعلیٰ محرکات سے روشناس کرایا۔ عبدالعلیم قدوائی صاحب کا مضمون ملک میں اردو کے حالات کے تعلق سے کافی معلوماتی رہا۔ اسما مسعود کا مضمون 'جیت آپ کی مٹھی میں' کافی حوصلہ افزا اور روح افزا رہا، اس مضمون کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوار العلوم رام نگر، بارہ بنکی

ماہنامہ اردو دنیا جنوری 2015 مولانا حالی صاحب کی خوبصورت تصویر کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ قومی اردو کونسل کے نومنتخب وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین صاحب سے شاہد اختر انصاری کی خصوصی گفتگو بہت ہی بہتر انداز میں سپرد قلم ہوئی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ محترم چیئرمین صاحب نے اردو زبان وادب سے متعلق تاریخی وادبی وراثتوں کی حفاظت کے لیے اردو کی ایک گیلری بنائے جانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ہر اردو داں کو قومی اردو کونسل سے بہت امیدیں ہیں۔ کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین جو کہ اعلیٰ صلاحیت کے بحر ذخار ہیں۔ یقیناً آپ حضرات مل کر اردو زبان کو بلندیوں تک پہنچانے کا کام کریں گے۔ بقول انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف صاحب کے کہ جب تک اردو رسم الخط کو ابتدائی اور ثانوی سطح پر نہیں پڑھایا جائے گا اس وقت تک اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آج اردو زبان کی یہی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لیے حکومت کی خصوصی توجہ درکار ہے۔

نصرت ظہیر کا 'اردو تنقید کے جدّ عالی خواجہ الطاف حسین حالی' بڑے ہی محققانہ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔ کوراسٹوری میں شامل سبھی مضامین بہت ہی اہم ہیں۔ دیگر مضامین بھی بہت خوب ہیں۔

مولانا محمد زاھد علیمی

خطیب وامام، رضا جامع مسجد مجلا پور ضلع اکولہ

جنوری کا تازہ شمارہ ہاتھوں میں آتے ہی پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ اردو دنیا کا پچھلے سال سے مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ رسالے میں شائع ہونے والے تمام کالم بے حد معلوماتی ہوتے ہیں۔ بغیر کسی مبالغے کے کہتا ہوں کہ قومی کونسل نے اردو زبان وادب کو نئی راہ عطا کی ہے اور اردو کو عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے میں تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔

رحمت کلیم امواوی

سابرمتی ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو زبان وادب کی نمائندگی کرنے والے رسالے 'اردو دنیا' کے سال نو کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی پر جن سے مجھے عقیدت کی حد تک محبت ہے اس مخصوص شمارے کے لیے میں مجلّہ کے مدیر و دیگر تمام ارکان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مشمولات میں جس قسم کے اعلیٰ معیار کے مضامین شامل ہیں ان کو پڑھنے کے بعد یہ آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا حالی کی شخصیت اور اردو نثر ونظم میں جو کچھ ان کی خدمات ہیں اور جن کے ہر پہلو پر ضخیم کتابیں تحریر کی گئیں ہیں اگر ان مضامین کو ایمانداری کے ساتھ کوئی پڑھ لے تو میں سمجھتا ہوں کہ قاری کو شاید ان کتابوں کی مدد کی چنداں ضرورت نہ ہو گی۔ بہرکیف رسالے کا اداریہ 'ہماری بات' جہاں اردو میں تنقید نگاری کے حوالے سے غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے کافی اہم ہے وہیں مشمولات میں پروفیسر شہزاد انجم کی تحریر انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور جس انداز میں انھوں نے مولانا حالی کی عشقیہ شاعری سے اصلاحی شاعری تک کے سفر کو پیش کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ ساتھ ہی ثنا کوثر کا مضمون بھی سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ علاوہ ازیں دیگر تمام مضامین بھی خوب ہیں۔

شھلا پروین

دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

'اردو دنیا' جنوری کا شمارہ الطاف حسین حالی کی خوبصورت تصویر سے سجا کور پیج کے ساتھ دستیاب ہوا۔ یہ ادبی رسالہ حسن کتابت وطباعت سے مالامال ہونے کے ساتھ متعدد گراں قدر معلوماتی اور محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس شمارے میں حالی پر سبھی مضامین پسند آئے۔ رفعت سعید قریشی صاحب کا مضمون 'شہر اردو اورنگ آباد' ایک تاریخی مضمون ہے۔ انھوں نے صوبے کے جو اعداد وشمار پیش کیے ہیں وہ بے حد معلوماتی ہیں۔ دیگر مشمولات بھی قابل تحسین ہیں۔

جھانگیر احمد

سینئر مانیٹر، الیکٹرانک میڈیا مانیٹرنگ سینٹر، سوچنا بھون، سی، جی، او کمپلیکس، نئی دلی

'اردو دنیا' کا جنوری 2015 کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ نئے سال کا یہ پہلا شمارہ نئی تازگی کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ حالی صدی کے موقع پر مولانا الطاف حسین حالی کو یہ خراج عقیدت، اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے NCPUL کا ایک حسین تحفہ ہے۔ ہونا بھی چاہیے کیونکہ پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے زیر قیادت ادارے نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ اردو کو ملک کے کونے کونے اور بیرون ملک تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے اس نے اردو داں طبقے میں امید کی ایک نئی کرن جگادی ہے۔ ادارہ کی نئی کمیٹی کی تشکیل اور ممبران سے اس امید کو اور بھی جلا ملتی ہے۔

ادارے کے وائس چیئرمین مظفر حسین کا انٹرویو ادارہ سے محبت کرنے والوں کے کئی خدشات کا ازالہ کرتا ہے اور امید جگاتا ہے کہ موصوف جیسی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کی سرپرستی میں ادارہ مزید اونچائیوں کو چھوئے گا۔ حالی سے متعلق مضامین کا انتخاب ان کی شخصیت کے تمام اہم زاویوں کا احاطہ کرتا ہے۔

فرقان احمد۔ غوری خان

مقیم کتوا، ضلع بیلگام کرناٹک

اردو دنیا کے ہر شمارے کے تمام مشمولات قابل قدر و قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ شمارے کے اکثر مضامین اچھے، جبکہ چند مضامین تو بہت ہی اچھے اور قابل تعریف ہوتے ہیں۔ 2014 دسمبر کے شمارے میں صغیر افراہیم صاحب نے 'بچوں کی دنیا' سے متعلق مضمون میں مذکورہ رسالے کی مقبولیت کی تحسین کے ساتھ جہاں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں مستقبل قریب میں یہ ماہنامہ اپنے معیار کو برقرار نہ رکھ پائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ ادب اطفال کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ اورنگ آباد (مہاراشٹرا) میں بچوں کی دنیا کی مقبولیت جہاں اورنگ آباد کے اردو داں افراد کی اردو سے محبت کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے وہیں اس کار خیر میں مرزا عبدالقیوم ندوی بھی برابر کے شریک ہیں۔ اردو داں آبادی کو اردو کے رسائل اور ماہناموں سے جوڑنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس ضمن میں مرزا عبدالقیوم ندوی صاحب کے طریقہ کار کو اپنایا جاسکتا ہے۔

محمد عرفان

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، اردو اور عربی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ

'اردو دنیا' دسمبر 2014 کا شمارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اردو دنیا کا ہر شمارہ قابل تحسین ہے۔ قومی اردو کونسل کا یہ جریدہ فروغ اردو کے لیے ایک بہترین کاوش ہے۔

محمد امتیاز، والد محمد منہاج

دوسرا تلہ، اسمٰعیل مارکیٹ، دھنباد

دسمبر 2014 کا 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ رسالے کے تمام مشمولات بے حد معیاری اور خوبصورت اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین کیے گئے ہیں۔ ہماری مطبوعات کے تحت احوال میر تقی میر پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔

متین اچل پوری

مقابل مسجد، اکبری چوک، بیابانی، اچل پور، امراوتی

جنوبی ایشیا کے ممالک کی اردو کانفرنس کا خیال بہت اچھا ہے۔ اگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو اردو کے

مزاج، اہل اردو کے اصل تشخص اور انسان دوستی کے دل نشیں رنگ ان ممالک کے سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی منظرنامے میں خوشگوار تبدیلی کا سبب ہوسکتے ہیں۔ ہمارے جذبۂ خیر سگالی، انکسار، رواداری، خلوص و محبت، عفو و درگزر، ایثار و قربانی سے متصف افکار و خیالات کی اردو زبان کے توسط سے بالائی سطح پر نمود کو دنیا مستحسن نگاہوں سے دیکھے گی۔ سارک ممالک کے مابین باہمی رشتے خوشگوار ہوں گے نیز باہمی اعتماد و تعاون کو فروغ حاصل ہوگا۔

صغیر اشرف

اردو کاؤنسلر، اوپن یونیورسٹی (پی جی کالج)، کھتاری پام نگر

'اردو دنیا' کے بارے میں تعریفی کلمات ادا کرنا یا کچھ لکھنا... 'روشنی کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا...'

ہاں: نومبر 2014 کے شمارے میں مطبوعہ خاکسار کا مضمون 'انسانی قدروں کا مرقع نگار۔ کرشن چندر...' میں کرشن چندر کے مقام پیدائش کے شاکی جناب عبدالرحمٰن صاحب (نئی دہلی) کے دسمبر 2014 میں مطبوعہ خط کے حوالے سے عرض کرنا چاہوں گا کہ پاکستان میں کرشن چندر کے قریبی مانے جانے والے پاکستان کے نامور ادیب نقاش کاظمی کی 'روزنامہ جنگ کراچی' میں شائع تحریر کو جسے 'بیسویں صدی' دہلی نے اپنے کرشن چندر نمبر مئی 1977 صفحہ 73 پر کچھ یوں شائع کیا ہے... کرشن چندر یوں تو 1914 میں جموں و کشمیر کے شہر پونچھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر اس شہر کی پیداوار ہیں جہاں انسان بستے اور سانس لیتے ہیں...' اسی حوالے سے خاکسار نے اپنے مذکورہ مضمون میں کرشن چندر کا مقام پیدائش 'پونچھ' تحریر کیا ہے۔

محمد فیضان ضیائی

معرفت مظفر حسن عالی، محلہ: بارہ دری، سہسرام
ضلع: روہتاس، بہار

آج ادبی دنیا میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں، شہروں اور قصبوں سے بے پناہ اردو رسائل شائع ہورہے ہیں۔ اردو دنیا کے آسمان ادب پر رسائل کا طلوع ہونا ایک فال نیک ضرور ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ رسالے دھوم دھام سے نکلتے تو ضرور ہیں لیکن کچھ شماروں کے بعد بند بھی ہوجاتے ہیں۔ میں یہاں کسی ادبی رسائل کو حقارت کی نظر سے پیش نہیں کرنا چاہتا لیکن ایک بات ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آج اردو دنیا میں اچھے اور معیاری رسائل بہت کم شائع ہورہے ہیں جن میں ایک نام 'اردو دنیا' کا بھی ہے۔

اردو دنیا کا کرشن چندر نمبر زیر مطالعہ ہے۔ سرورق پر کرشن چندر کی تصویر کے درمیان جلتے ہوئے چراغ کی کرنیں عظمت رفتہ کو آواز دے رہی ہیں۔ ایسا خوبصورت اور رنگ و روغن سے مزین رسالہ سخت محنت کے بعد ہی نکلتا ہے۔ اس کے لیے رسالے کے مدیر و منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ویسے تو کرشن چندر پر بارہا مختلف ادبی رسائل نے نمبر شائع کیے ہیں۔ لیکن 'اردو دنیا' کا یہ گوشہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ گوشے میں شامل مختلف شخصیات کے گیارہ مضامین اپنی اپنی امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ بالخصوص علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون میں کرشن چندر کی اشتراکی بصیرت کو انتہائی جاں فشانی سے پیش کیا ہے۔ ستار فیضی صاحب کا مضمون 'کرشن چندر اور ادب اطفال' ہماری معلومات میں اضافے کا سبب بنا۔ احمد وصی کا انٹرویو کافی دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تحریروں کا ایک ایک لفظ کیف و مستی سے بھرپور ہے۔

■

گزارش

کالم آپ کی بات آپ سبھی قارئین کا کالم ہے۔ اس کالم میں ہم آپ کے مشوروں اور شمارے کے حوالے سے آپ کی آرا کو شائع کرتے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ شمارے کی تعریف و توصیف کے علاوہ شمارے میں شائع شدہ تحریروں پر صحت مند تنقید کریں تاکہ قلمکار حضرات اپنی تحریر میں مزید بہتری لاسکیں اور ہم بھی اردو دنیا کو اور خوبصورت اور اعلیٰ معیار کا رسالہ بناسکیں۔ (ادارہ)

غضنفر اقبال

شائستہ یوسف سے گفتگو

محترمہ شائستہ یوسف کا نام معتبر اور مؤقر شاعرات کے ذیل میں اعتبار کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں تانیثیت کو اہم جگہ دی ہے اور نثری نظم کے اظہاریے کے امکانات کو روشن کیا ہے۔ محترمہ شائستہ یوسف، مشہور زمانہ رسالہ 'سوغات' کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ادب اور اختلاف سے بھی ان کی وابستگی ہے۔ ان دنوں وہ 'نیا ادب' کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں۔ محترمہ شائستہ یوسف سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات نذرِ قارئین ہیں:

غضنفر اقبال: محترمہ شائستہ یوسف صاحبہ! اُردو دنیا کے معزز قارئین کو بتائیے کہ آپ کا خاندانی پسِ منظر کیا ہے؟

شائستہ یوسف: میرے والد جناب سید عبدالرحمن عرف بچو سیٹھ حیدرآباد کے بہت ہی معزز زمین دار گھرانے کے بیٹے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد بمبئی میں مقیم ہوگئے اور تمام عمر یہیں گزاری۔ بمبئی آنے کے بعد اپنے کاروبار کے لحاظ سے عرفیت کانٹریکٹر رکھ لی اور آج ہمارا خاندان کانٹریکٹر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ والدہ بھی سید خاندان سے تھیں میرے نانا کا نام سید میر تراب علی شاہ قادری تھا۔ میری والدہ بنگلور میں پیدا ہوئیں اور شادی کے بعد بمبئی چلی گئیں۔ ہم نو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدین کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ باقی تمام بھائی اور بہن ماشاءاللہ خوش حال ہیں۔ ہمارا پورا خاندان ساٹھ افراد پر مشتمل ہے۔ میری شادی بنگلور کے ایک معزز پنساری ظہیر لشکر والا کے بیٹے امتیاز یوسف سے ہوئی اور میں بنگلور کی ہو کر رہ گئی۔ میرا سسرال حکیموں اور پنساریوں کا ہے۔ میرے چچا سسر حکیم عبیداللہ عرف دیوان میرے استاد رہے۔ حکمت انھیں سے سیکھی جس کو آگے میں نے اور میرے بچوں نے ہربل کاسمیٹکس کے پیشے میں تبدیل کیا اور آج ہماری ہربل کاسمیٹکس کی فیکٹری ہے۔ میرے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

غ ا: آپ شاعری کی طرف کب مائل ہوئیں؟

شائستہ یوسف: شاعری میری فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ساتویں جماعت میں پہلی نظم کہی تھی اور پھر دسویں جماعت سے انقلاب میں سولہ سنگھار ادبی صفحہ کے لیے مسلسل لکھتی رہی۔ اس وقت اکثر نظمیں اور غزلیں شائع ہوئیں۔ کچھ مضامین بھی لکھے جس میں بحث ومباحثے ہوتے تھے۔

غ ا: غزل اور نظم کے مبادیات کیا ہیں؟

شائستہ یوسف: غزل ایک پابند صنفِ سخن ہے کہ جس میں بحور، ردیف وقوافی کے علاوہ غزل کے ہیئتی پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے اس کے علاوہ غزل میں تغزل بھی بہت ضروری ہے بلکہ تغزل ہی اس صنف کو ممیز اور ممتاز بناتا ہے اور ہر قاری کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ جس عہد میں غزل گو جیتا ہے اس عہد کی حسیت کا اظہار بھی لازمی بن جاتا ہے۔ میرے نزدیک غزل کے مبادیات یہی ہیں۔ نظم بنیادی طور پر اک آزاد صنفِ سخن ہے لیکن آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ نظم میں ہیئت ومواد کا آہنگ نہیں ہونا چاہیے۔ ہیئت اور مواد کا آہنگ ضروری ہے چاہے وہ نثری نظم ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ان بنیادی اصولوں کو سامنے نہ رکھا جائے تو نظم اور نثر میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا آزادی کے نام ہر نظم کو کسی بھی طرح سے لکھا تو صحیح نہیں ہوگا یہی نظم کے مبادیات ہیں—

غ ا: آپ تخلیقی اظہار کے لیے آزاد نظم کو اہم سمجھتی ہیں یا نثری نظم کو؟

شائستہ یوسف: تخلیقی اظہار کے لیے میں کسی خاص پیمانے کی قائل نہیں ہوں۔ اظہار اپنی پناہیں خود تلاش کر لیتا ہے۔ جب احساسات اور جذبات لاشعور سے شعور کی سطح ہر الفاظ کی کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو منزل تک پہنچتے پہنچتے اپنی اظہار کی صورت لے لیتے ہیں پھر وہ آزاد نظم ہو کہ غزل۔ یہ الگ بات ہے کہ میری اکثر نظمیں نثری ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ فارم میری ذہنی آسودگی کے لیے زیادہ مناسب ہو اور یہی میرے اظہار کی تسکین کا ذریعہ—

غ ا: آپ کی شاعری کے بارے میں معتبر ناقدین نے لکھا ہے کہ آپ کے یہاں تانیثی رجحان کے پورے عناصر پائے

جاتے ہیں۔ میرا آپ سے سوال ہے کہ تانیثی شاعری کی کیا تعریف ہوگی؟

شائستہ یوسف: تانیثی شاعری کو دنیا کے ادب میں اپنا مقام مل چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تانیثیت کا وجود، وجودِ زن کے ساتھ جڑا ہے اور ایک عورت کے بغیر کسی بھی انسان کا تصور بے معنی ہے غیر ممکن ہے۔ عورت کا شعور اس کے جذبات اس کے احساسات ازل سے اس کے ساتھ رہے انسانی ذہن کے ارتقا، سماج اور تہذیب کی مختلف تصویروں میں یہ نقوش دھندلا گئے جنھیں نئی ہمت اور احساس نے اپنے ہونے کا اعلان کیا۔ عورت کو اپنے وجود کا احساس دلانے اور اپنی اہمیت حقوق کو تسلیم کروانے میں ادب بہترین وسیلہ رہا ہے۔ تانیثیت حقیقت میں وہ احساس ہے جو تذبذب میں مبتلا روح اور سماج میں مردانہ حکومت کی داستان ہے۔ ایک عورت کے وجود کا اقرار ہے۔ حسرتوں کا تمنا کے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اشکوں کا سمندر ہے۔ رشتوں کے بننے اور ٹوٹنے کی پیدوار ہے۔ آزادی کا تصور، زنداں کی صلیبیں ہیں۔ عورت کے جذبات، احساسات تخیلات کا لاشعور سے شعور کی جانب سفر ہے جو ادب کے جنگل میں تتلیوں کی طرح رنگین اور گلابوں کی طرح مہک رہا ہے۔ خونخوار جانوروں سے پناہ مانگتا ہے۔ سانپ کی پھنکار کے خون کو نکال پھینکتا ہے۔ شیروں پر سواری کرتا ہے۔ الفاظ کی ڈھال لیے ایک نئی ہمت کے ساتھ ادب میں زندہ ہے۔

غ ا: شائستہ صاحبہ! آپ نے تانیثیت کے سلسلے میں کافی گہری باتیں کی ہیں۔ آپ سے یہاں ایک سوال ہے کہ آپ کی زندگی کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ جس کو آپ فراموش نہیں کر سکتی؟

شائستہ یوسف: یوں تو انسان اگر ایک طویل عمر جی لے تو کئی واقعات ایسے ہوتے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ پھر بھی میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کر رہی ہوں جو میری ماں سے جڑا ہوا ہے۔ میری امی کا ایک آپریشن ہو رہا تھا۔ وہ بہت ڈرتی تھیں۔ ان کا بلڈ پریشر اکثر ہائی رہتا تھا۔ ویسے وہ صحت مند خاتون تھیں۔ اس آپریشن کے لیے ان کو آمادہ کرنا بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اس لیڈی ڈاکٹر سے ہمارے اچھے مراسم تھے اور وہ کیس کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ میری امی کو سنبھالنے کے لیے انھوں نے مجھے آپریشن تھیٹر میں سرہانے کھڑے رہنے کی اجازت دے دی اور امی کو یہ بتلایا گیا کہ صرف کچھ ٹسٹ لیے جا رہے ہیں۔ ایک انجکشن کے ساتھ ہی امی تو آہستہ آہستہ نیند میں چلی گئیں۔ میرا ہاتھ ان کے سر پر تھا میں نے دھیرے سے ہٹا لیا آپریشن شروع ہوا۔ اچانک درمیان میں ڈاکٹر کے ہاتھ رک گئے اور ہارٹ اسپیشلسٹ جو ساتھ کھڑا تھا پریشان ہو گیا۔ میں نے نرس اور ڈاکٹر کو دیکھا پھر مشینوں کی طرف دیکھا کہ ساری حرکتیں رک گئیں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ امی کا دل رک گیا ہے۔ فی الحال یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ان کے ساتھ کیا ہوگا۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ باہر جا کر اپنے گھر والوں کو اطلاع کروں اور دعا کی درخواست کروں۔ اب والدہ کی موت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا پھر بھی انجانی قوت اور نہ جانے کس ہمت پر باہر گئی۔ ماموں اور دوسرے گھر والوں کو بتا کر واپس آ گئی۔ میرے ابا اس وقت اسپتال میں موجود نہیں تھے۔ وہ امی کے لیے خون کا بندوبست کرنے گئے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا اگر ابا کے لوٹنے تک کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ابا کیسے سہہ پائیں گے۔ میرے والدین میں اتنی محبت تھی کہ ایک پل کو جدا نہیں رہتے تھے۔ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو چھوڑ کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ اگر کسی وجہ سے ایک کو دیر ہوتی دوسرا انتظار کرتا تھا۔ پھر میں پھرتی سے آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔ ان دنوں روزانہ یٰسین پڑھتی تھی اور ہر بار اس آیت پر رک جاتی جہاں خدا کہتا ہے **'کن فیکون'** میں جب کہتا ہوں کسی چیز کو ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ میں نے آپریشن تھیٹر میں یہی کہا آج تو کہہ دے ہو جا اور میری ماں کی زندگی لوٹا دے میں اپنے دل میں وہ آیت بار بار دہرا رہی تھی۔ تو چاہے تو مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ ادھر ڈاکٹرس، امی کے دل کو دبا کر پمپ کر رہے تھے اور دھیرے دھیرے مشین کا کانٹا ہلا اور میری امی نے نیند سے ایک گہری سانس لی۔ ڈاکٹرس کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ میرا جی چاہا کہ وہیں سجدے میں گر پڑوں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میری امی کو پچیس برس کی زندگی دی۔

سوانحی کوائف

نام: شمس النساء نسیم

قلمی نام: شائستہ یوسف

تاریخ پیدائش اور مقام: 15 جون 1951 ممبئی

تعلیم: ایم اے (فلسفہ نفسیات)، ایم اے اردو

مصروفیت: صدر، آر اینڈ ڈی، ملک ہربل کاسمیٹکس، بنگلور

کتابیں: گل خودرو، سونی پرچھائیاں، محمود ایاز (مونوگراف)

صحافتی وابستگی: سوغات، ادب، اختلاف، نیا ادب

شوہر کا نام: جناب امتیاز یوسف

غ ا: عصری ادب اور شاعری پر آپ کا کیا خیال ہے؟

شائستہ یوسف: عصری ادب اور شاعری کی اگر بات کی جائے تو دنیا کی ہر زبان کے ادب کا تقریباً ایک جیسا معاملہ ہے۔ بیسویں صدی سے قبل تاریخی ضروریات اور شخصی تجربات کے آئینے میں، فلسفیانہ خیالات اور مذہب کے ارتقا کے زینوں پر چڑھتے ہوئے تخیل اور شعور نے الفاظ کو شاعری میں ڈھالا اور ہر مقام پر دیہی شاعری لوک گیت اور مذہبی رسومات کی ضرورت بن کر ابھری۔ لیکن بیسویں صدی میں پہلی بار مشرق اور مغرب کے خیالات کا میل ہوا اور دھیرے دھیرے مقامی زبانیں اور لوک گیت، کلاسیکی اور لوک طرز کے خیال نے بھیڑ میں قدم پیچھے ہٹا لیے۔ ''آرٹ مرگیا'' کے شور میں ادب سائنسی، تکنیکی چکاچوند میں ماند پڑ گیا۔ اب پھر ایک نئی تلاش خصوصاً شاعری میں شروع ہوئی۔ از سرِ نو کلاسیکی اور مقامی سرمائے کو بچا کر روایت کو نئی شکل میں ڈھالنے کی کوشش جاری ہے۔ اس میں جدید شاعری کے امکانات نظر آتے ہیں۔ نئے فنکاروں کے لیے بہت روشن مستقبل ہے۔ اصولوں قاعدوں اور ضابطوں سے جکڑی شاعری اب اسلوبیاتی اظہارات Stylish expression کے نئے جامے پہن رہی ہے۔ ضرورت ہے تو محنت اور دل سے روح کی آوازوں کو سننے اور ٹٹولنے کی اور شاعری کے قلب میں دھڑکن رکھنے کی—

غ ا: کیا جدیدیت اپنا وجود رکھتی ہے؟

شائستہ یوسف: جدیدیت کسی ایک زمانے، ایک تہذیب یا کسی قانون کا نام نہیں۔ ہر لمحہ اور ہر آنے والا وقت اپنی تاریخی حقیقتوں اور جغرافیائی تغیرات، انسان کے ذہنی ارتقا کو نئی شکل دیتا ہے۔ ہم اسے 'جدید' کہہ سکتے ہیں۔ اسی لیے میں تو کہوں گی جدیدیت ایک تقاضا ہے اور ہر عہد میں اس امید کے ساتھ جیتا ہے کہ گزشتہ عہد سے کہیں بہتر اور جدید رنگ نیا عہد لے کر آئے گا کچھ انوکھی بات قاری کو چونکانے والی، لبھانے والی، سمجھانے والی اور سب سے بڑھ کر ادب کی طرف راغب کرانے والی ہوگی۔

غ ا: نئی نسل کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟

شائستہ یوسف: نئی نسل کے لیے اس سے بڑا پیغام کیا ہو سکتا ہے، کہ آج کل کے تخلیق کار ادب کے علاوہ دوسرے کاموں میں زیادہ مصروف ہیں۔ ضرورت ہے تو مطالعے اور ادب کے تئیں سچی لگن، تڑپ اور احساس کی ایک جنون کی جب تک کسی عہد کی زبان اپنی زبان کے عاشق نہیں پیدا کرے گی اس زبان میں اپنے تخلیق کاروں کا وجود ممکن نہیں کہ وہ اپنی تہذیب کے سرمایے کو ادب کی بستی میں ایسا بسا دے کہ ان آدی واسیوں کو دنیا کا ہر شخص پہچانے چاہے وہ کسی بھی زبان کا کیوں نہ ہو۔

■

Dr. Ghazanfar Iqbal, 'Saiban' Zubair Colony, Hagarga Cross, Ring Road, Gulbarga - 585 104, (K.S)
Shaista Yousof, Fordham House, IInd Floor Flat 21, Harris Road, Benson Town,

عبداللہ عثمانی

ہندوستان میں خطاطی کا ارتقا اور ہندو خوشنویس

ایک زمانے میں فن خطاطی کو خاص درجہ وکمال حاصل تھا یہ ہنر بھی دیگر اسلامی علوم کی طرح پروان چڑھا۔ عصرِ حاضر میں کمپیوٹر ودیگر آلات کی اختراعات نے پوری دنیامیں انقلاب برپا کردیا ہے نتیجتاً خوش نویسی (calligraphy) قریب قریب دم توڑ چکی ہے، یہ پاکیزہ ولطیف آرٹ اپنے فن پاروں اور خطوں کے باعث آج بھی دلکش ہے۔ اس کی ترویج واشاعت میں نہ صرف امراوسلاطین کا ذوق شامل تھا بلکہ بعض فقرا، اولیا، علما اور غیر مسلموں نے بھی اس میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا، بلکہ شاہی گھرانے اپنے بچوں کے لیے سپاہ گری کے ساتھ ساتھ خطاطی کی تعلیم کا نظم بھی کرتے تھے۔ مغل خاندان میں شاہجہاں (م 1766) اورنگ زیب عالمگیر (م 1707) داراشکوہ (م 1658) شہزادوں میں خسرو (م1621) پرویز (م1625) اور آخر میں بہادر شاہ ظفر (م 1862) بہترین خطاط تھے ہندوستان میں عہد تیموریہ میں خوش نویسوں کو خصوصی عظمت حاصل تھی وہ سلاطین وامرا کے درباروں کی رونق وزینت ہوا کرتے تھے، ممتاز کاتبوں اور اساتذہ کی لکھی ہوئی کتابیں، طغرے، کتبے اور اشعار نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ یہ فن مسلمانوں کی تہذیب وشان کا مخصوص حصہ ہے۔ عہدِ مغلیہ میں دیگر فنونِ لطیفہ کی مانند خطاطی کو بھی عروج ہوا۔ یہاں اعلیٰ درجے کے خوش نویس پیدا ہوئے مغل تاریخی عمارتوں کے کتبات اب بھی اس فن کی روشن مثال ہیں۔ یہ کتبے اتنے حسین طرز خط میں اور تناسب سے لکھے گئے کہ دیکھ کر نظریں نہیں ہٹتیں۔ مغلوں کی کوئی بھی تاریخی عمارت اس قسم کی تحریروں سے خالی نہیں ہے، خصوصاً تاج محل، سکندرہ اور فتح پور سیکری کی عمارتیں اور جامع مسجد دہلی کے کتبات اور طغرے نقاشی وصناعی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ سکندرہ اور تاج محل کے بیشتر کتبات اور طغرے امانت خاں شیرازی کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ جہانگیر کے عہد کا طغرا نویس تھا اصل نام عبدالحق ہے امانت خاں لقب سے شہرت پائی۔ تاج محل (تعمیر 1632 تا1655) کی تحریروں کے خطاطوں میں، ستار خان، محمد خان، اور عبدالغفار کے نام بعض تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ فتح پور سیکری کے بلند دروازوں کے مختلف کتبے حضرت سلیم چشتی کے خلیفہ خواجہ احمد چشتی کی عقیدت کا نتیجہ ہیں جو صفِ اوّل کے خطاط تھے۔ جامع مسجد دہلی کے بیرونی حصے کی محرابوں کے اوپر جو تاریخ تعمیر درج ہے وہ عہد شاہجہانی کے معروف انجینئر استاذ احمد معمار کے بیٹے نوراللہ احمد کی لکھی ہوئی ہے۔

طلوع اسلام کے وقت (600) خطۂ عرب میں خط نبطی کا چلن تھا جو بعد میں خط کوفی کہلایا اور عہد نبوی میں اس خط کا استعمال ہوتا تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں نسخ اور تعلیق کی آمیزش سے ایک نیا طرزِ تحریر ایجاد ہوا جو نوک پلک اور جاذبیت کے لحاظ سے خط نسخ سے زیادہ حسین اور محبوب تھا۔ اس کے بانی خواجہ میر علی تبریزی ہیں، نسخ وتعلیق الفاظ کے کثرتِ استعمال سے اس کا نام نستعلیق زبان زدعام ہوگیا۔

مگر بعض معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نستعلیق میر علی سے پہلے کی کاوش ہے جیسا کہ 'آئین اکبری' وغیرہ سے ثابت ہے۔ ابوالفضل کا بیان ہے ''نستعلیق وآں تمام ذوراست درزماں صاحب قرآن خواجہ میر علی تبریزی از نسخ وتعلیق برگرفت وایں باور نشود حیرا کہ تامہا بہ نظر درآمد کہ پیشیں از صاحب قرآن نگاشتہ بودند'' اس قسم کے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ خط نستعلیق خواجہ میر علی سے قبل وجود میں آچکا تھا۔ البتہ اس نے اس فن میں جدت طرازی اور کمالِ حسن پیدا کیا اور اس کے بعض قواعد مرتب کیے خواجہ میر علی جن کے قلمی شاہکار اب تک ایران، ہندوپاک میں اصحابِ ذوق کے پاس موجود ہیں، چناں چہ اسی گھرانے میں میر عماد علی نامی عباس قلی بادشاہِ ایران کے زمانے میں پیدا ہوا اس شخص کو اس فن پر مکمل دسترس حاصل تھی بادشاہ اس کی بہت قدر وعزت کرتا تھا نوسو روپئے ماہوار تنخواہ بھی دیتا تھا۔ ایک روز بادشاہ نے میر عماد سے شاہنامہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی خطاط عماد نے مؤدبانہ التماس کے ساتھ کہا مجھے شاہنامہ لکھنے سے انکار نہیں لیکن جیسا کہ آپ چاہتے ہیں ایسا تو تبھی لکھا جاسکتا ہے جس طرح کا سامان مجھے حکومت سے مسلسل ملتا رہے عباس قلی شاہِ ایران نے تمام شرائط مان لیں، میر عماد نے مزید کہا کہ شاہنامہ کی

داراشکوہ

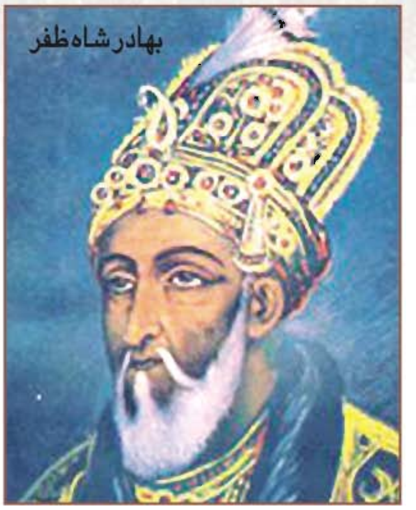
بہادر شاہ ظفر

شاہ جہاں

خواجہ میر علی

تکمیل تک شاہی 'پائین باغ' میرے حوالہ کر دیا جائے اور اس کے حوض کیوڑہ عرق گلاب، وغیرہ سے ملبب کر دیے جائیں، شاہِ ایران چوں کہ فن کا شیدائی تھا لہٰذا تمام باتوں پر راضی ہو گیا، مسلسل تین برس اور لاکھوں روپئے خرچ کے بعد وزرائے بادشاہ نے طنزاً کہا عماد علی تین سال میں بھی شاہنامہ پورا نہیں لکھ پایا ہے اور اس پر خرچ لاکھوں روپے ہو چکے ہیں، یہ سن کر بادشاہ نے اپنے مالی اصراف پر نظر ثانی کی اور اپنے فیصلے پر نادم ہو کر عماد علی کو دربار میں طلب کیا اور شاہنامہ کی بابت باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ اب تک تین جزو لکھے گئے مگر وہ بھی ناقص ہیں جس قسم کا شنجرف مجھے چاہیے وہ تیار نہیں ہو سکا، یہ سن کر بادشاہ طیش میں آ گیا اور بولا اب تک کل تین جزو اور وہ بھی ادھورے تیار ہوئے ہیں اور روپیہ پانی کی طرح بہہ چکا ہے۔ خطاطِ وقت چوں کہ اہلِ فن تھا ضبط نہ کر سکا گویا ہوا کہ اگر بادشاہ کی نظر روپیوں کی طرف ہے تو وہ واپس ہو جائیں گے، یہ کہہ کر وہ دربار سے اٹھ کر اپنے گھر آیا اور شاہنامہ کے تینوں حصوں کی ہر سطر الگ الگ کاٹی اور پالکی میں سوار ہو کر شہر میں یہ کہتے ہوئے گزرا ''امروز تحریر عماد ارزاں است'' چناں چہ ہزار ہا شائقین قلم اس کی آواز پر دوڑ کر قریب آتے اور جو کچھ مال و جواہرات ان کے پاس ہوتے وہ نذر کرتے گئے میر عماد اس کے عوض شاہنامہ کی صرف ایک سطر ان کو دیتا گیا ابھی وہ دربار شاہی کا نصف رستہ ہی طے کر پایا تھا چھ لاکھ روپئے کی مالیت جمع ہو گئی پھر وہ نہایت فخریہ انداز میں دربار میں داخل ہوا اور وزرائے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا یہ روپیہ موجود ہے شاہی خزانے میں جمع کر دیا جائے اس محنت شاقہ اور صرفہ کثیر سے اس کا منشاء تھا کہ خزانے تو بادشاہوں کے پاس ہوا ہی کرتے ہیں مگر یہ بھی ایک نادر تاریخ بن جائے کہ میری نایاب تحریر کا گنجینہ صرف شاہِ عجم جاہ کے پاس ہے، بالآخر بادشاہ کو، خوش نویس کے ذریعے واپس لیا گیا روپیہ وہ بھی عوام سے، ہتکِ سلطنت معلوم ہوا لہٰذا اس نے میر عماد کی اس حرکت پر اسے قتل کرا دیا، مقتول کا بھانجا آغا عبدالرشید (م 1081ھ) بھی اس فن میں منفرد تھا جب اس کو ماموں کے قتل کی خبر ملی تو وہ سخت مغموم ہوا اور خود کی بھی جان کا خطرہ محسوس کیا۔ چنانچہ قتل کے ڈر سے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور پہنچا یہاں بھی اپنی جان کو غیر محفوظ سمجھ کر اکبر آباد میں وارد ہوا اس وقت یہاں فن شناس و قدر دانِ خطاط شاہجہاں کی حکمرانی تھی جو بذاتِ خود بہترین خوشنویس تھا، اس وقت عبدالرشید آغا کی حالت نہایت افسردہ اور اضطرابی تھی ایک طرف گرفتاری کا ڈر دوسری جانب تکانِ مسافت سے یہ بے حال تھا بالآخر اسی کیفیت میں قلعہ معلٰی کے دروازے پر جا کھڑا ہوا اور بادشاہ سے ملاقات کی فریاد لگائی، چوبدار آغا کی باتیں سن کر ہنسے اور بادشاہ سے ملنے کے اوقات و اصول کی نصیحت کر ڈالی، مگر سائل کے نین و نقش اور زبان کہہ رہی تھی کہ یہ شخص عالی خاندان اور درباری کے آداب سے واقف ہے، تب چوبدار

ایک روز بادشاہ نے میر عماد سے شاهنامه لکھنے کی خواهش ظاهر کی خطاط عماد نے مؤدبانه التماس کے ساتھ کھا مجھے شاهنامه لکھنے سے انکار نهیں لیکن جیسا که آپ چاهتے هیں ایسا تو تبھی لکھا جاسکتا هے جس طرح کا سامان مجھے حکومت سے مسلسل ملتا رهے عباس قلی شاہِ ایران نے تمام شرائط مان لیں، میر عماد نے مزید کھا که شاهنامه کی تکمیل تک شاهی 'پائین باغ' میرے حواله کردیا جائے اور اس کے حوض کیوڑه عرق گلاب، وغیره سے ملبب کردیے جائیں،

نے قلعہ ملازم عرض بیگ کو اس شخص کی غرض کی خبر دی، اس نے شاہجہاں سے آغا موصوف کے متعلق گزارش کی اور اس کے طرز گفتگو اور وضع قطع سے بھی مطلع کیا چناں چہ بادشاہ نے ملنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ عرض بیگ نے باہر آ کر آغا عبدالرشید سے کہا بادشاہ جہاں پناہ آپ کو یاد کرتے ہیں، وہاں موجود دیگر ملازمین نے آغا سے کہا بادشاہ سے ملنے کی ایک رسم یہ بھی ہے کہ کوئی شے یا رقم شہنشاہ کی نذر کی جاتی ہے مفلوک الحال آغا نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے، ہاں اگر قلم و دوات مہیا کرا دو تو کچھ نذرانہ پیش کر دوں، مطلوبہ سامان لایا گیا آغا نے تبھی اپنے حسب حال درج ذیل قطعہ نستعلیق میں نقاشی اور حسنِ فن کا مظہر تحریر کر بادشاہ سے ملاقات کے لیے عرض بیگ کے ساتھ روانہ ہو گیا:

آیا خجستہ خصالی کہ ساکنانِ فلک
برآستانِ تو دارند میل دربانی
چہ حاجتست کہ گویم حالِ خستہ خود
کہ حال خستہ دلانرا تو خوب میدانی

شاہجہاں نے آغا کے فن و فکر کی پذیرائی کرتے ہوئے اپنے یہاں پناہ اور ملازمت دی۔ کچھ دن بعد شاہِ ایران کا خریطہ شاہجہاں کے نام پہنچا جس میں آغا عبدالرشید کی حوالگی مرقوم تھی، بادشاہ ہند نے نعمت خان عالی کو حکم دیا کہ شاہِ ایران کو جواب تحریر کرو کہ آغا اب ہمارے دربار سے متعلق ہے نیز وہ اہل کمال ہونے کے ساتھ مظلوم بھی ہے؛ لہٰذا حکومت ہند اس کو نہیں دے سکتی۔ افسوس کہ سلطنتِ ایران نے میر عماد جیسے یکتائے روزگار خوش نویس کو قتل کرا دیا جو انصاف کے خلاف ہے شاہانِ سابقہ ایران نے سدا فنکاروں کی عزت و قدر کی ہے بخلاف اس کے آپ اہل کمال کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں، چوں کہ خط نستعلیق ایک عمدہ خط ہے لہٰذا ہم بھی ہندوستان میں آغا عبدالرشید کی سرپرستی میں اس کو رواج دینا

چاہتے ہیں۔ جب یہ خط عباس قلی شاہ ایران کے پاس پہنچا تو اس نے خاموشی اختیار کی، بالآخر عہد شاہجہاں سے خط نستعلیق نے ہندوستان میں فروغ پایا۔ غرض آغا عبدالرشید نے ہندوستان آکر اس خط کو دوام بخشا اور نستعلیق کے اوّل استاذ کہلائے، مولانا محمد غلام ہفت قلم 'تذکرہ خوشنویساں' میں رقم طراز ہیں کہ '' وہ (آغا عبدالرشید) ملک خطاطی کا پیغمبر تھا، گزشتہ تمام خطوں پر گویا سبقت لے گیا اس کے بعد اس کا کوئی ہم سر نہیں پیدا ہوا اور یہ فن اس پر ختم ہو گیا شاہ جہاں کے زمانے (1627 تا 1766) میں ہندستان آیا اور شہزادہ داراشکوہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ مرنے کے بعد یہیں (اکبر آباد) میں دفن ہوا'' داراشکوہ کے علاوہ محمد اشرف خواجہ سرا، سعیدائے اشرف، عبدالرحمن وغیرہ اس کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس کے علاوہ اب ہم اس لطیف اور دل آویز فن سے متعلق کچھ مسلم خطاطوں کے نام درج کریں گے۔ اس کے بعد چند غیر مسلم تخلیق کاروں کا مختصر تذکرہ کریں گے جنھوں نے اس فن میں بھرپور حصہ لیا اور ان کے فن پاروں نے اسلامی تہذیب وروایات کو ترقی دی۔ نستعلیق میں انیسویں صدی میں ایک بلند پایہ نام سید امیر دہلوی پنجہ کش کا ہے جو اس خط کے آغا عبدالرشید ثانی کہلائے۔ انھوں نے اسلوب میں مزید شان ودلفریبی پیدا کی ان کے بعد ان کے فاضل تلمیذ آغا صاحب اس صنعت کو بامِ عروج تک لے گئے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے 'فرہنگ آصفیہ' میں نستعلیق کے عنوان سے اس علم پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب جھجر کے یہاں انھوں نے صرف گلستاں کا نسخہ ایک لاکھ روپے میں لکھا اور ایک نسخہ مہاراجہ الور کے یہاں لکھا ہے۔ یہ دونوں قلمی کتابیں مذکورہ ریاستوں میں عرصہ دراز تک قابل زیارت بنی رہیں، اسی کڑی میں عبداللہ بیگ، امام الدین احمد خان، محمد خان، اخوند عبدالرسول اس فن کے یکتا شہسوار تھے، عبدالباقی حداد ایرانی، شاہجہاں کے وقت میں ہندوستان آیا نستعلیق کے ساتھ نسخ کا ماہر تھا اس خط کو اس نے جدت طرازی اور حسن مذاق سے عروس الخطوط بنا دیا اس نے اورنگ زیب عالمگیر کی کم عمری کے زمانے میں متعدد قرآن پاک تحریر کیے۔ خاص کر 30 اوراق پر مشتمل قرآن پاک، اورنگ زیب عالمگیر نے اس کو اس صلے میں 'یاقوت قلم خان' کے لقب سے نوازا، کفایت خان، عہد شاہجہانی کا نامور خطاط شکستہ لکھنے میں کمال حاصل تھا، درایت خان، یہ کفایت کا بھائی تھا۔ تعلیق اور شکستہ میں امتیاز حاصل تھا۔ مولوی غلام محمد لکھتے ہیں کہ خط کیا تھا گل وریحان، باغ وبہار تھا اس کے لکھے ہوئے کلام مجید آج بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر اس کے ذوقِ خطاطی کی داد دینی پڑتی ہے، یہ وقت بھی اس فن کا عہد زریں تھا اس زمانے میں درج ذیل نام آسمانِ خطاطی پر ستاروں سے زیادہ روشن تھے، سید علی خان جوہر رقم، ہدایت اللہ خاں زریں رقم، عمیر باقر، میر محمد زاہد، مرزا حاتم بیگ، محمد عارف، حاجی نامدار، عہدِ مغلیہ کے زوال کے بعد سب سے طویل حکومت محمد شاہ کی تھی وہ ان فنکاروں کا قدردان تھا لہٰذا اس کے دور میں اعلیٰ سے اعلیٰ خطاطوں کا ظہور ہوا ان میں چند نام یہ ہیں: محمد حفیظ خان، محمد افضل لاہوری، محمد افضل حسینی، میر محمد موسیٰ، نواب فرید خان، نواب مظہر خان، قاضی عصمت اللہ خان، حافظ محمد علی میر ابوالحسن عرف کلن، مولوی غلام محمد دہلوی 'ہفت قلم' کے لقب سے مشہور ہیں اکبر شاہ ثانی کے زمانے کے معروف خطاط تھے ساتوں خطوں میں کمال حاصل تھا فارسی زبان کے بلند پایہ انشاء پرداز بھی تھے شعروسخن میں بھی طبع آزمائی کی، فن خوشنویسی کے سلسلے میں ان کا شاہکار یہ ہے کہ انھوں نے 'تذکرہٗ خوشنویساں' کے نام سے ضخیم مستقل کتاب لکھ کر خطاطوں اور اس فن کی تاریخ محفوظ

کی ہے۔ انھوں نے اس تصنیف میں اکثر وہ خوشنویس شامل کئے ہیں جن کی قلمکاری کے نمونے انھوں نے خود دیکھے ہیں اور اپنے عصر کے خوشنویسوں سے ملاقات کی۔ آخر عمر میں لکھنؤ آئے اور یہیں 1239ھ میں انتقال کیا۔

اب ہم چند غیر مسلم خوشنویسوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک دور میں یہ فن لازمۂ تعلیم شرافت سمجھی جاتی تھی اور ہنود بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے اس بارے میں 'تذکرہ خوش نویساں' میں مولوی غلام محمد نے متعدد ہندو خطاطوں کا حال لکھا ہے۔ ہم یہاں چند ناموں پر اکتفا کریں گے، حافظ نوراللہ دہلوی کے قابل فخر چیلے لالہ سروپ سنگھ اپنے عصر کے یکتائے فن تھے۔ ان کے خط میں آغا عبدالرشید کا طرز جھلکتا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل، اکبری عہد کا معروف نام ہے، اکبر کے نورتنوں میں شامل ٹوڈرمل خوش نویسی کا بھی شوق رکھتے تھے مولوی غلام محمد نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''نویسدۂ چابک دست وخطوط بخوشخطی ونمکی می نوشت'' رائے منوہرین مرزا راجہ خطاب تھا، دربارِ اکبری میں تربیت پائی، اکبر بہت عزت وقدر کرتا تھا فارسی کے قدآور شاعر تھے، خوش خطی میں بھی امتیاز حاصل تھا۔

چندر بھان برہمن، عہد شاہجہانی کا نامور سخن گو، ادیب اور صاحبِ قلم۔ داراشکوہ ان کے فن وفکر کا شیدائی تھا، صفِ اوّل کا خطاط تھا، نستعلیق میں آغا عبدالرشید کا اور شکستہ میں کفایت خان کا تلمیذ تھا دونوں خطوں میں عبور حاصل تھا، رائے پریم ناتھ کھتری، ان کے پوروج شاہ عالم ثانی کے وقت میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے یہ نواب مرید خان کے شاگرد اور اپنے زمانے کے معروف خطاط تھے شکستہ لکھنے میں کمال حاصل تھا راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ، راجہ بہادر کے لڑکے اور راجہ ناگرمل کے پوتے تھے۔ دونوں بھائی فن خوش نویسی کے شیدائی اور رائے پریم ناتھ کے شاگرد تھے۔ منشی لچھمن سنگھ غیوری، صاحبِ علم وہنر، عربی فارسی کے اساتذہ مسلم فارسی کے بےنظیر شاعر وانشا پرداز اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ راجہ نندرام پنڈت صاحب فن وعلم اور خط شکستہ کے ماہر تھے۔ دلی کی بدنظمی کے عصر میں لکھنو آئے اور اپنے فن کے جوہر دکھائے، لالہ لچھمی رام پنڈت، عربی وفارسی زبان پر قدرت کے علاوہ فارسی کے شاندار انشاء پرداز تھے۔ مصوری میں بھی ملکہ تھا، نستعلیق وغیرہ خطوں محمد حفیظ خان کے تلمیذ تھے۔ شاہ عالم کے وزیر نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں علی ودیگر امراء کی حکومتوں میں نہایت قدر ومنزلت حاصل تھی۔ خوش ونت رائے کو فن خطاطی میں اعتبار حاصل تھا۔ لالہ درگا پرشاد لکھنوی مولوی غلام محمد ہفت قلم کے مایۂ ناز تلمیذ خط نسخ وشکستہ ایسا لکھتے تھے کہ موتی پروتے تھے۔ شاعر بھی تھے مضطر ان کا تخلص تھا، نواب مصطفی خان شیفتہ نے 'گلشن بیخار' میں بھی ان کا ذکر کیا ہے، شنکر ناتھ، کشمیر النسل، دہلوی مشہور ہوئے، نامور خطاط تھے نستعلیق وشفیعہ میں مولوی غلام محمد دہلوی اور شکستہ میں مولوی حیات کے شاگرد تھے، شاعر بھی تھے سرسید احمد خان نے 'آثار الصنادید' میں بھی ان کے اوصاف پر روشنی ڈالی ہے۔ لالہ سروپ سنگھ دیوانہ، خوشخطی میں حافظ نوراللہ کے شاگرد رشید تھے اردو فارسی ہندی تینوں زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے کئی دیوان ان کی یادگاریں ہیں ان کے علاوہ منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ اور منشی دیبی پرساد صاحبِ 'ارژنگ چین' وغیرہ ہزارہا ہندوؤں نے اس فن میں اپنے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔

■

Abdullah Usmani, 4/16. Gaddi wara, P.o. Deoband- 247554 (UP)

دلجیت ورما

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی اہمیت اور مستقبل

سرزمینِ ہندوستان میں جموں وکشمیر کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس ریاست نے آزادی کے بعد جہاں اُردو زبان وادب کو اپنے علاقے کی سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے، وہیں اِس زبان وادب کی ہمہ جہت ترقی وترویج کے لیے عملی اقدامات بھی انجام دیے ہیں۔ تاہم آزادی کے بعد جس تیز رفتاری کے ساتھ جموں وکشمیر کے توسُّط سے اس علاقے کے علمی وادبی کارناموں کو نمایاں مقام حاصل ہونا تھا، وہ اِس لیے ممکن نہ ہوسکا کہ اس علاقے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات میں ابتری پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن حالات بہت جلد سنبھل گئے اور اب صورتِ حال حددرجہ اُمید افزا ہے۔

تین جغرافیائی خطّوں پر مشتمل ریاست جموں وکشمیر کا قیام مہاراجہ گلاب سنگھ کے دَورِ حکومت (1846-56) میں اُس وقت عمل میں آیا جب 16 مارچ 1846 میں امرتسر معاہدے کے تحت انھوں نے انگریزوں سے جموں اور کشمیر پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل کیا۔ لداخ کا علاقہ پہلے ہی اُن کی تحویل میں تھا۔ ڈوگروں کی یہ حکومت ایک صدی سے بھی زائد عرصے تک قائم رہی۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے عہد سے پہلے یہاں افغانوں اور سِکھوں کے دَور میں فارسی زبان وادب کا چلن تھا۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں ریاست کا بیشتر سرکاری کام فارسی میں ہوتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ڈوگری کی سرپرستی بھی کی جارہی تھی۔ لیکن اُنیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں اُردو کے عروج اور فارسی کی انحطاط پذیر صورتِ حال کا اثر ڈوگروں کی لِسانی حکمتِ عملی پر بھی پڑا۔ علاوہ ازیں ڈوگروں کے شمالی ہندوستان کے درباروں کے ساتھ گہرے روابط تھے، ہندوستان کے شمالی علاقوں میں مختلف امور کے سلسلے میں جو لوگ جموں آتے تھے وہ اُردو میں ہی بات چیت کرتے تھے۔

دراصل اُس عہد میں ڈوگری، پنجابی سے گہرا لسانی رِشتہ رکھنے کی بنا پر اُردو سے بھی قریب تھی۔ چنانچہ اہلِ جموں کو اُردو سیکھنے میں زیادہ دِقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اِس لیے کہ اُردو کا پنجابی لہجہ ڈوگروں کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ چنانچہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت (1857-58) ہی سے جموں میں اُردو کے لیے سازگار ماحول قائم ہونے لگا تھا۔ مہاراجہ کو تعلیم کی ترویج و ترقی اور علوم وفنون سے بے حد رغبت تھی۔ اُن کے دربار سے جو علما وفضلا وابستہ تھے وہ سب اُردو سے واقف تھے۔ ان میں دیوان کرپارام، غوث محمد ہشیار پوری، پنڈت رام کرشن وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کی کتابوں اور مخطوطات پر مبنی ایک کتب خانہ قائم کیا اور ایک دارالترجمہ کی بنیاد بھی ڈالی جہاں اُردو سمیت دوسری ریاستی زبانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے ترجمے کا کام انجام دیا جانے لگا۔ دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گوبند رام کول اور صدر مفتی رشید الدین مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ اس میں دیگر بہت سے مذہبی، سیاسی، فلسفی، لسانی اور ادبی دانشور عالم وفاضل بھی کام کرتے تھے۔

ریاست میں پہلا پرنٹنگ پریس 1858 میں سرمائی راجدھانی جموں میں قائم ہوا اور یہاں فارسی اور سنسکرت کی طرح اُردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپنے لگے۔ اس کے کوئی دس سال بعد 'وکرم بلاس' اور پھر 'بدیا بلاس' پریس قائم ہوئے۔ 1882 میں 'بدیا بلاس' ہی کے نام کا ایک اخبار شائع ہونا شروع ہوگیا۔ جس میں ایک حِصّہ دیوناگری اور ایک اُردو حروف میں رقم ہوتا تھا۔ یہ ریاست میں صحافت کی شمع روشن کرنے کا پہلا زینہ تھا، جس نے بعد میں سیکڑوں چراغ جلا دیے اور ساری ریاست اس کی روشنی سے جگمگا اُٹھی۔ غرض اس عہد میں اُردو نے ریاست میں اپنے قدم جما لیے تھے۔ مہاراجہ کی علم دوستی اور علم پروری کا چرچا سُن کر پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالک رام کول سالک دہلی کا قیام ترک کر کے اپنے آبائی وطن کشمیر لوٹ آئے۔ ان دونوں بھائیوں کا اُس دور کے صفِ اوّل کے ادبا وشعرا میں شمار ہوتا تھا۔ ان دونوں کو نظم ونثر کے علاوہ صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ ریاست جموں وکشمیر میں اُردو کی ترقی وترویج میں اِن دونوں کا قابلِ قدر حِصّہ ہے۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر 1876 میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہوگئے اور کئی نثری کارنامے انجام دیے۔ جن میں 'گلدستۂ کشمیر' اور 'گلزارِ فوائد' اہم تصانیف ہیں۔ اِسی دور میں برطانوی گورنمنٹ نے مداخلت کر کے کشمیر میں پہلی بار اپنا وائسرائے کا ایجنٹ مقرر کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کو مزید ترقی کرنے کا ایک موقعہ مل گیا۔ کیونکہ اُردو ہی کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1885-1925) کا دورِ حکومت اُردو کی ترقی کے حوالے سے اہم رہا۔ انھوں نے اُردو کی اہمیت اور مقبولیت کو مدِنظر رکھ کر 1889 میں فارسی کی جگہ اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اس طرح پوری ریاست میں اُردو زبان کی اشاعت اور فروغ کی راہیں کھلنے لگیں۔ بیسویں صدی کے وسط تک ریاست جموں وکشمیر میں تعلیمی، ادبی، صحافتی، سیاسی غرض ہر سطح پر اُردو زبان کا ایک اہم اور واضح رول متعین ہوچکا تھا اور اس نے ریاست کی مختلف لسانی اکائیوں کے درمیان لنگو افرا ینکا (Linguafranca) کا درجہ بھی حاصل کیا تھا۔

چنانچہ آزادی کے بعد جب 1956 میں ریاست کا آئین منظور کیا گیا تو ریاستی قانون ساز اسمبلی نے اُردو کی غیر

معمولی عوامی مقبولیت کے پیشِ نظر اس کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی توثیق کی۔

ریاست جموں و کشمیر چونکہ ایک کثیر لسانی علاقہ ہے۔ اِس کی تین بڑی اکائیاں جموں، کشمیر اور لداخ ہیں۔ یوں تو اِن تینوں خطّوں میں بالترتیب ڈوگری، کشمیری اور لداخی بولی جاتی ہے مگر ان کے علاوہ یہاں کے طول وعرض میں اُردو، ہندی اور پنجابی جیسی بڑی زبانوں کے چلن کے ساتھ ساتھ گوجری، بلتی، پہاڑی، پوگلی، شینا، رام بنی، بھدرواہی، کشتواڑی، سراجی، بھلیسی، کھشالی، پاڈری، چمیالی اور پنگیالی وغیرہ چھوٹی چھوٹی بولیاں بھی مروّج ہیں اور یہاں بولی جانے والی تمام زبانیں اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ نیز ان کا دائرۂ اثر دوسرے علاقوں تک نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے کسی ایک علاقے کو دوسرے علاقوں پر لسانی اور سیاسی برتری حاصل نہ ہو ایک بہتر منصوبے کے تحت اُردو زبان کو اس منصب سے سرفراز کیا گیا لیکن انگریزی زبان کے استعمال کی گنجائش بھی واضح طور پر رکھی گئی۔ اس سلسلے میں ریاستی آئین کی دفعہ 145 کے تحت یہ الفاظ درج ہیں:

"The official language of the state shall be Urdu but the English language shall unless the legislature by law provides, continue to be used for all the official purposes of the state for which it was being used immediately before the commencement of this constitution."

غرض ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کسی علاقے کی مادری زبان نہیں ہے لیکن یہ زبان اہلِ ریاست کے لیے اجنبی بھی نہیں ہے۔ اس لیے اسی کو سرکاری زبان کا درجہ دینے میں حکومت نے بہتر سمجھا۔ نیز اُردو کے ساتھ انگریزی زبان کے استعمال کی گنجائش رکھنا بھی اُن کی دوراندیشی کا مظہر ہے۔

اُردو زبان عصر حاضر میں تخلیقی اور صحافتی اظہار کا سب سے اہم اور مقبول وسیلہ ہے۔ چنانچہ بیشتر مقامی ادبا اور شعرا جہاں اپنی مادری زبانوں کو ادبی اظہار کا وسیلہ بنا رہے ہیں، وہیں اپنی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے کے لیے اُردو کو ترجیحی طور پر استعمال کرتے ہیں۔ صحافت اور ماس میڈیا کے دوسرے وسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اُردو کو نمایاں اور ارفع مقام حاصل ہے۔ اخباروں کی ایک کثیر تعداد اُردو میں چھپتی ہے اور یہ اخبارات ریاست کے کونے کونے تک پہنچتے ہیں اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ریاست میں اُردو کی اشاعت اور تشہیر میں شروع سے ہی ان اخبارات کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں اُردو اخبارات کی کثیر اشاعت سے عوامی سطح پر اُردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ عوام کے ساتھ جُڑے رہنے سے اِن اخبارات کا معیار بھی بہت بڑھ گیا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی اُردو کے فروغ میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ان اِداروں نے ریاست میں ایک بہتر رابطے کی زبان کے طور پر اُردو کی عوامی بُنیادیں مستحکم کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس سلسلے میں ان کا ایک اہم اور مؤثر رول ہے۔ 1954 میں جب ریاست میں ریڈیو کشمیر کے نام سے الیکٹرانک میڈیا کا آغاز ہوا تو اُس وقت ایک پالیسی واضح کی گئی تھی کہ اس اِدارے سے پچہتر فی صد پروگراموں کی زبان اُردو ہوگی مگر اس پالیسی پر پوری طرح عمل نہیں کیا جا رہا ہے۔ محکمہ اِطلاعات اور جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز بھی اُردو کی ترقی کے سلسلے میں پیچھے نہیں ہیں۔ اِن دونوں اِداروں نے ماضی قریب میں دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان وادب کی ترقی میں بھی قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں۔

اُردو زبان کو اِس ریاست میں اپنے آغاز ھی سے ایک سازگار اور خوشگوار ماحول ملا، جس کی بدولت اسے پنپنے، پھلنے پھولنے اور پھیلنے میں کسی قسم کی دِقّت اور دشواری کا سامنا نھیں کرنا پڑا۔ سرکاری سرپرستی میَسر ھونے کے بعد اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک اوردفتروں اور محفلوں سے لے کر سیاسی ایوانوں تک اُردو کا طوطی بولنے لگا۔ ریاستی حکومت اور عوام کے روابط دھلی، پنجاب اور لاھور جیسے شھروں کے ساتھ پھلے سے ھی قائم تھے جو اُردو کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

1950 میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو انھوں نے بھی اُردو کو سرکاری زبان بدستور برقرار رکھا۔ اس عہد میں بھی کئی انجمنیں اور ادارے قائم کیے گئے جنھوں نے اُردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ جس کی بدولت اس زبان نے اپنے ارتقائی مدارج بہت تیزی سے طے کیے۔

اہمیت:

ریاست میں اُردو زبان کی اہمیت اور مقبولیت کی چند بُنیادی وجوہات حسبِ ذیل ہیں:

ریاست میں اُردو کو خصوصی درجہ حاصل ہے۔ ایک طرف یہ رابطے کی زبان ہے اور دوسری جانب اسے سرکاری زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔

دورِ حاضر میں اُردو اپنی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے ساری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے الیکٹرانک میڈیا میں ایک اہم ذریعۂ اظہار بنی ہے جس سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

دنیا کی تینتیس ہزار (33000) زبانوں میں تیسرے مقام پر آنے والی اور ساٹھ ممالک میں بولی جانے والی بین الاقوامی زبان اُردو کوئی غیر ملکی زبان نہیں بلکہ یہ ہندوستان کی زبان ہے۔

اس زبان میں بڑی وسعت ہے اور اِس کا ذخیرۂ الفاظ کافی ہے۔ نئے نئے الفاظ وضع کرنے کی اس میں کافی صلاحیت موجود ہے۔ اس زبان کے ذریعے اعلیٰ تحقیق وتوسیع موجود ہے۔ یہ زبان عام فہم ہے اور آسان ہونے کے علاوہ گنجلک قواعد کی تمام تر پیچیدگیوں سے آزاد ہے۔ ہر فکر و عمل کو بحسن وخوبی اپنے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہماری ریاست کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے کہ ریاستی آئین کی رو سے اُردو زبان یہاں کی سرکاری زبان قرار دی گئی۔

ریاست جموں و کشمیر سے جتنی کثیر تعداد میں اُردو زبان کے اخبارات ورسائل چھپتے ہیں اتنے کسی دوسری زبان میں نہیں چھپتے۔

ہند ایرانی مشترکہ تہذیب اور تمدن کا جتنا شاندار ذخیرہ اُردو میں موجود ہے اتنا شاید ہی کسی دوسری ہندوستانی زبان میں ملے۔ اُردو ہی وہ واحد زبان ہے جو ریاست کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کے مابین تہذیبی اور لسانی رابطے کا کام کرتی ہے۔ چنانچہ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کوئی ایسی زبان ہو جو تینوں خطوں میں رابطے کی زبان بنے کیونکہ جموں کے لوگ کشمیری اور لداخی سے ناآشنا ہیں، کشمیر کے ڈوگری اور لداخی سے اور لداخ کے کشمیری اور ڈوگری سے۔ اتنا ہی نہیں اس زبان کی مدد سے ہم ریاست کے ثقافتی رشتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست کی مختلف مقامی زبانوں کے ادب کو ریاست سے باہر روشناس کرانے کے سلسلے میں بھی زیادہ تر اُردو ہی کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔

اُردو زبان کو اِس ریاست میں اپنے آغاز ہی سے ایک سازگار اور خوشگوار ماحول ملا، جس کی بدولت اسے پنپنے، پھلنے پھولنے اور پھیلنے میں کسی قسم کی دِقّت اور دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سرکاری سرپرستی میّسر ہونے کے بعد اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک اور دفتروں اور محفلوں سے لے کر سیاسی ایوانوں تک اُردو کا طوطی بولنے لگا۔ ریاستی حکومت اور عوام کے روابط دہلی، پنجاب اور لاہور جیسے شہروں کے ساتھ پہلے سے ہی قائم تھے جو اُردو کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح سے یہاں کے عوام کی زبان میں نکھار پیدا ہوا۔ اُردو کے ان مراکز سے اُردو کا شستہ ذوق رکھنے

والے کئی اصحاب ڈوگرہ حکمرانوں کے ہاں اور ریذیڈنسی میں تعینات ہو کر آئے اور یہاں کے لوگوں کے ذوق کو مزید جلا ملی اور شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ ریاست میں اُردو کو عوام تک پہنچانے اور اس سے دلچسپی پیدا کرنے کا کام راس لیلاؤں اور بھانڈوں نے اور بعد میں بمبئی کی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے کھیلوں نے بھی انجام دیا۔ اِسی طرح پہاڑی سارنگی نوازوں، قوالوں اور موسیقاروں نے بھی اُردو کو ریاست کے اطراف میں پہنچایا۔ کشمیر میں سیلانیوں اور سیاحوں کے سبب سے بھی اس زبان کو فروغ ملا۔ کیوں کہ یہ خِطہ شروع ہی سے سیاحوں اور سیلانیوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ جہاں نہ صرف حکمران نواب اور صاحبِ ثروت لوگ ہی آتے تھے بلکہ یہ سرزمین ایسے لوگوں کے لیے بھی باعثِ کشش رہی جو اُردو کے ماحول میں پروان چڑھے ہوئے تھے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کی ترویج و اشاعت میں مختلف مذہبی تحریکوں اور سرکاری و غیر سرکاری ادبی اداروں اور انجمنوں کا بھی نمایاں کردار رہا ہے۔

مستقبل:

اُردو ایک عالمگیر زبان ہے جو آج دُنیا کے ساٹھ سے زائد ممالک میں بولی اور سمجھی جانے والی رابطے کی تیسری بڑی زبان ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اس کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اُردو کا ماضی روشن رہا ہے، حال تسلی بخش ہے اور مستقبل کی صورتِ حال بھی درخشاں ہی نظر آرہی ہے اگر چہ چند دشواریوں سے بھی اسے دور چار ہونا پڑ رہا ہے۔

سرکاری دفاتر میں اکثر و بیشتر کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ بیوروکریسی میں اُردو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سیکریٹریٹ کا سارا کام انگریزی میں انجام دیا جا رہا ہے۔ محکمہ پولیس محکمہ مال اور عدلیہ میں نچلی سطح پر اُردو میں کام تو ہوتا ہے لیکن اعلیٰ سطح پر سارا کام انگریزی میں ہی ہو رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان محکموں میں افسروں کی تقرری کے وقت اُردو کی واقفیت لازمی نہیں رکھی جاتی۔ چنانچہ ان کی دیکھا دیکھی اب نچلی سطح پر بھی منظر بدل رہا ہے۔

جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے دس بیس سال پہلے تک ریاست کے تعلیمی نظام میں اُردو کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ابھی چند برسوں تک کشمیر کے سرکاری اسکولوں میں آٹھویں جماعت تک کے تمام مضامین اُردو میڈیم میں پڑھائے جاتے تھے۔ سوشل سائنس کے مضامین کی تدریس دسویں، جماعت تک اُردو میڈیم میں ہی ہوتی تھی لیکن اب اوّل جماعت ہی سے انگریزی میں پڑھائے جانے لگے ہیں۔ انگلش میڈیم کے ان اسکولوں میں تمام مضامین کے لیے انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں شامل نصاب کی جاتی ہیں۔

لیکن بچے آپس میں انگریزی کے بجائے اُردو ہی میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ زبان تقریباً دو صدیوں سے اس ریاست کی سب سے اہم زبان رہی ہے۔ یہ نہ صرف ریاست کے تین خطوں اور مختلف مذہبی نسلی اور تہذیبی اکائیوں کے درمیان ایک رابطے کی زبان ہے اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور استعمال ہونے والی زبان ہے۔ یہ عصرِ حاضر میں تخلیقی اور صحافتی اظہار کا سب سے اہم اور مقبول وسیلہ ہے۔ صحافت اور ماس میڈیا کے دوسرے وسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اُردو کو نمایاں اور ارفع مقام حاصل ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان موجودہ دَور میں ذرائع ابلاغ کی جان بن گئی ہے۔ جس کو ایک مستقبل ذریعہ بنا کر صحافت کے شعبے سے جڑے ہوئے لوگ عوام تک خبر رسانی کا کام بڑی سرعت اور دیدہ دلیری سے انجام دے رہے ہیں۔ اس کام سے ایک طرف اُردو زبان کو خوب فروغ حاصل ہو رہا ہے اور دوسری طرف اس زبان کی اہمیت اور افادیت کا یہاں کے عوام کو بخوبی احساس ہو رہا ہے۔ جونئی نسل کو اُردو کی تعلیم دلانے کے لیے ہمت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے آرہے ہیں۔ اس وقت ریاست کے مختلف اضلاع سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات کی تعداد ستر سے بھی تجاویز کر چکی ہے۔

غرض اُردو کا ماضی شاندار رہا ہے۔ اس زبان کی شیرینی جاذبیت و جامعیت، رنگینی و خوبصورتی کے گُن بلا لحاظ مذہب و ملت ہر شخص نے گائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اس وقت ریاست کے عوام کی سماجی، سیاسی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ ہر سال یہاں اُردو کی معیاری اور مفید کُتب ادب، سیاست، مذہب، صحافت، سیاحت، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ اور کئی دوسرے موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی منظرِ عام پر آرہی ہیں۔ جس سے اُردو زبان و ادب کے دامن کو وسعت حاصل ہوتی جارہی ہے۔

آج جبکہ اُردو زبان کو کمپیوٹر اور دوسرے الیکٹرانک میڈیا میں جگہ دے دی گئی ہے تو اس سے زبان کو گویا چار چاند لگ گئے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کے تئیں کام کرنے والے مختلف اِداروں اور انجمنوں، ریڈیو اور دُوردرشن کے پروگراموں کے علاوہ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو کی موجودہ صورتِ حال تسلی بخش ہے اور اس کا مستقبل درخشندہ و تابندہ نظر آرہا ہے۔ حالانکہ کچھ چیلنجز کا سامنا بھی اس کو درپیش ہے۔

آج ہر کوئی اپنی بساط سے اُوپر اُٹھ کر اپنے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا آئی اے ایس آفیسر بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے بچوں کو اُردو کے بدلے انگریزی پڑھانا زیادہ مناسب سمجھتا ہے اور جو لوگ اپنے بچوں کو اُردو پڑھانا چاہتے بھی ہیں انھیں اسکولوں میں اُردو کے اساتذہ ہی میسر نہیں ہیں۔ موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی اور کمپیوٹر کا دور ہے اس لیے اُردو والے خود ہی کم مائیگی اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ وہ اُردو پڑھ کر مطمئن نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے اُردو والوں کے بچے اُردو سے نابلد ہیں۔ انگلش میڈیم اسکولوں میں اُردو نہیں پڑھائی جاتی اور جہاں کہیں پڑھائی بھی جاتی ہے وہاں تلفظ اور املا کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہندی اور اُردو کی آپسی مسابقت سیاسی تعصب اور مقامی ادیبوں کی علاقائی عصبیت نے بھی اُردو کو زک پہنچائی ہے۔ ریونیو کارڈ میں اُردو کا استعمال تو خیر اب بھی جاری ہے مگر جس لکھاوٹ میں یہ کاغذات بنائے جاتے ہیں وہ پٹواری اور عدالت کے چند کرمچاریوں کے سوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔

پروفیشنل کورسز کی تعلیم کے دوران عموماً طالب علم کسی مخصوص سٹریم کو اپناتے ہیں۔ اکثر و بیشتر طالب علم انجینئرنگ، ڈاکٹری، کامرس یا پھر دیگر پیشہ ورانہ کورسز کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کورسز کے لیے ہمارے ہاں اُردو کے ذریعے تعلیم دینے کے معقول انتظامات نہیں ہیں۔ نہ ہی اُردو میں ترجمہ کی گئی کتابیں ہیں اور نہ اُردو میڈیم کے ذریعے پڑھانے والے اُستاد دستیاب ہیں۔ چنانچہ اس مسابقتی دُنیا میں ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ ہمیں نہ صرف اُردو کے ذریعے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم دینے کے مواقع فراہم کرنے پڑیں گے بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ اُردو کے ذریعہ تعلیم پائے ہوئے نوکری خواہاں اُمیدواروں کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہ ہو۔

اُردو کے روشن مستقبل کے لیے ریاست میں اُردو اکادمی کا قائم ہونا بھی ضروری ہے جس کی شاخیں ہر ضلع میں ہونی چاہئیں نیز انگریزی و دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے کے لیے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ ان سے اُردو کی ترقی و ترویج کی رفتار تیز ہوگی۔

فہرست کتب (جن سے استفادہ کیا گیا ہے)

1. کشمیر میں اُردو (دوسرا حصہ) از پروفیسر عبدالقادر سروری
2. جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی
3. جموں و کشمیر میں اُردو زبان (ماضی، حال، مستقبل) مُرتبہ پروفیسر شہاب عنایت ملک

■

Dr. Daljeet Verma, D-53 Bharat Nagar,
Talab Tillo, Jammu(J&K)-180002
Mobile: 9419150556

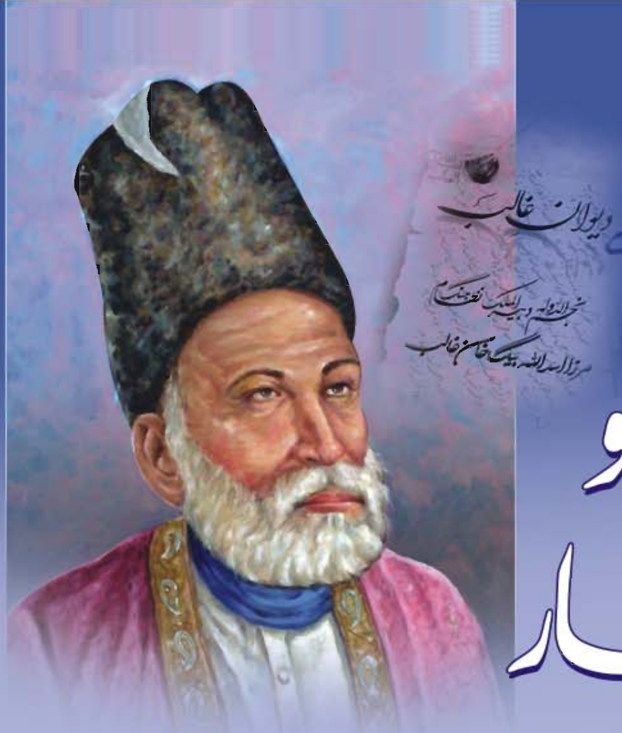

عبدالحق

غالب کے فارسی و اردو ہم معانی اشعار

غالب واقبال اردو کے تخلیقی اعجاز ہیں۔ دنیائے ادب میں شاید ایسی مثال ملے کہ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود غیر مادری زبان میں شاعری الہام و ادراک بن کر آسمانی عظمتوں کو آواز دے رہی ہو۔ سبک ہندی ہی سہی مگر غالب کی فارسی شاعری ایران و پارس کی سخنوری کی حریف ہے۔ بے سوادی اور کم نگاہی حائل نہ ہوتو غالب سبکِ ہندی کے نمائندہ شعرا کی صف میں مرتبۂ اعلیٰ پر فائز ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی کو جوفروغ اور فیضان ہندوستان کے قلم کاروں نے بخشا وہ کسی اور ملک کونصیب نہ ہوسکا۔ ایرانیوں کے عدم التفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ہند نے بھی فارسی سے ترکِ تعلق کرلیا۔ ہند کے لالہ زاروں سے سو سال بعد بھی کوئی اقبال وشبلی یا گرامی پیدا نہ ہوسکا۔ اب تو نزدیک دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ غالب فارسی پر فخر کرتے ہیں مگر اردو کو متاعِ گراں بہا بھی تسلیم کرتے رہے:

اے کہ میراث خوار من باشی
اندر اردو کہ آں زبان من است

غالب کی فارسی شاعری پر ہماری انتقادی نظر نہیں ٹھہرتی ورنہ وہاں ہزاروں لولوئے لالہ کی ارزانی ہے۔ ان کی فارسی شاعری اردو شاعری سے کیف وکم میں کہیں زیادہ گراں مایہ ہے اور ضخامت بھی تقریباً چھ گنا زائد ہے۔ پھر بھی ان کی عالمی شہرت کا مدار ومحور اردو ہی ہے۔ اردو کلام کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہی خلق سے روشناسی کا وسیلہ بنا۔ فارسی ثمر بار نہ بن سکی۔ بلکہ زندگی میں اس کی وجہ سے وہ ہدفِ تنقید رہے۔ منظومات کے مقابل ان کی فارسی غزلوں کا سرمایہ سبک ہے مگر وقعت میں وافر اور فزوں تر ہے۔

دونوں دو زبان شاعر ہیں۔ خیال کا دونوں زبانوں میں دَر آنا ایک فطری عمل ہے۔ دونوں کے یہاں یہ صورت موجود ہے۔ موضوع غالب سے متعلق ہے۔ اس پر تفصیل سے گفتگو مقصود ہے۔ سردست کلام اقبال سے صرف ایک مثال پیش کررہا ہوں۔ زبورِ عجم کی 48ویں غزل پہلے کہی گئی بعد میں کم وبیش وہی خیال بالِ جبریل میں دہرایا گیا ہے:

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را

باب جبریل کی تیسری غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اقبال کی تخلیقات میں اور بھی مثالیں موجود ہیں۔ ان کی پیامی اور فکری شاعری میں اس التباس یا ابلاغ کا منطقی اور قابلِ قبول جواز ہے۔ جب افکار کا ارتکاز یا وحدتِ فکر موجود ہوتو عربی وعجمی کے دل کشا وسیلوں میں فرق نہیں ہوتا۔ پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وحدتِ افکار کے باوجود ترسیل وترجمانی میں آہنگ کے انواع بہت مختلف ہیں۔ اسی لیے مطالعۂ اقبال میں دونوں زبانوں کی آگہی لازمی ہے۔

تفہیمِ غالب کے لیے یہ طریقِ نظر مستحسن ضرور ہے مگر ملزوم نہیں۔

لیکن غالب کے افکار وتصورات پر گفتگو کے دوران ان کی تمام تحریروں کا مطالعہ اور حوالہ ناگزیر ہوگا۔ نثری تحریریں خواہ کسی صورت میں ہوں ان کی افادیت سہ چند ہوجاتی ہے۔ مثلاً ان کے وجودی یا صوفیانہ خیالات کی تفہیم کے لیے خطوط وتقریظ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ شعری تحریر کے استناد کے لیے نثری تحریریں موثر اور کارگر ہوتی ہیں۔ مثلاً ماضی پرستی کے بارے میں غالب کا فارسی قول ہے:

ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اس کی تصویب وتائید کے لیے سرسید کی کتاب پر لکھا گیا منظوم مقدمے کا یہ قول دوسری حتمی دلیل فراہم کرتا ہے کہ وہ ماضی پرستی کو نامبارک گردانتے ہیں:

مردہ پرور دن مبارک کارنیست

یوں بھی کسی فن کار کی تمام تخلیق کو خاطر میں لائے بغیر ہر عمل انصاف کے تقاضے سے محروم ہی قرار پائے گا۔

فارسی ادب سے استفادے میں غالب کا کوئی بھی حریف سنگ پیدا نہ ہوسکا۔ کلیات میں ظہوری، انوری، نظیری، حافظ وسعدی، غالب و بیدل وغیرہ کا بار بار اعتراف کیا گیا ہے۔ اسلاف کے تصورات کا تخیل میں شامل ہونا بشری خمیر کا حصہ ہے۔ غالب کے معترضین نے سرقہ کے الزام کے وقت اس حقیقت سے چشم پوشی کی۔ غالب کی پرشوخ طبیعت کو جواب دینا پڑا:

مبر گمانِ توارد یقین شناس کی دُزد
متاعِ من زنہار خانۂ ازل بُردست

غالب کے فروغِ تخیل کی بلند پروازی سے یہی امید تھی۔ پوری شاعری میں سرقے کا اتہام کے لیے 'درزی و بکف چراغ داری' کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

نگویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیاناں را
ولے در خویش بینم کارگر جادوئے آناں را

(میں دعویٰ نہیں کرتا کہ سحر نگار بزرگ قلم کاروں سے میرا کلام تازگی وطرفگی میں آگے ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلاف کی جادو نگاری کے موثرات مجھ میں ضرور موجود ہیں)۔ غالب کے فکر وشعور کی بلند پروازی میں ان کی شوخی کو بڑا دخل ہے۔

یہ شعر بھی اسی کا مظہر ہے۔ یہ ایک طرح کا عجز بیان ہے۔ ورنہ غالب کے دعوائے سخن دانی میں سبقت رکھنے والے بھی خال خال نظر آئیں گے۔

کلیات کے مقدمہ کا تسلیم شدہ جملہ ملاحظہ ہو:

''ہر آئینۂ رفتگاں سرخوش غنودہ اندو من خرابستم۔''

(کلیاتِ فارسی، ص24)

بزرگوں کی تخلیقات پر جھاڑو پھیرنے والے بھی غالب ہی ہیں:

خشک ست کشتِ شیوۂ تحریر رفتگاں
سیر ابش از نم رگِ ابر قلم کنم

(بزرگوں کے اسالیبِ فن کی کھیتیاں خشک ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنے ابرِ قلم کی نمی سے انھیں سیراب کیا ہے)۔

غالب کے فخریہ اظہار میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں ملے گا۔ اگرچہ وہ اپنی شیخی و شاعری کے منکر بھی نظر آتے ہیں۔ قصیدے کا مصرع ہے:

شیخی و شاعری نہ سزاوارِ شانِ ماست

(فخر اور فن میری شان کے خلاف ہے)

اس مضمون میں سرقہ یا توارد سے صرفِ نظر کر کے فارسی و اردو کے ہم خیال چند اشعار کا ذکر ہے۔ یہ مذکورہ اصطلاحات معانی و مفاہیم کے لحاظ سے ہمارے دائرۂ تحریر سے الگ ہیں۔ کیونکہ ایک ہی شاعر کے کلام میں ہم معنی اشعار کو توارد نہیں کہہ سکتے۔ تکرار، تشابہت، ہم معنی یا ہم خیال کہنا زیادہ موزوں ہے۔ ایک ہی زبان میں کہے گئے اشعار میں بھی معنی کی مشابہت ممکن ہے۔ اردو کے کئی فن کاروں کی تخلیقات میں تکرارِ خیال موجود ہے۔ ویسے بھی بڑے قلم کاروں کے زاویۂ اظہار میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ خیالات کا دہرانا بھی ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ یہ تخلیق کا ایک لاشعوری عمل ہوتا ہے۔ اسے خیال کی ترجمانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک زبان کا خیال کسی دوسری زبان میں منتقل ہونا ترجمہ کہلائے گا۔ یہ بھی مختلف النوع ہو سکتا ہے۔

کلام غالب میں ہم خیال اشعار کی بڑی تعداد ہے۔ بعض دوستوں نے ان کی نشان دہی کی ہے۔ ان خیالات کا توارد یا اعادہ ایک فطری سچائی ہے۔ جو فنی گرفت سے ماورا ہے۔ فن کار ایک ہے۔ زبانیں دو ہیں۔ دونوں میں پرتو خیال کا در آنا تخلیقی فعالیت کے عین موافق ہے۔

اردو کا شعر ہمارے حافظے میں ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس سے ملتا جلتا خیال ملاحظہ ہو:

شادی و غم ہمہ سر گشتۂ تر از یک دگراند
روز روشن بہ وداع شبِ تار آمد و رفت

یہ ترجمہ نہیں ہے۔ مضمون یا خیال کی ترجمانی ہے۔ یہ فکری اسالیب کے تخلیقی سرچشمے ہیں۔ الفاظ کے بیش و کم کے ساتھ تقریباً وہی خیال یہاں بھی موجود ہے یعنی رنج و راحت باہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ روز روشن کے ساتھ شبِ تاریک کا سلسلہ تکوینی نظام کی سرشت میں ہے۔ مسرتوں کی موجودگی میں الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی ہے۔

غالب کو اپنے فن کی رفعتوں کا شدید احساس ہے جو بے جا بھی نہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ ان بلندیوں کا فخریہ اظہار کیا ہے۔ فارسی میں یہ قول انتقادی اظہار کی مثال ہی نہیں محاورے کی حیثیت سے معروف ہے:

در شعر سہ تن پیمبر آنند — ہر چند کی لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوس و انوری و سعدی

غالب کا اظہار خود ستائی کی تمام سرحدوں کو پامال کرتا ہے مگر ندرتِ بیان اور شوخیِ مزاج کی بلندی و برنائی کے ساتھ:

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

جب غالب کے ہر حرف کی تہہ میں میخانے آباد ہوں تو ان کی سرمستی و سرشاری کی ارزانی سے ہر ایک لطف اندوز ہوگا۔ غالب نے فارسی میں سخن گوئی کو رگِ گفتار سے خونِ جگر کی کشید کہا ہے۔ گویا خون جگر کو تحلیل کیے بغیر شعر کہنا ممکن نہیں ہے۔ اسی خون جگر کی نمود و کشید پر اقبال نے تخلیق کے معجزات کی دنیائے فکر آباد کی ہے۔

اگر دنیا میں شعر و سخن کا آئین نافذ ہو تو کلام غالب کو الہامی کتاب کی حیثیت دی جائے گی۔ یہ ڈاکٹر بجنوری نہیں خود غالب کا اقرار ہے۔ ان اشعار سے قطع نظر تخلیقی دروں بینی کے بارے میں غالب کا یہ خیال ہماری تنقید میں قولِ فیصل بن چکا ہے۔ جیسے ہم نے بے چوں و چرا تسلیم کر لیا ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دے کر انھوں نے قاری، متن اور تنقید کی موجودہ گمرہی کی تمام ادعائیت کی نفی کی ہے۔ اس اساسی خیال کو پیشِ نگاہ رکھیں تو فارسی کے اس ماخذ کی داد دے سکیں گے:

درتہ ہر حرفِ غالب چیدہ ام میخانۂ
تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

اردو کے مذکورہ مطلع سے پہلے یہ شعر موجود ہے:

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

عجیب بات ہے کہ مقطع کے آخری مصرعے کو غالب نے دانستہ طور پر مطلع کا پہلا مصرع بھی قرار دیا ہے۔ گویا اس خیال کی پسندیدگی کی تکرار تحت الشعور کی دل فریب بازگشت ہے۔ ایک ہی غزل کا مصرع مکرر مستعمل ہے:

تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

اول بھی ہے اور آخر بھی۔

جب غالب کے ہر حرف کی تہہ میں میخانے آباد ہوں تو ان کی سرمستی و سرشاری کی ارزانی سے ہر ایک لطف اندوز ہوگا۔ غالب نے فارسی میں سخن گوئی کو رگِ گفتار سے خونِ جگر کی کشید کہا ہے۔ گویا خونِ جگر کو تحلیل کیے بغیر شعر کہنا ممکن نہیں ہے۔ اسی خونِ جگر کی نمود و کشید پر اقبال نے تخلیق کے معجزات کی دنیائے فکر آباد کی ہے۔

بیش و کم کے ساتھ تقریباً یہی خیال غالب کے اردو کلام میں حرف و صوت اور ندرتِ بیان کی دنیائے دیگر کے ساتھ موجود ہے۔

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

خوانِ گفتگو پر دل و جان کو قربان کیے بغیر انبساط ممکن نہیں ہے۔ غالب نے اپنے سومناتِ خیال کے اندر جھانکنے کی جگہ جگہ تاکید ہے:

بسومناتِ خیالم در آی تا بینی

توارد کا دَر آنا غزالانِ افکار کے ہجوم کے موثرات ہیں۔ غالب کے کلام میں افکار کی کہکشاں فروزاں ہے۔ معانی کے فراواں بیان اور اندازِ نگارش کے اسالیب مختلف ہیں۔ ان میں توارد یا تسامح یا معنی کا ہم آہنگ ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ یہ کہنا بھی ذرا مشکل ہے کہ فارسی خیال سے اردو مستعار یا مستفیض ہے یا اس کے برعکس صورت بھی ممکن ہے۔

خیال کی ہم آہنگی کی ایک دوسری مثال پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ زبانوں کے اختلاف سے قطع نظر فارسی کلام میں بھی ایسے ہم خیال اشعار موجود ہیں۔ گنجینۂ معنی کا طلسم یا درتہ ہر حرفِ غالب کا ذکر ہو چکا ہے۔ نعتیہ قصیدے میں اس ترکیب اور خیال کو ملاحظہ فرمائیں:

گوہر کدۂ راز بود عالم معنی
وز لفظ گہر ریزہ بود وادیِ آں را
لفظ کہن و معنیِ نو در ورقِ من
گوئی کہ جہان مست و بہار است جہاں را

الفاظ پرانے ہیں مگر معنیٔ نو کی ارزانی دیکھنی ہو تو کلام غالب سے رجوع کیجیے جو عالم میں ابر بہار بن کر ذرۂ زمین کو زر بکف کر رہا ہے۔اشعار کے علاوہ مختلف مصرعوں میں تکرارِ خیال کی مثالیں بھی بہت ہیں۔غزل کا ایک فارسی مصرع مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

مینائے مے از تندیِ ایں مے بگدازد

اردو کا مصرع ہے:

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غالب کے فنی محاسن اور تخلیقی تموج کے مطالعے میں یہ شعر اکثر حوالہ بنتا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

فارسی شعر اس خیال کا دوسرا مصدر ہے۔ اظہار میں ندرت ہے۔الفاظ کا اختلاف ہے مگر معانی کا سرچشمۂ نمود ایک لگتا ہے۔ براہِ راست اعادہ نہ سہی لیکن دوسرا مصرع قریب تر محسوس ہوتا ہے:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اردو کی ہی نہیں دنیائے شعر میں شاید ہی کسی صنفِ سخن کو اردو غزل جیسی شہرت حاصل ہو۔اس کا موضوع بھی مخصوص و محدود ہے۔قیود و بند کے باوجود اس نے وسعت اور پنہائی خیال کے بے کراں امکانات روشن کیے ہیں۔

مندرجہ ذیل شعر کے متن و معانی کو دیکھیں تو اشتراک خیال کے زیادہ سے زیادہ زاویے نظر آئیں گے۔عاشق کی مشتاقی اور محبوب کی بیزاری کا گلہ راہِ محبت میں عام ہے۔دوسرے مصرعے ذرا مختلف ہیں مگر حیرت واستعجاب کا اظہار دوئی سے دور ہے:

ما با تو آشناؤ تو بیگانہ زما
آخر توؤ خدا کہ جہانے گواہ کیست؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

غالب کی آزاد خیالی اور وسیع المشربی پر خاص توجہ صرف کی گئی ہے۔ان کی مذہبی فکر سے ارادتاً اغماض برتا گیا ہے۔ان کی مجموعی فکر کے خاک و خمیر میں ایمان و عقیدے کی روح خونِ رواں کی طرح موجزن ہے۔موجود و لاموجود پر ان کا متکلمانہ کلام زیر بحث رہا ہے۔لیکن عقیدۂ رسالتؐ پر غالب نے کسی بحث کا شائبہ نہیں رکھا۔ربوبیت کے ساتھ رحمت للعالمینی کو ارض و سما میں جاری کہہ کر انھوں نے شمہ برابر بھی شبہے کی گنجائش نہیں رکھا۔آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ وارفتگی کا اندازہ ان کے نعتیہ قصیدوں سے ہوتا ہے۔حد تو یہ ہے کہ شعری روایت کے برخلاف محبت سے سرشار نعتیہ غزل لکھی۔جو فارسی اور اردو کی نعتیہ شاعری میں بہت ممتاز اور منفرد مقام کی حامل ہے۔خاص طور پر مقطع میں حضورِ رسالت مآبؐ کی عظمت کا جو اعتراف ہے وہ سیرتِ نبویؐ کا مہتم بالشان موضوع ہے۔ایک دوسری حیرت فروز مثال اردو غزل کا مقطع ہے:

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہؐ کے غالب گنبد بے در کھلا

نعت کی تخلیقِ عالیہ میں کئی جگہ معراجِ نبویؐ کا فکر انگیز تذکرہ ہے۔اردو شعر کے دوسرے مصرعے کو ذہن میں رکھیے تو حسبِ ذیل مصرع بہت حد تک معانی کی قربت کا احساس دلائے گا:

کز چاک بود خندہ بر افلاک کتاں را

اور بھی اشعار گفتگو کا موضوع بن سکتے ہیں۔لیکن ان سے صرفِ نظر کیا جا رہا ہے کیوں کہ پاسِ طوالت مانع ہے۔صرف غزل کے اشعار پر توجہ ہے۔فارسی غزل کا شعر ہے:

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ای ست
گوئی طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ای ست

غالب کے مشہور اردو قصیدے کے مطلع پر توجہ درکار ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اردو کا دوسرا اہم مضمون شعر دیکھیے:

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

من و عن مفہوم نہ سہی مگر تلمیح کی ایک توسیعی صورت ملاحظہ ہو:

در عرضِ دعوے لیلیٰ نکو ہے
بر زعم غالب مجنوں ستائے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

غالب صوفی نہ تھے مگر تصوف کے دقیق مسائل علمیہ پر نظر رکھتے تھے۔اردو سے زیادہ فارسی اشعار میں وہ نکتہ سرا ہیں۔قطرہ و دریا، ذرہ و مہر، بود و نبود، وحدت و کثرت، عیان و انا الحق، خودی و بے خودی، ذات و صفات کے شعری تلازمے کثرت سے ملتے ہیں۔اردو میں یہ مصرع عام و خاص کی زبان پر جاری ہے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یا:

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

فارسی غزل میں ہے:

سرمایۂ ہر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا
سودیست کہ مانا بزیان ست وزیاں نیست

فارسی کا یہ شعر غزل کی روایت کا شاہکار بن چکا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

اردو میں باندازِ دگر یہ مضمون ملاحظہ ہو:

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب، چل کہ چلے دن بہار کے

دوسرا مصرع بھی قابل توجہ ہے:

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں

ایک مصرع ہے:

بس کہ از تابِ نگاہِ تو ز آسودن رفت

اردو کا مصرع ہے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب

فارسی کا مصرع ہے:

فدائے روئے تو عمرِ ہزار سالۂ ما

اردو میں یہی آرزو اس طرح ہے:

مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

فارسی میں ہے:

سوزد ز بسکہ تابِ جمالش نقاب را

اس کا بدل اردو میں یہ ہو سکتا ہے:

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر

اردو کا بہت مشہور شعر ہے۔جو ایک تکوینی نظام کے ضابطے کی دلیل ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

فارسی میں خیال کی ترجمانی کا پرتو نظر آئے گا۔لفظیات میں بھی ایک گونہ اشتراک ہے:

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر
برخرمن ما برقے برمزرع یاراں شو

ارض و سما میں انسانی وجود حقیقت ابدی سے آشنا ہے اور سب سے مکرم و محترم بھی ہے۔وہی ہنگامہ ہائے شوق کا محور ہے۔اسی کی سرگرمیوں سے یہ خرابہ آباد ہے:

زما گرمست ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

قدرے تبدیلی کے ساتھ خیال کی ترجمانی اردو میں بھی موجود ہے:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دوسرے شعر میں معنوی قربت کی دوسری مثال زیادہ خیال افروز ہے:

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

یا:

رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

اردو شعر ملاحظہ ہو:

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈر کر
رہبر چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ایک دوسری غزل کا شعر بھی اسی زمرے میں لایا جا سکتا ہے۔طرزِ

اداز امختلف ہے۔ اس مفہوم کو اردو غزل میں طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ ملتیں مٹنے پر اجزائے ایماں میں تبدیل ہو جاتی ہیں:

آئینِ برہمن بہ نہایت رسانده ایم
غالب بیا کہ شیوۂ آذر کنیم ما

فارسی کے اس شعر کو متضاد خیال کا حامل کہا جا سکتا ہے:

خود را ز سردِ مہرئ اسلامیانِ شہر
در حلقۂ پرستشِ آذر گرفتہ ایم

اردو میں ایک اور شعر قابلِ توجہ ہے:

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

مضمون آفرینی میں ایک شعری اسلوب کا کثرت سے استعمال بھی ہوتا رہا ہے۔ شاعر ایک ہی مصرع میں بنیادی موضوع کو پیش کرتا ہے۔ دوسرے مصرع میں دلیل فراہم کرتا ہے یا تشبیہ کا علاقہ پیدا کرتا ہے۔ یا نفسِ مضمون کو زیادہ مستحکم اور دلآویز بنانے کے لیے علامتوں، استعاروں یا پیکروں کا بھی سہارا لیتا ہے۔ بات ایک مصرع پر ہی موقوف ہوتی ہے۔ دوسرا مصرع شعر کی تکمیل کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے۔ مکمل مفہوم والے مصرعے ملاحظہ ہوں:

وقت است کہ پیمانۂ جوئے رواں کند
ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

اردو میں ایک دوسرا مصرع بھی پیش کیا جا سکتا ہے:

شیشۂ مے 'سروِ سبز' جوئے بار نغمہ ہے

فارسی کا مصرع اس طرح ہے:

ندارد حاجتِ لعل و گہر حسنِ خدا دادت

یا:

نازم فروغِ بادہ ز عکسِ جمالِ دوست

یہ نہ سہی مگر خداداد حسن کی جلوہ سامانی یہ بھی ہے:

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے

اردو میں ایک شعر خیال کی ارتقاعیت سے ہم کنار ہے:

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

فارسی کا یہ فکر انگیز شعر نظامِ عالم پر غور کرنے کے لیے دعوت دیتا ہے:

التفات شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام
جرأتِ باید کہ حرفِ شوق دیدارش کنم

اردو کا شعر دیکھیے:

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نفسِ موضوع میں تکرار کے اندیشوں کا گمان بہت تھا لیکن تنوع اور توسیع طلبی نے اسے بہت محفوظ رکھا۔ بزرگوں سے استفادہ کرتے ہوئے انفرادیت کو بحال رکھنا کوہ کنی سے کم نہیں۔ غالب و اقبال نے اسلاف سے استفادے کی راہ کہکشاں کو کشادگی بخشی ہے۔ مگر ان کی انفرادیت میں کوئی بھی شریکِ سخن نہیں ہے۔ ندرتِ بیان سے انھیں انفرادیت حاصل ہے۔

استفادے کے آئین مرتب کیے گئے ہیں۔ دوسرے فن کاروں کے خیال کو ہو بہو منظوم کرنے کو سرقہ کہہ کر معیوب قرار دیا گیا۔ اپنے موضوع کے مختلف اظہار کو تکرارِ لفظی و معنوی سے تعبیر کیا گیا جب کہ دوسروں کے خیال کا لاشعوری طور پر در آنا توارد کے ذیل میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عہد اور ایک معاشرہ میں رہنے والے معاصرین کے درمیان فکر و احساس کی یکسانیت کا ہونا عین فطری ہے۔ اگر چہ کلیہ نہیں کہا جا سکتا۔ معاشرتی تنقید کی تعبیریں یہاں موثر نہیں ہو پاتیں۔ خود عہدِ غالب ایک مثال ہے۔ غالب بڑے شاعر اور ضخیم کلام کے مالک ہیں۔ ذولسان ہونے کے ساتھ وہ بڑے ذی فکر اور گہرے محسوسات کے منفرد شاعر بھی ہیں۔

استفادے کے آئین مرتب کیے گئے ہیں۔ دوسرے فن کاروں کے خیال کو ہوبہو منظوم کرنے کو سرقہ کہہ کر معیوب قرار دیا گیا۔ اپنے موضوع کے مختلف اظہار کو تکرار لفظی و معنوی سے تعبیر کیا گیا جب کہ دوسروں کے خیال کا لاشعوری طور پر در آنا توارد کے ذیل میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عہد اور ایک معاشرہ میں رہنے والے معاصرین کے درمیان فکر و احساس کی یکسانیت کا ہونا عین فطری ہے۔

احساس کے اظہار میں کہیں کہیں یکسانیت کا پایا جانا قرینِ قیاس والتباس ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

بیخودی کردہ سبک دوش فراغے دارم
کوہِ اندوہ رگِ خوابِ گراں است مرا

اردو کا یہ شعر کافی حد تک خیال سے قریب لگتا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

صد فی صد خیال نہ سہی مگر مفہوم کی قربت اظہار کے دوسرے پیرایۂ بیان میں موجود ہے۔ دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں:

شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

اردو کا مشہور شعر بہت حد تک قربت رکھتا ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

فارسی غزل کا ایک شعر ہے جو در مدح خود کی مثال ہے:

غالب نوائے کلکِ تو دلِ من برد زدست
تا پردہ سنج شیوۂ انشائے کیستی؟

مشہور اردو شعر اس خیال سے کسی حد تک ہم آہنگ ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حریفِ منتِ احباب نیستم غالب
خوشم کہ کارِ من از سعی چارہ گر گزرد

اردو کا حسب ذیل شعر بہت معروف ہے۔ فارسی شعر سے کافی قریب محسوس ہوتا ہے:

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

فارسی اور اردو میں مماثلت کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ راقم کا ذاتی خیال ہے کہ فارسی اظہار سے اردو شعر کا مفہوم اور پیرایۂ بیان زیادہ پراثر ہے اور یہ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آتا ہے:

سوزد ز بس کہ تابِ جمالش نقاب را
دانم کہ درمیاں نہ پسند و حجاب را

اردو شعر کو اس خیال کا بہت حد تک متبادل کہا جا سکتا ہے:

جب وہ جمال دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

ناچیز نے کلیاتِ فارسی کے کافی اشعار نشان زد کیے ہیں جن میں خیال کا توارد ہے۔ یا تسامح یا تکرار اور التباس بھی۔ ان اشعار میں بہت حد تک قطعیت کے ساتھ توارد نہ سہی مگر قرینِ خیال موضوعات موجود ہیں۔ جو مطالعے میں بہت ممتاز نہ سہی مگر کسی حد تک مفید معلوم ہوتے ہیں۔ ذولسان شاعر غالب کی تخلیقی راز جوئی میں یہ اشارے سنگِ نشاں کا کام دے سکتے ہیں۔ ہم خیال مضامین کا مطالعہ بھی غالبیات کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ کلامِ غالب میں اسلاف کے خیالات کی نشان دہی ایک دوسرا موضوع مطالعہ ہے۔

اس طرح کے نہ جانے کتنے موضوعات ہیں جو غالب کے اسالیبِ فکر و فن میں اپنی رفعتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ اشعار و اسالیب کے اعادے کے ساتھ ان کی لفظیات اور تراکیب میں بھی اشتراک و ارتباط کی مختلف صورتیں سخن شناسی کے لیے دامانِ خیال کو دعوتِ نظر دیتی ہیں۔

Prof. Abdul Haque, 2315- Hudsan Lane, Kings Way Camp, Delhi - 10009

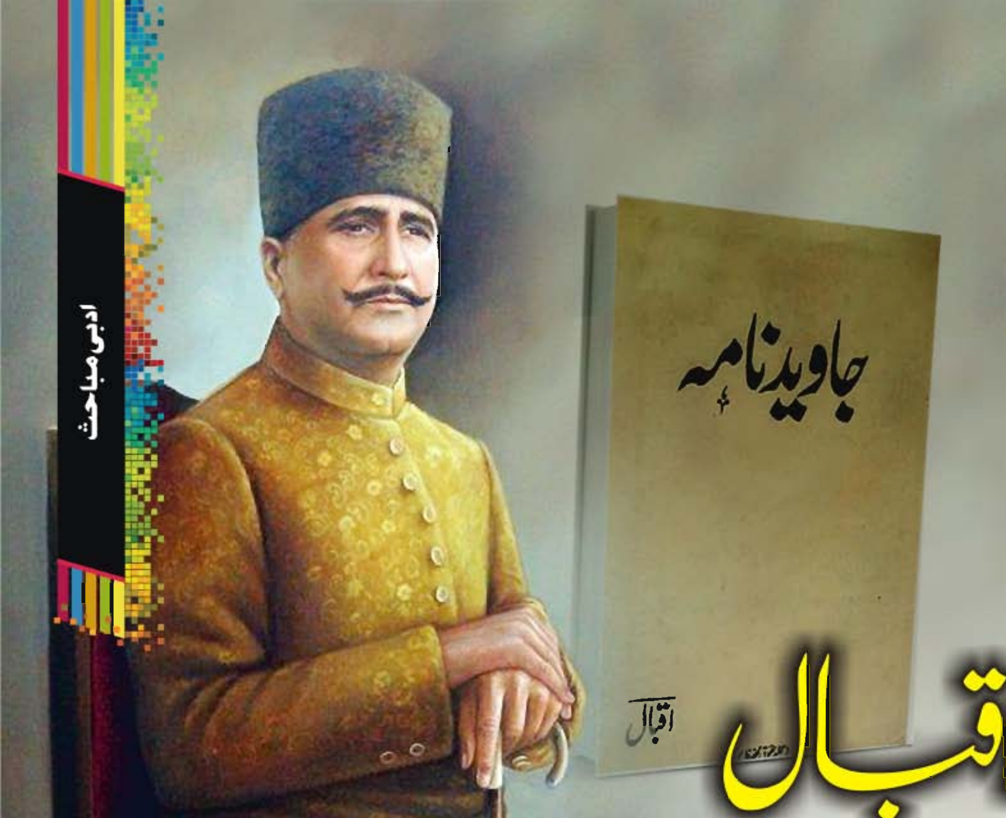

سید تقی عابدی

جاوید نامہ - اقبال

انسان سازی کا زندہ جاوید شاہکار

’جاوید نامہ‘ کی تصنیف 1927 میں ’زبورِ عجم‘ کی تکمیل کے بعد شروع ہوئی اور یہ کتاب فروری 1932 میں طبع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔ چودھری محمد حسین نے ’جاوید نامہ‘ کی تصنیف کا آغاز 1929 بتایا ہے لیکن مکتوبات اقبال میں سید نذیر نیازی کے بیان کے مطابق جب وہ 1927 کے موسم گرما میں ڈاکٹر عابد حسین کی معیت میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے اپنی بیاض اشعار سے چند قطعات سنائے جو آگے چل کر ’جاوید نامہ‘ کا جزو بنے۔

علمائے ادب نے ’جاوید نامہ‘ کو پانچویں اہم فارسی ادبیاتی کتاب قرار دیا ہے یعنی اس کا شمار شاہ نامہ فردوسی، گلستان سعدی، مثنوی معنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر علامہ کی نثری اور منظوم تصانیف پر سرسری نظر ڈالی جائے تو سب سے بلند پایہ اور عظیم کتاب علامہ کے سات خطبات کا اردو ترجمہ ہے جو ’تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ‘ کے نام سے شائع ہوئی چنانچہ ان خطبات کے بعد جو معرکہ آرا تصنیف ہے وہ ’جاوید نامہ‘ ہی ہے جسے علامہ اپنی زندگی کا ماحصل بتاتے ہیں۔ ’جاوید نامہ‘ ایک طویل تمثیلی نظم ہے جس میں (1837) اشعار ہیں۔ ان میں (73) اشعار تضمینی ہیں۔ اس نظم کی بحر بھی علامہ کی دوسری فارسی مثنویوں کی بحر رمل ہی ہے۔ علامہ کی فارسی تصانیف میں صرف مثنوی ’گلشن راز جدید‘ کی بحر جدا ہے۔ ’جاوید نامہ‘ میں مثنوی کے اشعار کے ساتھ ساتھ غزل، ترکیب بند اور ترجیع بند کے اشعار بھی ہیں۔ علامہ نے ’جاوید نامہ‘ میں شاعری اور فلسفۂ حیات کے حقائق و معارف بڑے ہی اچھوتے اور دلکش انداز میں نظم کیے ہیں جن کا ماخذ تعلیمات قرآنی، احادیث نبوی، تاریخ اسلام اور مثنوی معنوی مولانا روم ہے۔ علامہ کی شعرگوئی کے متعلق مشہور ہے کہ جب ان پر اشعار کی آمد ہوتی تو ایک ہی نشست میں درجنوں شعر کہہ لیتے تھے۔ لیکن ’جاوید نامہ‘ کے اٹھارہ سو اشعار کے لیے پانچ سال کا عرصہ درکار ہوا جس سے اس کتاب کے مضامین اور مطالب کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب علامہ کی دوسری تصانیف سے جداگانہ ہے۔ اس کا خاص تعلق ’عالم بالا‘ سے ہے اسی لیے علامہ نے فرمایا ہے:

آنچہ گفتم از جہانِ دیگر است
ایں کتاب از آسمانِ دیگر است

کیونکہ اس کے اشعار میں تقریباً تمام ادیان اور مذاہب کی شخصیات کا ذکر اور فلسفہ و تصوف اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے اس لیے اس کا سمجھنا آسان نہیں اور شاید اسی لیے علامہ نے کہا:

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن
دارم از روزی کہ می آید سخن
برجواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرشاں پایاں کن ژرفِ مرا

یعنی میں عمر رسیدہ اور کہنہ فکر افراد سے ناامید ہوں لیکن اُمیدوار ہوں کہ ایک روز مجھے سمجھا جائے گا اے خدا میرے جوانوں پر میری فکر اور تحریر کو آسان کر تا کہ وہ اس پیام سے استفادہ کرسکیں۔ فروری 1932 میں جب ’جاوید نامہ‘ کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کے دیباچے میں علامہ اقبال نے ’زبورِ عجم‘ کے دو شعر لکھے جو اس کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ 1947 میں بغیر کسی وجہ سے حذف کردیے گئے۔ یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ اس عظیم شاہکار کتاب کا دوسرا ایڈیشن پندرہ سال بعد تک شائع کرنے کی نوبت اس لیے پیش نہ آئی کہ عوام نے اس کا پرتپاک خیر مقدم نہیں کیا۔ بہرحال جو دو شعر چودھری محمد حسین نے حذف کردیے وہ یہ ہیں:

خیال من بہ تماشائے آسماں بود است
بدوش ماہ و با آغوش کہکشاں بوداست
گماں مبرکہ ہمیں خاک داں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بود است

علامہ اقبال نے 'جاویدنامہ' میں اہم مباحث پر بحث کی ہے اس میں ماہیت زماں ومکان، ماہیت عالم اور آدم، مفہوم خلوت و جلوت، موازنہ عقل وعلم، موازنہ عشق وعقل، موازنہ حکمت و عرفان، مفہوم رحمت للعالمین، معنی محمود انا محمود وغیرہ کے علاوہ فلسفہ تقدیر، فلسفہ تن وجان، افکار بھرتری ہری، فکر نیطشے، تصوفی اقدار، آویزش وطن ودین، عشق محمدی، دیدار رسول ودیدار حق وغیرہ درجنوں مضامین ومباحث کا گلدستہ تیار کیا ہے۔

علامہ اقبال نے کبھی صرف ادب برائے ادب شاعری نہیں کی بلکہ ان کی شاعری برائے ہدف تھی اسی لیے تو کہا تھا اگر میں خواجہ حسن نظامی کی طرح نثر لکھ سکتا تو کبھی شاعری کو اپنے پیام کا ذریعہ نہیں بناتا۔ علامہ صرف فن برائے فن کے قائل نہ تھے بلکہ فن کی قدرت سے انسانیت کے جوہر سنوارنے کے قائل تھے۔ علامہ شاعرِ انسانیت ہیں۔ اقبال شاعرِ حیات ہیں۔ اپنے ایک خط میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں ''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔'' اقبال کا مقصد انسان کو بلندیوں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ نیابت الٰہی کا فریضہ ادا کرسکے اور دنیا میں صحیح معنوں میں حکومت الٰہیہ قائم ہوسکے۔ اقبال کے پاس انسانی عظمت کا اقرار خدا کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ جب جنگ جہانی اوّل کے بعد ضعیف ملکوں کو پامال کیا جارہا تھا جب اشتراکیت کے نام پر مذہب کو نیلام کیا جارہا تھا اُس وقت یہ اشعار انسانی اقدار کے نقیب بن کر ظاہر ہوئے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شواز مقامِ آدمی
کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبیں این است و بس

یعنی کوئی دنیا میں کسی کا محتاج نہ رہے اور الٰہی کا اصل پیغام یہی ہے کیونکہ:

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

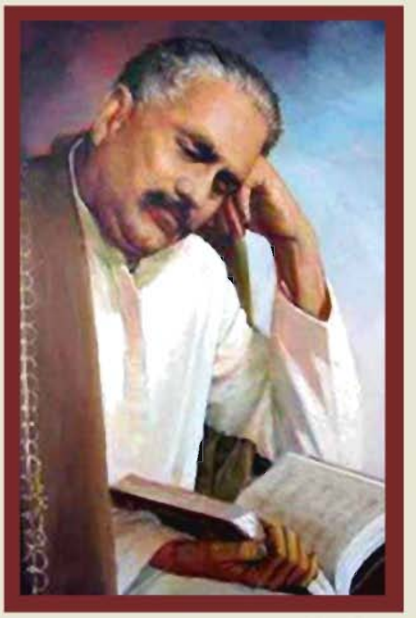

جو چیز شیروں کو لومڑی صفت بنا دیتی ہے وہ صرف اور صرف ضرورت اور احتیاج ہے۔ اقبال انسان کو کھویا ہوا مرتبہ دلانے کے خواہاں ہیں وہ انسان کی خودی کو ارتقا کے منازل پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

منکرِ حق نزد ملا کافر است
منکر خود نزد من کافر تراست

یعنی اللہ کا منکر ملا کے نزدیک کافر ہے اور اپنی خودی کا منکر اور انکار کرنے والا میری نظر میں بڑا کافر ہے پھر فرماتے ہیں:

آنچہ در آدم بہ گنجد عالم است
آنچہ در عالم نہ گنجد آدم است

یعنی عالم اور کہکشاں میں آدمی سما نہیں سکتا لیکن آدمی میں عالم اور کہکشاں سمائے جاسکتے ہیں یعنی انسان کے مقابلے میں کہکشاں ناچیز ہے آفاق انسان سے چھوٹے اور کمزور ہیں بشرطیکہ انسان بیدار اور خودی کی بلندی پر ہو۔ علامہ کے نظریہ کے تحت بیداریِ دل اصلی ایمان ہے۔ فرماتے ہیں:

کافری بیدار دل پیشِ صنم
یہ ز دینداری کہ خفت اندر حرم

یعنی ایک کافر بیدار دل کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبہ میں سو رہا ہے۔ آگے جاویدنامہ میں فرماتے ہیں:

دین حق از کافری رسوا تراست
زانکہ ملا مومن کافر گراست
دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

یعنی دین حق آج کفر وکافری سے رسوا تر ہوچکا ہے کیونکہ ہمارا ملا مومنوں کو کافر بنا رہا ہے انھیں کفر کی تعلیم دے رہا ہے۔ ایک طرف کافر جہاد اور لڑائی کی فکر اور تدبیر میں مشغول ہیں تو دوسری طرف ہمارا ملا مسلمانوں میں اللہ کے نام پر فساد برپا کر رہا ہے۔

علامہ اقبال نے مولانا روم کے بعد سب سے زیادہ اشعار اگر کسی شخصیت پر لکھے تو وہ ٹیپو سلطان شہید تھے اور ان اشعار کو علامہ نے اپنی سب سے اہم منظوم کتاب جاویدنامہ کا جزو بنایا۔ جاویدنامہ ہی کے متعلق محمد جمیل بنگلوری کو 4 اگست 1929 میں لکھتے ہیں: ''سلطان شہید پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہوگئی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں۔ 'جاویدنامہ' میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں اس کے لیے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا۔'' اسی 'جاوید نامہ' کو علامہ مصور بنانے کے بھی خواہش مند تھے چنانچہ اپنے مکتوب 31 مارچ 1933 میں لکھتے ہیں: ''اہم کام یہ ہے کہ جاویدنامہ کا تمام و کمال ترجمہ کیا جائے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کرلینا یقینی امر ہے۔ اگر وہ ترجمے میں کام ہوجائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور بنادے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصور کے لیے عمدہ مسالہ ہے۔'' پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ 25 جون 1935 میں کاظمی کو لکھتے ہیں ''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف 'جاویدنامہ' ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کرسکتا ہے مگر اس کے لیے مہارت فن کے علاوہ الہام الٰہی اور صرف کثیر کی ضرورت ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی اسکول کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ

اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصور کے لیے عمدہ مسالہ ہے۔'' پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ 25 جون 1935 میں کاظمی کو لکھتے ہیں ''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف 'جاویدنامہ' ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دنیا میں نام پیدا کرسکتا ہے مگر اس کے لیے مہارت فن کے علاوہ الہام الٰہی اور صرف کثیر کی ضرورت ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی اسکول کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصور اقبال ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔

دنیائے اسلام میں بحیثیت مصور اقبال ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔ پوری مہارت فن کے بعد آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔" علامہ اقبال کے کلام کا مقصود انسان کو بلندیوں تک پہنچانا ہے تاکہ وہ نیابت الٰہی کا فریضہ ادا کر سکے اور دنیا میں صحیح معنوں میں حکومت الٰہیہ قائم ہو سکے۔ اقبال کے پاس انسانی عظمت کا اقرار خدا کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ اقبال کا مقصد اصلی انسان سازی ہے۔ اقبال نے 'جاوید نامہ' میں حیات اور کائنات کا دقیق مطالعہ بڑے انوکھے ماحول یعنی مابعدالطبعیاتی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ یہاں وصل سے بڑھ کر اور پر لذت فراق ہے۔ وہ عشق کی بدولت خدا کی صفات کو بندہ میں پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ اقبال عشق کی عقل پر برتری کے صرف قائل نہیں بلکہ عشق کو بندگی کی معراج جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان سازی اور خدمت انسانیت اصل مقصد شاعری ہے جو پیامبرانہ طریقۂ کار ہے:

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است
علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم باعشق است از لاہوتیاں
چشم برحق باز کردن بندگی است
خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

'جاوید نامہ' کو ایک اور چیز جو ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا محرک کوئی عورت نہیں۔ علامہ اقبال نے اس تمثیلی نظم میں حقائق نگاری اور نکات آفرینی پر زور دیا ہے جبکہ دنیائے ادب کے دیگر شہکاروں میں منظر نگاری کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ ان شاہکاروں کا محرک بھی عورت رہی ہے جیسے دانتے نے بترس، کالی داس نے شکنتلا، امیر خسرو نے دول رانی، نظامی نے شرین، جامی نے زلیخا اور وارث شاہ نے ہیر کی محبت کی داستانوں سے مرقع کشی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ نے جاوید نامہ کی تصنیف میں کم از کم تین کتابوں کو سامنے رکھ کر مطالب اور مضامین میں روح پھونکی ہے جس میں شیخ اکبر ابن عربی کی 'فتوحات مکیہ' ابوالعلامعریٰ کی 'الغفر ان' اور دانتے کی 'ڈیوائن کامیڈی' شامل ہیں۔

دراصل 'جاوید نامہ' مناجات سے شروع ہوتا ہے اور جاوید سے خطاب یا (نثرادنو سے خطاب) پر تمام ہوتا ہے۔ اس میں (1837) اشعار ہیں جن میں (73) شعر تضمینی ہیں۔ اس تمثیلی نظم میں مثنوی کے اشعار کے ساتھ ساتھ غزل، ترکیب بند اور ترجیع بند کے شعر بھی شامل ہیں۔

شاعر ایک شام دریا کے کنارے ٹہل رہا ہے اور مولانا روم کے اشعار گنگنا رہا تھا کہ مولانا روم کی روح نمودار ہوتی ہے۔ مناجات کے بعد تمہید آسمانی ہے جس میں شاعر یہ بتاتا ہے کہ وہ عشق کی بدولت زمان و مکان پر غالب آسکتا ہے۔

عشق اوبرلامکاں شب خوں زند

تمہید آسمانی کے بعد تمہید زمینی ہے جس میں رومی نے اس سوال کا جواب دیا کہ انسان کس طرح سے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے یعنی 'مشت خاکی مانع پرواز نیست' پھر اس کے بعد زمان و مکان کی روح نمودار ہوتی ہے جس کے دو چہرے ہوتے ہیں ایک تاریک اور دوسرا روشن۔ زمان و مکان کی روح کہتی ہے اگر تم مجھ پر غالب ہونا چاہتے ہو تو 'معیت الٰہی' حاصل کرو اور یہ معیت عشقِ رسولؐ کی بدولت حاصل ہوگی۔ اس زمان و مکان کی روح کو علامہ نے 'زرواں' کا نام دیا ہے۔ یہ روح پھر رومی اور اقبال کو عالم بالا کی سیر کرانے لے جاتی ہے اور وہ سب سے پہلے فلک قمر میں پہنچتے ہیں جس کے ایک غار میں ان کی ملاقات ہندوستان کے مشہور یوگی 'وشوامتر' سے ہوتی ہے جسے اقبال 'جہان دوست' کہتے ہیں پہلے وہ یوگی شاعر کا تعارف پوچھتا ہے اور پھر امتحان کرتا ہے کہ بندہ کس علم کی نسبت میں خدا سے بہتر جانتا ہے شاعر جواب دیتا ہے 'علم الموت' کیوں کہ خدا کو موت نہیں۔ جب وشوامتر جہان دوست شاعر کی قابلیت سے مطمئن ہو جاتا ہے تو حقائق اور معارف کے رموز اور نکات بیان کرتا ہے۔ یہاں سے رومی اور شاعر (اقبال) وادی طواسین میں جاتے ہیں جہاں گوتم، زرتشت، مسیح اور حضرت محمدؐ کی طاسین یعنی تعلیمات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد رومی اور شاعر فلک عطارد میں جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ لوگ شاعر کو دین اور سیاست کا تعلق بتاتے ہیں اور علوم قرآنی کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور جمال الدین افغانی روس کو اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ فلک عطارد سے نکل کر دونوں فلک زہرہ پر جاتے ہیں جہاں اُن کی ملاقات اور گفتگو فرعون وغیرہ کی روحوں سے ہوتی ہے پھر وہ فلک مریخ پر جاتے ہیں جہاں ایک بدکار عورت جسے شیطان نے بچپن میں اغوا کر کے اس سیارے میں رکھا تھا وہ شیطان کی مبلغ بن کر کام کر رہی ہے اور عورتوں کو گمراہ کر رہی تھی۔ اس مکالمہ میں اقبال نے مغرب اور خاص کر یورپ کی عورتوں کی بے حیائی اور کسمپرسی پر تنقید کی ہے۔

جب وشوامتر جہان دوست شاعر کی قابلیت سے مطمئن ہوجاتا ہے تو حقائق اور معارف کے رموز اور نکات بیان کرتا ہے۔ یہاں سے رومی اور شاعر (اقبال) وادی طواسین میں جاتے ہیں جہاں گوتم، زرتشت، مسیح اور حضرت محمد کی طاسین یعنی تعلیمات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد رومی اور شاعر فلک عطارد میں جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ لوگ شاعر کو دین اور سیاست کا تعلق بتاتے ہیں اور علوم قرآنی کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور جمال الدین افغانی روس کو اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

پھر فلک مشتری میں ان کی ملاقات غالب، حسین ابن منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ سے ہوتی ہے۔ یہاں پر 'انا الحق' کا مفہوم بتایا گیا ہے۔ 'خودی' پر گفتگو ہے اور تقدیر کے فلسفے پر گہری باتیں بتائی گئی ہیں۔ پھر فلک زحل میں ارواح رذیلہ کو دکھایا گیا ہے:

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگِ آدم ننگ دیں ننگِ وطن

افلاک سیر ختم کر کے شاعر 'آنسوئے افلاک' یعنی دوسری طرف جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات جرمن کے نیطشے سے ہوتی ہے پھر جنت الفردوس میں شرف النسا بیگم، سید علی ہمدانی، طاہر فنی، نادر شاہ، شاہ احمد ابدالی اور ٹیپو سلطان سے ہوتی ہے اور ٹیپو کا پیغام بھی ملت کو دیا جاتا ہے:

در جہاں نتواں گر مردانہ زیست
ہمچوں مرداں جاں سپردن زندگی ست

یعنی اگر دنیا میں مردوں کی طرح زندگی ممکن نہیں تو مردانہ وار شہید ہونا چاہیے۔

جنت میں حوریں شاعر کو روکتی ہیں لیکن شاعر ایک غزل سنا کر حضور خداوندی میں اکیلا چلا جاتا ہے اور عرض کرتا ہے۔

اے خدا:

ع این چنین عالم کجا شیان توست؟
ع چیست آئینِ جہانِ رنگ و بو؟
ع چار سو اغراق اندر خویش کن

یعنی یہ عالم تیری شان کے لائق تو نہیں؟ یہاں کا قانون کیا ہے۔ اِسے اب اپنے میں سمو لے اور جب تو ایسا کرے گا تو معلوم ہو جائے گا:

بازبینی من کیم تو کیستی

پھر بھی معلوم ہو جائے گا میں کون ہوں اور تیری ذات اقدس کیا ہے۔ یعنی قطرہ دریا میں مل جانے کے بعد بھی اپنی شناخت باقی رکھے گا۔

■

Dr. Syed Taghi Abedi, 1110 Secretariate Road, New Market, ON , L3X 1M4 Canada, Ph: Mob: 416-318-5540

رتن ناتھ سرشار کے ناول

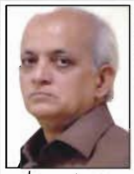

پروفیسر علی احمد فاطمی

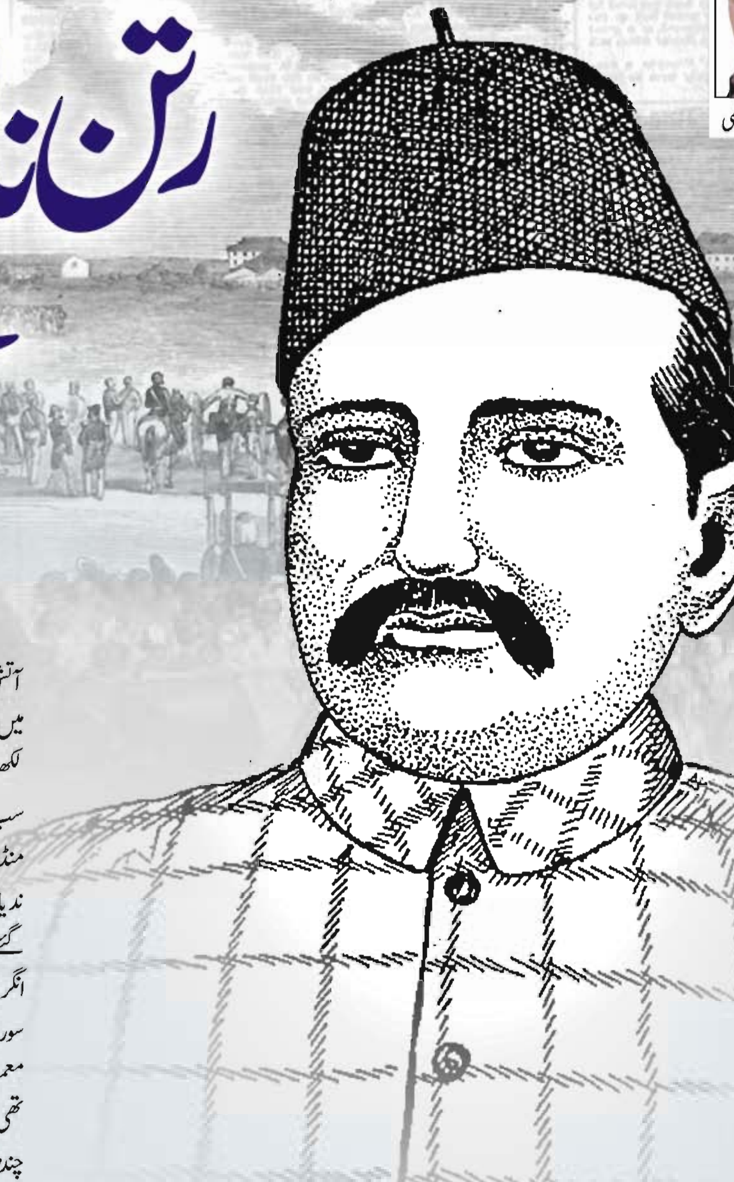

1857 کے حادثے نے یوں تو پورے ہندوستان کو جھنجھوڑا، لیکن دہلی بطور خاص متاثر ہوا۔ خطہ لکھنؤ میں اس حادثے کے اثرات نسبتاً دیر میں پہنچے۔ نوابی عہد کے خاتمے کے بعد بھی لکھنؤ بے فکری اور جھوٹی شان وشوکت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ حقیقت اب بے نقاب ہوچکی تھی کہ سماجی، تہذیبی اور معاشرتی اعتبار معاملات کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ لیکن اس پر پردہ ڈالنا اور زوال پذیر تہذیب ومعاشرت سے منھ پھیر کر اسی انداز سے زندگی گزارنا لکھنؤ والوں کا شیوہ بن چکا تھا۔ لیکن وہ کرتے بھی کیا وہ تو مجبور تھے۔ عرصۂ دراز سے چلے آرہے تعیش پسندانہ ماحول، ایک لامتناہی شب وروز کی عشرت کوشی کو اتنی جلدی وہ کیسے بھلا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ غدر جیسے ہنگامہ خیز اور دوررس انقلاب نے جتنی تیزی سے دہلی پر اثر ڈالا اتنی تیزی سے وہ لکھنؤ کو متاثر نہ کرسکا اور جب کیا تو ایک دوسری شکل میں جو دہلی کے برعکس تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس سے قبل غدر کے اثرات سرشار جیسے فنکار کے منظرعام پر لائے دہلی کے ماحول نے نذیر احمد کو پیدا کردیا اور صنف ناول کے ظہور اور اس کی ابتدا کا سہرا بجائے لکھنؤ دہلی کے ہاتھوں عمل میں آیا، جبکہ غدر کا ہنگا تقریباً ساتھ ساتھ ہوا اور دونوں ایک ساتھ لٹے اور برباد ہوئے۔

لکھنؤ غدر سے قبل کا ہو یا بعد کا اس کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہر دور میں لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں غدر سے قبل کے ادب کا محاسبہ مقصود نہیں، لیکن آتش، ناسخ، انیس، نسیم، شوق یا اسی طرح کے دوسرے فنکاروں کے نام لکھنؤ کے ادبی ماحول اور کارناموں کا پتہ دیتے ہیں۔ ادب وتہذیب کا یہ رنگین ماحول لکھنؤ کے درودیوار میں سرایت کرچکا تھا۔ لکھنؤ کے گلی کوچوں سے شعر ونغمہ کی آوازیں پھوٹتی تھیں۔ میر انیس کے مرثیے، آتش کی غزلیں، شوق کی مثنوی لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں میں سرایت کرگئی تھیں۔ ان کے خوبصورت اور دلکش اشعار اہلِ لکھنؤ کی زبانوں پر گونجتے رہتے تھے، لیکن اچانک غدر نے سب تباہ کردیا۔ وہ سڑکیں جہاں بروقت بے فکری اور دلچسپی منڈلاتی رہتی تھی وہاں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ نوابی عہد ختم ہوا۔ واجد علی شاہ مٹیابرج چلے گئے۔ محفلیں درہم برہم ہوگئیں۔ بے فکری رخصت ہوگئی۔ انگریز آگئے اور ان کی آمد سے تہذیب ومعاشرت کا ایک نیا سورج طلوع ہوا جو مغربی تہذیب، تفکر اور تمدن کی کرنوں سے معمور تھا۔ ایک تہذیب مٹ رہی تھی تو دوسری جنم لے رہی تھی۔ ایک سماج ختم ہورہا تھا تو دوسرا پیدا ہورہا تھا۔ ایسے میں چند طنز ومزاح نگاروں کا ایک ادبی گروہ ابھر کر سامنے آیا جس کا خمیر تو پرانی تہذیب ومعاشرت سے اٹھا تھا لیکن دل ودماغ کے دریچے قدیم تہذیب کے رخصت اور نئی تہذیب کی آمد کے درمیان کھلے۔ اس گروہ نے ان تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کیا اور زندگی کی حقیقتوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھا اور رخصت ہوتی ہوئی تہذیب کی بعض خوبیوں کو بھی فرسودہ کہا۔ کچھ نئے کا مذاق بھی اڑایا لیکن ساتھ ہی استقبال بھی کیا۔ اک عجب کشمکش تھی۔ عجیب متضاد صورت حال تھی۔ بہرحال اس گروپ نے استقبال زیادہ کیا اور یہی اس کی تعقل پسندی تھی سمجھداری جسے آپ روشن خیالی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ گروپ اودھ کے مشہور اخبار 'اودھ پنچ' سے تعلق رکھتا تھا۔ ان میں منشی سجاد حسین، مرزا محمود بیگ ظریف، تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، اکبرالہ آبادی اور رتن ناتھ سرشار تھے، جس میں ادبی طور پر سب سے زیادہ شہرت اکبرالہ آبادی اور سرشار کو ملی۔

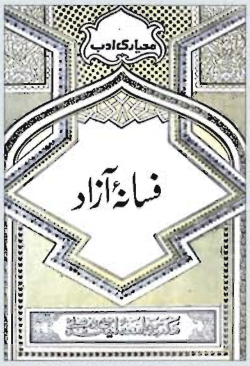

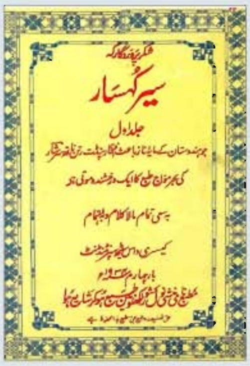

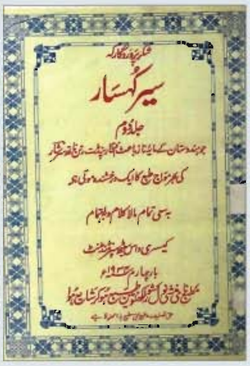

خطہ دہلی میں غدر کے بعد ابھرنے والی اہم شخصیتوں میں سرسید، نذیر احمد، حالی، چراغ علی اور دوسرے لوگ تھے۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے ان دونوں گروہ کی اہم شخصیات اور ان کے کارناموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے وہ ان دونوں کے فرق سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ ان دونوں کے کارناموں کے پیچھے دونوں جگہوں کا ماحول پوشیدہ ہے، جس طرح کی تخلیقات سرسید، حالی اور نذیر احمد کی منظرِ عام پر آئیں وہ باتیں لکھنؤ کے ادیبوں میں نہیں۔ حالانکہ دونوں گرہ غدر کے بعد کے ہیں۔ دونوں جگہیں ایک ساتھ تباہ ہوئیں اور دونوں جگہوں پر تقریباً ایک ساتھ انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ دونوں کی تخلیقات کا مقصد بھی ایک، پھر بھی دونوں میں اتنا غیر معمولی فرق۔ یہ بات یقیناً قابل غور ہے اور یہی خط فاصل ہم نذیر احمد اور سرشار کے درمیان کھینچ سکتے ہیں۔ یہاں مناسب ہے کہ پروفیسر قمر رئیس کے ان جملوں کو دہراتے چلیں۔ وہ نذیر احمد اور سرشار کے درمیان بنیادی فرق کو اس طرح دیکھتے ہیں:

''نذیر احمد مولوی تھے، سرشار مست لاأبالی۔ نذیر احمد کی تعلیم و تربیت شیوخ و ملی گھرانے کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ سرشار لکھنؤ کے رنگین مزاجوں کے دلواگان میں۔ نذیر احمد نے انگریزی چھپ کر پڑھی تھی۔ سرشار نے اسکول اور کالج میں۔ نذیر احمد کے سامنے دلّی کے اجڑے ہوئے مسلمان گھرانے تھے۔ سرشار کی نظر لکھنؤ کے ہر کوچہ اور ہر طبقہ پر تھی۔ نذیر احمد کے سامنے مذہبی اور اخلاقی عقائد اشخاص کے لطیف اور نازک جذبات کو دیکھنے اور دکھانے کے مانع رہے۔ سرشار کی رندمشربی نے ہر قسم کے جذبات کو ایسی گرم جوشی سے لبیک کہا کہ مذہب اور اخلاق منھ تکتے رہ گئے۔'' (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص 124)

یہی ہے دونوں میں فرق جس نے نذیر احمد کو 'مراۃ العروس'، 'توبۃ النصوح' وغیرہ لکھوانے پر مجبور کیا اور سرشار کو 'فسانۂ آزاد'، 'جامِ سرشار' وغیرہ۔ بعض لوگ نذیر احمد کے ناولوں کو محض اخلاق و نصیحت کا پلندہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور سرشار کے ناولوں کو فنی اعتبار سے مکمل قرار دیتے ہیں، لیکن یہ فیصلہ بھی جلد بازی کا ہے جو بہت زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ اتنی بات سب جانتے ہیں کہ نذیر احمد کے کئی ناول سرشار کے فسانہ سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ فسانہ اگرچہ اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوتا رہا، لیکن کتابی شکل میں 1880 میں شائع ہوا اور اس سے قبل نذیر احمد کے تین ناول 'مراۃ العروس' (1869)، 'بنات النعش' (1872)، 'توبۃ النصوح' (1874) سرشار کے سامنے آچکے تھے۔ بدمستوں کا یہ گروہ لکھنؤ کی اسی زندگی میں ایسا بدمست اور سرشار تھا کہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر اپنا سارا زورِ قلم وہیں کی نقش گری میں صرف کر دیا۔ یہ ان کی فنکاری تھی کہ اس میں سے چند نقوش ایسے تھے جوان کو حیات جاوید بخش گئے۔ 'فسانۂ آزاد' اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ اس کے ثبوت کی ضرورت نہیں کہ 'فسانۂ آزاد' اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوتا تھا اور جس کا مقصد خاص یہ تھا کہ خوبصورت اور دلکش پیرایہ میں زوال پذیر تہذیبِ اودھ کا اظہار کیا جائے اور قہقہوں کے دائرے میں بکھرے ہوئے لکھنؤ کی

نذیر احمد مولوی تھے، سرشار مست لااُبالی۔ نذیر احمد کی تعلیم و تربیت شیوخ و ملی گھرانے کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ سرشار لکھنؤ کے رنگین مزاجوں کے دلواگان میں۔ نذیر احمد نے انگریزی چھپ کر پڑھی تھی۔ سرشار نے اسکول اور کالج میں۔ نذیر احمد کے سامنے دلّی کے اجڑے ہوئے مسلمان گھرانے تھے۔ سرشار کی نظر لکھنؤ کے ہر کوچہ اور ہر طبقہ پر تھی۔ نذیر احمد کے سامنے مذہبی اور اخلاقی عقائد اشخاص کے لطیف اور نازک جذبات کو دیکھنے اور دکھانے کے مانع رہے۔

ادبی و تہذیبی عکاسی کی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا مقصد اقتصادی اور معاشی زندگی کی پیشکش بھی تھا۔

کیونکہ سرشار ادب میں صحافت کے راستے سے آئے تھے۔ جینے کے لیے دو روٹی اور پینے کے لیے دو قطرہ آبِ حیات بہت ضروری تھا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار کرے گا کہ بعض اوقات سرشار نے محض شراب کے لیے لکھا، اس کا ثبوت پریم چند کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے سرشار سے متعلق لکھے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو سرشار کو نذیر احمد سے پیچھے لے جاتا ہے اور سرشار کے شیشۂ عظمت میں دراریں ڈال دیتا ہے لیکن اس سے قطع نظر اگر ہم پھر بھی سرشار کی فنکاری پر غور کریں تو بہت سے معاملات میں وہ نذیر احمد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور صنفِ ناول کے ارتقا میں نذیر احمد سے بڑا رول ادا کر جاتے ہیں۔

رتن ناتھ سرشار لکھنؤ کے اس ماحول کی پیداوار ہیں جس کے لیے لکھنؤ مشہور ہے اس پر رجب علی بیگ کی شاگردی اور رنگ لے آئی۔ وہ 'فسانۂ عجائب' کی زبان سے بے حد متاثر تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جب انھوں نے ہوش و حواس کی آنکھیں کھولیں تو اپنے سر پر مغربی سورج کو طلوع ہوتے دیکھا اور مشرقی تمدن کو غروب ہوتے دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قدیم اور جدید کے بھنور میں پھنس گئے۔ اب یہ ان کی قسمت یا حکمت تھی کہ پلڑا جدیدیت کی طرف زیادہ جھک گیا جو بعد میں ان کی شہرت و عظمت کا باعث بن گیا۔

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں ان کے تمام ناولوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نقص ضرور ملتا ہے کہ ان کے زیادہ تر ناول ایک ہی موضوع پر لکھے گئے۔ خواہ وہ 'فسانۂ آزاد' (1880) ہو یا 'جامِ سرشار' (1887)، 'سیر کہسار' (1890)، 'کامنی' (1894)، 'کڑم دھڑم' (1894) وغیرہ کوئی بھی ہو۔ لیکن ان میں جو شہرت 'فسانۂ آزاد' کو ملی وہ کسی اور کتاب کو بقول آل احمد سرور:

''سرشار 'فسانۂ آزاد' کی وجہ سے زندہ ہیں۔ دوسری تصانیف سرشار کی وجہ سے لوگوں کو یاد ہیں۔''

سرشار کا فسانہ پڑھ جائیے پورا لکھنؤ سمایا ہوا ہے۔ وہ لکھنؤ جو جاگیردارانہ عہد کو کھو رہا ہے اپنی عظمتوں سے ہاتھ دھو رہا ہے۔ سرشار نے بہت ہی خوبی کے ساتھ لکھنؤ کے اس دور کی عکاسی کی ہے۔ وہی مسخرے، بے فکرے شاعر، طوائفیں، ریال، قوال، کبابچی، مولوی سب وہی جو سرور کے صفحات میں جگمگاتے ہیں۔ لیکن سرور کے یہاں ان تمام کرداروں کی عظمتیں ہیں، لیکن سرشار نے ان تمام کرداروں کو زوال پذیر تہذیب کا نمائندہ بنا کر پیش کیا اور اتنا ہی نہیں ان کرداروں کے ساتھ انھوں نے فوٹو گرافر، بیرسٹر، وکیل، ٹکٹ بابو، اخبار والے جیسے کرداروں کو بھی پیش کیا اور یہیں سے سرشار سرور سے آگے نکل جاتے ہیں، کیونکہ سرشار کے سامنے ایک نیا تعلیمی گروہ،

روشن خیال طبقہ ابھر رہا تھا جس کا سرشار نے استقبال کیا اور یہی بات سرور کے یہاں نہیں ملتی۔ یہ فرق سرشار کو نمایاں تو ضرور کر دیتا ہے لیکن ان کے اپنے نقطۂ نظر کو واضح نہیں کرتا۔ وہ بعض جگہوں پر مشرق کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور بعض مقامات پر اس کے زوال پر افسوس بھی ظاہر کرتے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لطیف حسین ادیب نے بتائی:

''وہ مشرق کی پیداوار ہے لیکن مغرب کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کا دل مشرق کے لیے دھڑکتا ہے، اس کو مشرق سے محبت ہے لیکن طرزِ فکر مغربی ہے۔ مغرب کی بہت سی باتوں کا حامی اور موید پھر وہ کسی خاص طبقہ سے وابستہ نہیں معلوم ہوتا۔ حالانکہ طبقاتی کشمکش پر گہری نظر ہے اور چھوٹے طبقے کا دوست ہے۔''

(سرشار کی ناول نگاری، ص 111)

سرشار نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ادب کا اور زندگی کا نقطۂ نظر رفتہ رفتہ دُھند سے نکل کر صاف مقام پر آرہا تھا۔ سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد کی تخلیقات منظر عام پر آچکی تھیں۔ انگریزی ناول نگاروں میں ڈکنس، تھیکَرے وغیرہ کے ناول سرشار پڑھ چکے تھے۔ ایک طرف ان کا مطالعہ، دوسری طرف لکھنؤ کا مشاہدہ دونوں نے مل کر سرشار کو ایک ایسا فسانہ لکھنے پر مجبور کر دیا جو بعض نقادوں کے خیال کے مطابق داستان اور ناول کے بیچ ہو کر رہ گیا۔ بقول قمر رئیس:

''ان کا فن ناول کی بنسبت داستان اور رومان سے زیادہ قریب ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ سرشار سرور کے 'فسانۂ عجائب' اور سروانٹسن کے واقعاتی رومانس ڈان کوزک روٹ سے متاثر ہو کر ناول نگاری یا حقیقت پسندانہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔ ان قصوں کا اندازہ ان کی شخصیت کی محض افتاد سے بھی مناسبت رکھتا تھا، لیکن اس اثر پذیری نے انھیں ناول کے فنی تقاضوں سے دور کر دیا۔''

یہ سچ ہے کہ سرشار انگریزی ناولوں کے مطالعے کے بعد اپنی تخلیق کو اس پایہ تک نہیں پہنچا سکے لیکن ان خصوصیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے کردار نگاری، زبان و بیان، عشق، سماج یا اسی طرح کے دیگر موضوعات میں اپنی ذات سے پیدا کیں۔

'فسانۂ آزاد' ایک شہر، ایک سماج کی بہت سی پرتوں کو ہمارے سامنے رکھتا ہے جو سرشار کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کا ثبوت دیتا ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اپنے زبان و بیان کی قدرت سے اس میں جان ڈال دیتے ہیں کہ قاری بغیر مکمل کیے اٹھ نہیں سکتا۔

سرشار فطری طور پر طنز و مزاح نگار تھے۔ لکھنؤ کی گرتی ہوئی تہذیب کو اپنے مزاح کے اسی سانچے میں ڈھالا۔ سرشار ہنسی ہنسی میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور جہاں سنجیدہ ہوئے لطف، غائب۔ بقول علی عباس حسینی ''ان کے ناولوں میں سارا لطف ان غپوں میں ہے جب وہ... بے پر کی اڑائے ہیں'' اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے ناولوں کا پھکڑ پن اور غپیں ہی ان کی کامیابی کا راز ہیں۔ اس کے بالکل برعکس نذیر احمد کے بعض ناولوں میں اخلاقی درس سے پر تقریریں ان کے ناولوں کے بہترین حصے سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں سرشار کا فن قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے اس ابھرتی ہوئی صنف ناول میں کوئی اور اضافہ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن نذیر احمد کے ناولوں کے موضوعات، تضادات اور روکھے پن کو دلچسپ پیرایے اور ناول کے دائرے میں پیش کیا اور اضافے کیے۔

سرشار نے پہلی بار اپنی ذات سے ناول نگاری میں فن مزاح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سرشار فطری طور پر مزاح نگار تھے اودھ پنچ کے گروپ میں شامل ہو کر اس فطرت و صلاحیت کو مزید جلا ملی۔ اودھ پنچ سے قبل اگرچہ غالب کے خطوط سامنے آچکے تھے، ان خطوط کا اپنا ایک رنگ ضرور تھا لیکن محدود۔ ہو سکتا ہے کہ ان خطوط نے اس گروہ کو متاثر کیا ہو لیکن سچ یہ ہے کہ اس گروہ کا اپنا ایک مزاح و مذاق تھا، ایک الگ ماحول تھا جو لکھنؤ کی تہذیبی و معاشرتی فضا سے پیدا ہوا تھا جس کی بھرپور نمائندگی سرشار کر رہے تھے۔ سرشار کے ناول پڑھتے جائیے قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ ہنسی کا ایک لازوال خزانہ امڈ پڑ رہا ہے۔ سرشار ہنساتے بھی ہیں اور کبھی کبھی دوسروں کو ہنسانے کے لیے خود بھی ہنسنے لگتے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی تمام کیفیات کا بغور مطالعہ کیا، متضاد چیزیں دیکھیں اور اپنے عمیق مطالعے سے ہر چیز کو اپنے ناولوں میں جذب کرتے چلے گئے۔ وہ اپنے عہد کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ کبھی مشاعروں کا دلچسپ منظر پیش کرتے ہیں۔ کبھی بازاروں میں ٹہلاتے ہیں۔ وہ ہر اس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں جو جھوٹی شان پر جیتی رہتی ہے۔ نتیجے کے طور پر سارا لکھنؤ ان کے قہقہوں کے دائرے میں سمٹ آتا ہے۔ بقول لطیف حسین ادیب:

''سرشار کے مزاح میں تمام لکھنؤ کا کارٹون بنایا گیا ہے۔ ایک ایسا لکھنؤ جو صورت سے زیادہ غازے کا شیدائی تھا۔ جو عمل کے بجائے تصورات کی دنیا میں مٹر گشتی کر رہا تھا۔ ایک ایسا لکھنؤ جو چنڈو کی رنگالی سے پٹتا رہا لیکن پھر وار نہ کر سکا جس نے قرولی کی ہمیشہ جستجو کی لیکن قرولی میان کے باہر کبھی نہ آسکی۔''

سرشار اپنے ان ناولوں میں کیسے کیسے تضادات پیش کرتے ہیں لیکن بقول قمر رئیس کہ اس تضاد میں ہی ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ کہیں پر بھی ان کا قلم رکتا نہیں۔ پورے جوش و خروش کے ساتھ طنز و مزاح کے بھرپور وار کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، لیکن اس مذاق کے پیرائے میں انھوں نے لکھنؤ کی سماجی زندگی کی ایسی دھجیاں اڑائی ہیں کہ اس کا اثر ذہنی مسرت اور دیرپا شگفتگی سے عبارت ہے۔

نذیر احمد کے ناول عام ہوئے تو اصغری، نصوح، کلیم، ظاہر دار بیگ وغیرہ کی دھوم مچ گئی اور یہ حقیقت ہے کہ نذیر احمد نے ان کرداروں کو سجانے اور ان کو اچھے ڈھنگ سے پیش کرنے میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔ ظاہر دار بیگ کا کردار ناول میں چند لمحوں کے لیے آتا ہے، لیکن نذیر احمد نے اس کو اس انداز سے پیش کیا کہ وہ ان کے اچھے کرداروں میں گنا جانے لگا۔ سرشار کردار نگاری میں ایک منزل اور آگے بڑھ گئے ہیں۔

کردار نگاری کے معاملے میں جو شہرت آزاد، خوجی اور مہراج بلی کو ملی وہ نذیر احمد کے کرداروں کو بھی نہ مل سکی۔ خوجی کا کردار تو لازوال ہو گیا اور اردو ادب کے معدودے چند کرداروں میں شامل ہو گیا اور بقول احسن فاروقی ''وہ ایک معجزہ ہے۔ اردو میں کردار نگاری کا پہلا معجزہ اور شاید اب تک کا سب سے بڑا معجزہ۔'' خوجی کے کردار کی روشنی میں لکھنؤ کے بکھرے ہوئے معیار کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ سرشار نے دوسرے مزاحیہ کرداروں کو بھی بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے، لیکن خوجی والی بات وہ کسی میں نہ پیدا کر سکے۔ ان کرداروں کی بے فکری، مزاحیہ حرکتیں اس وقت کے کھوکھلے سماج، کھوکھلی تہذیب اور جھوٹی شان و شوکت کی طرف غمازی کرتے ہیں۔ بقول احتشام حسین:

''سرشار کا کمال یہی ہے کہ ان کرداروں کے ذریعے سے انھوں نے روایت اور تغیر، قدیم اور جدید، بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں، تعلیمی مسئلوں، مذہبی اور سماجی اداروں، رسموں، رہن سہن کے طریقوں کے راز فاش کیے ہیں۔''

یہاں پر چونکہ سرشار کے فن کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود

سرشار نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ادب کا اور زندگی کا نقطۂ نظر رفتہ رفتہ دُھند سے نکل کر صاف مقام پر آرہا تھا۔ سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد کی تخلیقات منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ انگریزی ناول نگاروں میں ڈکنس، تھیکرے وغیرہ کے ناول سرشار پڑھ چکے تھے۔ ایک طرف ان کا مطالعہ، دوسری طرف لکھنؤ کا مشاہدہ دونوں نے مل کر سرشار کو ایک ایسا فسانہ لکھنے پر مجبور کردیا جو بعض نقادوں کے خیال کے مطابق داستان اور ناول کے بیچ ہو کر رہ گیا۔

نہیں صرف ان کا سرسری تذکرہ کر کے اس بات پر غور کرنا ہے کہ انھوں نے وقت اور ماحول سے کس طرح متاثر ہو کر صنفِ ناول اور اس کے فنی لوازمات کو کس انداز سے جلا بخشی اور کن کن موضوعات کا اپنی ذات سے اضافہ کیا۔ ادب اور ناول کو کس راہ پر لا کر چھوڑا کہ ان کے بعد لکھنے والوں نے کس طرح کا افسانوی ادب پایا۔

سرشار کے یہاں اس میں شک نہیں کہ کرداروں کی بھیڑ نذیر احمد سے زیادہ ہے لیکن نذیر احمد کے کرداروں کی ایک خوبی یہ نظر آتی ہے کہ ان کے تمام کردار تھوڑی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اصغری کے کردار کے ساتھ اکبری کاہل، فاضل ماما عظمت کے کرداروں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ سرشار اپنی پوری ناول نگاری میں صرف دو تین کردار ہی زندہ کر سکے لیکن وہ دو تین کردار نذیر احمد کے کرداروں سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ 'فسانۂ آزاد' میں آزاد اور خوجی کا کردار 'سیر کہسار' میں مہاراج بلی 'جامِ سرشار' میں روشن اور تراب علی کے علاوہ دوسرے کرداروں کے نام بھی ذہن میں نہیں رہ جاتے، لیکن ان چند کرداروں کے ذریعے سرشار نے لکھنؤ کے بانکپن، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، بے فکری کا غیر معمولی اظہار کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ اپنے ان کرداروں کے ذریعے وہ بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرشار کے نسوانی کردار نذیر احمد کے مقابلے کمزور ہیں۔ ان کے یہاں اگر چہ اللہ رکھی، قمرن، ظہورن جیسے کامیاب کردار ہیں لیکن وہ اصغری، فہمیدہ، حسن آرا، محمودہ جیسے کرداروں کے مقابلے ٹھہر نہیں پاتے لیکن اس سے ملتی جلتی دو ایک باتوں کے سلسلے میں نذیر احمد اور سرشار کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نذیر احمد نے جس انداز سے نسوانی کرداروں کو پیش کیا وہ بالکل منفرد ہے۔ ان کے تمام ناول زیادہ تر عورتوں کی اصلاح پر لکھے گئے ہیں۔ ان کے ہر ناول میں عورت ایک پاکیزہ، مہذب اور پردہ نشین ہے۔ وہ ایک شوہر کے حامی ہیں۔ تعلیم کے ضرور قائل ہیں لیکن حد کے اندر۔ بے پردگی بھی ان کو پسند نہیں۔ لیکن سرشار اس معاملے میں نذیر احمد کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے نسوانی کردار بازاروں میں گھومتے ہیں اور عشق کرتے پھرتے ہیں۔ عشق و محبت سے متعلق دلچسپ فقرے چست کرتے ہیں۔ یہ بے باکی اور بے حجابی سرشار کو نذیر احمد سے بہت الگ کر دیتی ہے اور شاید اسی وجہ سے بشن نرائن در نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سرشار کے ناول اس قابل نہیں کہ شریف لڑکوں کو پڑھائے جاسکیں، جس کا تفصیلی جواب علی عباس حسینی نے اپنی کتاب 'ناول کی تاریخ و تنقید' میں دیا۔ بہر حال سرشار نے جس انداز سے عشق و محبت کی داستان اپنے فسانہ میں پیش کی ہے وہ قدامت سے بغاوت کرتی ہے۔ سرور کا عشق اندھا تھا، وہ 'فسانۂ عجائب' میں جانِ عالم اور انجمن آرا کا عشق بالکل اندھے پن کے ساتھ پیش کرتے ہیں، لیکن وہ داستان ہے۔ سرشار سرور کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بعض معاملات میں اپنے استاد کا چربہ اتارا لیکن عشق کے معاملات میں وہ بغاوت کر گئے۔ ان کا عشق داستانی نہیں ہے بلکہ اس میں حقیقی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ داستان میں ثریا جیسا کردار موت کے منھ کا نوالہ بن جاتا ہے، لیکن سرشار نے عشق و محبت میں جو معاشرتی عناصر دیکھے ان کو نظر انداز نہ کر سکے۔ حسن آرا اندھی محبت نہیں کرتی بلکہ دوسری عورت کی طرح اس کی بھی خواہش ہے کہ اس کا شوہر سماج میں نام پیدا کر سکے۔ اسی طرح ثریا نے اپنی محبت میں ناکامی کے بعد اپنے آپ کو موت کے حوالے نہیں کیا بلکہ حالات کا مقابلہ کیا۔ وقت کے تقاضے کو گلے سے لگایا۔ ان معاملات میں سرشار کردار نگاری میں حقیقت نگاری کرتے ہیں اور عشق کا حقیقی و مادّی تصور پیش کرتے ہیں، جبکہ نذیر احمد کے ناولوں میں عشق کا قحط ہے۔ برائے نام ہی کسی

آج ناول کا کیا مطالبہ ہے اور وہ قبولیت کے کس اسٹیج پر ہے ہم واقف ہیں، لیکن ہم ان مطالبو ںکی روشنی میں گزشتہ ناولو ںکو پرکھیں گے تو ان کی ساری چمک دمک پھیکی لگنے لگے گی۔ لہٰذا تنقید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نذیر احمد ہوں یا سرشار یا شرر آج کی تیز اور دھار دار تنقید کے جارحانہ حملوں سے انہیں زخمی نہ کریں بلکہ اس عہد کے پیمانے پر پرکھیں تو ان کے ساتھ انصاف ہوگا اور جب ان حضرات کے پرکھنے کا یہ معیار ہی ہمارے ذہن میں سما جائے گا تب خودبخود ان فنکاروں کی خدمات ہمارے ذہن میں واضح ہو جائے گی اور ہم ان کے بارے میں کوئی صحیح اور مناسب رائے قائم کرسکیں گے۔

ناول میں عشق کی لہر دکھائی دیتی ہے ورنہ اس نقطۂ نظر سے ان کے سارے ناول سوکھے اور بنجر ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرشار نے مجموعی طور پر ناول نگاری کو کیا دیا۔ سرشار انگریزی کے مطالعے سے صنفِ ناول کی ہیئت اور اس کی قدر و قیمت اور افادیت سے واقف ہو چکے تھے۔ سرشار نے یقیناً اپنے طور پر ناول ہی لکھے، لیکن کہیں کہیں وہ لاشعور اور غیر ارادی انداز میں ناول کی حدوں سے آگے نکل گئے۔ وہ لکھنؤ کی بھیڑ بھاڑ اور سرور کی زبان کے جادو میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنے آپ ان کو ناول نگاری سے دور لے جاتی ہے۔ ناول میں یقیناً زندگی کو پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ مصوری کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے بازاروں، گلی کوچوں، محفلوں، طوائف کے کوٹھوں یا اسی طرح کے دوسرے مناظر کو دلکش پیرایے میں تذکرہ کرنا ہی ناول کا فن سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے اس کو زندگی کے قریب تو کیا لیکن وہ اپنا خیال، اپنا فلسفہ اپنی تعبیر نہ پیش کر سکے۔ انھوں نے ناولوں کو دلچسپی کا مرکز بنا دینا ہی اپنا مقصد سمجھا، جبکہ صرف انھیں تذکروں کو ناول نہیں کہتے بلکہ ناول کے فن کے کچھ اور تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ فنکار کا مشاہدہ اور مطالعہ تو ہونا لازمی ہے، ساتھ ہی ساتھ ایک مقصد ایک نظریہ اور ایک فلسفہ بھی ہونا ضروری ہے۔ تبھی تو ڈی ایچ لارنس نے کہا تھا کہ فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن نہیں ہوتا۔ سرشار ایسا نہیں کر پاتے۔ بقول قمر رئیس:

''وہ مداری کی طرح زندگی کا تماشا دکھانے کو ناول کا فن سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ علم نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ ناول زندگی کی مصوری ہی نہیں اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تعمیر بھی ہے اور یہ کہ ناول کا تخلیقی عمل قارئین کے مذاق، پاس و لحاظ سے کہیں زیادہ عصری زندگی کے حقائق اور فن کے گہرے شعور کا مطالبہ کرتا ہے۔''

ناول جس قدر مقبول صنف ہوتی گئی اس کے مطالبے بڑھتے گئے۔ آج ناول کا کیا مطالبہ ہے اور وہ قبولیت کے کس اسٹیج پر ہے، ہم واقف ہیں، لیکن ہم ان مطالبوں کی روشنی میں گزشتہ ناولوں کو پرکھیں گے تو ان کی ساری چمک دمک پھیکی لگنے لگے گی۔ لہٰذا تنقید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نذیر احمد ہوں یا سرشار یا شرر آج کی تیز اور دھار دار تنقید کے جارحانہ حملوں سے انھیں زخمی نہ کریں بلکہ اس عہد کے پیمانے پر پرکھیں تو ان کے ساتھ انصاف ہوگا اور جب ان حضرات کے پرکھنے کا یہ معیار ہی ہمارے ذہن میں سما جائے گا تب خود بخود ان فنکاروں کی خدمات ہمارے ذہن میں واضح ہو جائے گی اور ہم ان کے بارے میں کوئی صحیح اور مناسب رائے قائم کر سکیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ سرشار نے نذیر احمد سے بالکل الگ موضوع لے کر اپنی تخلیقات کے ذریعے صنف ناول کی نشوونما میں اہم اضافے کیے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے تمام ناول ایک ہی مرکز پر ٹھہرے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے ناولوں میں جو اہمیت 'فسانۂ آزاد' اور اس کے بعد 'جامِ سرشار'، 'سیر کہسار' کو ملی وہ دوسروں کو نہ مل سکی اور اس سلسلے میں تمام ناقدین میں یہ بحث چلتی رہی کہ سرشار کے تمام ناول فن ناول نگاری کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں، لیکن اتنی بات تو سچ ہے بقول احسن فاروقی:

''ناول کا سچا ذوق حاصل کرنے کے لیے اور سچے مذاق کے ناول لکھنے کے لیے پہلے سرشار کے پیر چھو لینا ضروری ہے۔''

Prof. Ali Ahmad Fatmi, Dept. of Urdu, Allahabad University, Allahabad (UP)

فرزانہ نسیم

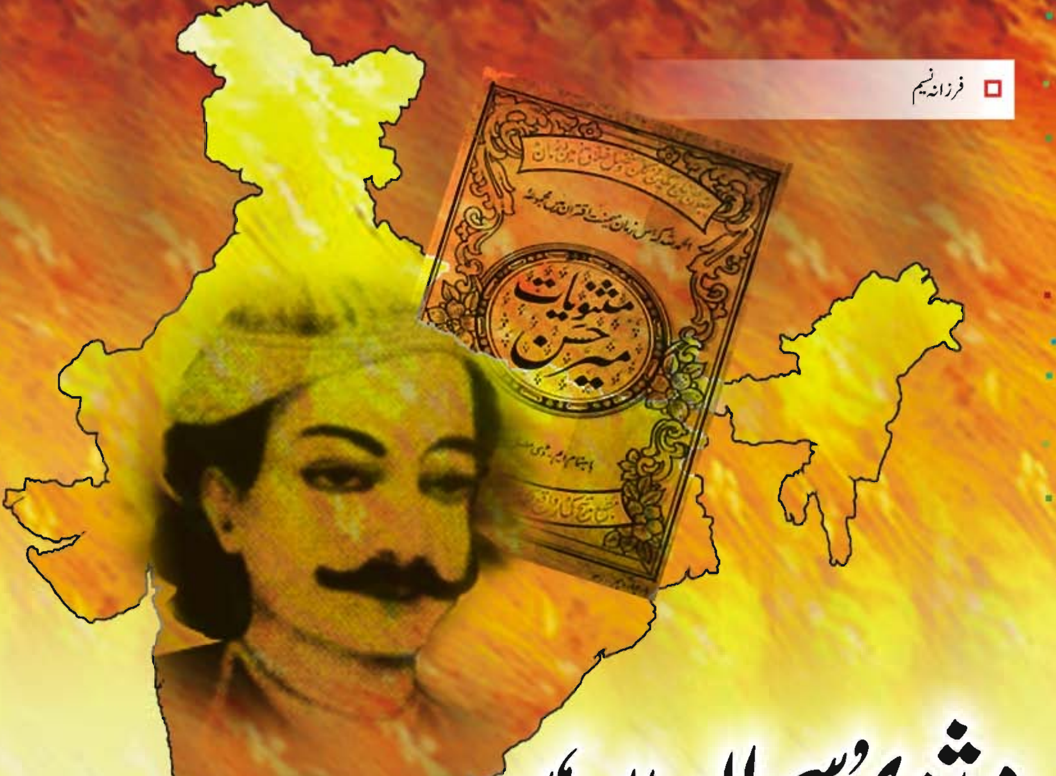

مثنوی 'سحر البیان' اور ہندوستانی معاشرت

مولانا حالی نے کہا ہے کہ اردو کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ کارآمد صنف مثنوی ہے۔ مثنوی میں ڈرامائیت، مرقعہ نگاری، طربیہ شاعری کی شگفتگی اور حزیں شاعری کی اثر آفرینی کی گنجائش موجود ہیں۔ یوں تو اس صنف کو جنوبی ہند میں ہی کافی فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن فن اور اسلوبِ بیان کی معراج اسے میر حسن نے بخشی۔ انھوں نے منظوم داستان کے اجزائے ترکیبی کو تشکیل دے کر شمالی ہند میں پہلی بار ایک وسیع تناظر میں مثنوی لکھی۔ اس قسم کے تخلیقی کام کے لیے بہتر جگہ لکھنؤ تھی۔ دلی کا زوال یافتہ ماحول معاشی تہذیبی بدحالی کا شکار تھا مگر لکھنؤ کا معاشی اور تہذیبی ماحول اس کام کے لیے بہترین فضا کا درجہ رکھتا تھا۔ میر حسن نے یوں تو کئی مثنویاں لکھیں لیکن ان کا بہترین کارنامہ سحر البیان ہے۔ جو میر حسن کی آخری تصنیف ہے میر شیر علی افسوس اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''مثنوی سحر البیان اسمِ بامسمیٰ ہے اس کا ہر شعر اہلِ مذاق کے دلوں کو لبھانے کو موہنی منتر ہے...'' اس مثنوی میں تمام فنی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔ واقعہ نگاری بھی ہے اور منظر کشی بھی، تہذیب و معاشرت کی سچی تصویریں بھی ہیں اور آدابِ زندگی بھی۔ مربوط خیالات ہیں اور واقعات میں تسلسل اور روانی نے کہانی کی سادگی کو نہایت اثر انگیز بنا دیا ہے۔ میر حسن خود کہتے ہیں:

ذرا منصفو داد کی ہے یہ جا
کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا
زبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیاں
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام

سحر البیان ایک بزمیہ داستان ہے۔ اس کی ہر داستان دوسری داستان سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ قصے کے تمام اجزا و عناصر منظم ہیں۔ میر حسن نے دل کش مناظر اور نظر فریب تصویروں کے ساتھ ساتھ واقعات و حادثات، ان کے اثرات اور جذبات کی مختلف کیفیات کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند 'مثنوی سحر البیان' کو جتنی مرتبہ بھی پڑھا جائے، ہر بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس کا لکھنے والا غیر معمولی فن کار تھا اُس کا مشاہدہ اُن جزئیات کو دیکھتا تھا جہاں عام نظریں نہیں پہنچتیں۔''

سحر البیان میں انسانی جذبات مثلاً خوشی، غم، ناامیدی، غصہ، محبت، نفرت وغیرہ کی نادر اور دلکش تصویریں ہیں۔ ساتھ ہی مناظر قدرت کے پس منظر میں انسانی جذبات سے جو وجد آفریں کیفیت طاری ہوتی ہے وہ سماں باندھنے کے ساتھ ساتھ مسرت اور بصیرت کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔

بادشاہ کا اولاد سے محروم ہونا، نجومیوں اور جیوتشیوں کو بلانا، فال نکلوانا اور بچے کا پیدا ہونا، پری کا اسے اُڑا کر لے جانا، شہزادے کا ایک عورت پر عاشق ہونا اور بالآخر اپنے ملک واپس آنا یہی کہانی ہے جو بالعموم تمام قدیم مثنویوں میں موجود ہیں۔

لیکن میر حسن کا فنی کمال یہ ہے کہ انھوں نے معاشرے میں مقبول داستانوں کے مختلف اجزا کو لے کر نہایت ہنرمندی سے ایک قصہ ترتیب دیا۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''کہ سحر البیان پڑھتے ہوئے ہماری توجہ کہیں بھی کہانی کے بہاؤ سے نہیں ہٹتی۔ واقعات کی کڑیاں مسلسل مربوط ہیں اور ہم ہر مقام اور ہر مرحلے پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگلے مرحلے پر کوئی نہ کوئی اہم بات وقوع پذیر ہونے والی ہے۔''

مثنوی کے آداب و تہذیب میں وہ ماحول موجود ہے جس میں خود میر حسن سانس لے رہے تھے۔ اُس تہذیب کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویریں یہاں نظر آتی ہیں۔ اُن کے

رسم و رواج، عقائد اور شادیوں نیز تہواروں کی دھوم دھام اِس عہد کے لکھنؤ کی چلتی پھرتی تصویریں اس مثنوی میں دکھائی دیتی ہیں۔ میر حسن کی زبان کی سلاست اور سادگی کو دیکھ کر مولوی محمد حسین آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ''کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جواب ہم تم بول رہے ہیں۔'' عیش و نشاط کی محفلیں میلے ٹھیلے، شاہی جلوس۔ رقص و سرود کی رنگارنگی، لوگوں کے آدابِ زندگی، عادت، خصائل ہر چیز یہاں پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوگئی ہے۔ جہاں خوش حال انسان زندگی کی مسرتوں، راحتوں اور لذتوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک رقص کی محفل کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے محفل کا سماں بندھ جاتا ہے:

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے
وہ پاؤں کے گھنگرو چھنکتے ہوئے
وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ
دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ
وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں
پھڑکنا وہ نتھنے کا ہر آن میں

اسی طرح میر حسن نے زندگی کے جس پہلو کو بیان کیا ہے۔ اُس میں اُس تہذیب کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ لوگوں کے ذہنی میلانات، تہذیبی نفاستیں، حسن پرستی، ذوقِ جمال، سب کی تصویر کشی اس مثنوی میں نظر آتی ہے۔ لکھنوی تہذیب میں نفاست پسندی، تکلف اور تصنع حتیٰ کہ نام رکھنے میں ایک ندرت اور اچھوتا پن تھا۔ میر حسن نے اس تہذیبی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا:

کنیزانِ مہ رو کی ہر طرف ریل
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
شگوفہ کوئی، اور کوئی کام روپ
کوئی چیت لگن اور کوئی شیام روپ
کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی مہ رتن اور کوئی ماہتاب
کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی
کوئی دِل مگن اور تن سکھ کوئی
اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن میں اتراتیاں

یعنی اس معاشرے میں کنیزوں اور عورتوں کے نام پھولوں کے ناموں پر رکھے جاتے تھے جس سے اس عہد کی حسن پسندی، نفاست اور ذوق جمال کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے ہی اس دور میں لوگوں کو جنوں و پریوں کی کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔ نجومیوں اور رمالوں کو ہاتھ دکھانا اُن سے فال لینا بھی عام رسم تھی۔ بلکہ ان باتوں پر لوگوں کو اعتقاد اور یقین ہوتا تھا۔ میر حسن نے اس تہذیبی پہلو کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

عام دلچسپی کے لیے جنوں اور پریوں کے واقعات بھی موجود ہیں۔ لیکن میر حسن نے ان کو بھی انسانی عادات وخصائل کا حاصل بنا دیا ہے۔ اگرچہ جن اور پریاں دوسری مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کی فطرت انسان کی سی ہے۔ ان کی خواہشات آرزوئیں سب انسانی ہیں۔ اسی طرح شہزادے کا ماہ رخ پری کے یہاں پہنچ کر بھی اس کے حسن و جمال کی طرف آنکھ نہ اٹھا کر دیکھنا میر حسن کی فطرت شناسی اور فنکاری کی دلیل ہے۔ کیونکہ وہ کسی غیر مخلوق سے محبت نہیں کرسکتا تھا لیکن جب شہزادی بدر منیر کو دیکھتا ہے تو دل و جان سے فدا ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی میر حسن نے انسانی فطرت اور اس کے جذبات کا خیال رکھا ہے:

میر حسن نے مافوق الفطرت عناصر سے اور بھی بڑا کام لیا ھے۔ ان کی کھانی کا ارتقا ان ھی عناصر کے ذریعے ھوتا ھے۔ اگر ان غیر فطری واقعات کو نکال دیں تو اس کھانی کی کڑیاں منتشر ھوجاتی ھیں۔ ان ھی کے سھارے یہ کھانی آگے بڑھتی اور چلتی ھے۔ میر حسن کی صناعی یھی ھے کہ انھوں نے ان عناصر کو مکمل انسانیت کے رنگ میں رنگ دیا ھے۔ اور اُس عھد کے عقائد و رسومات سے بالکل قریب کرکے حقیقت سے ملا دیا ھے۔

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے
بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
مُنھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے
لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے

میر حسن نے انسانوں اور پریوں کو باہم ملا دیا ہے۔ ان کے جذبات اور احساسات میں کوئی فرق نہیں۔ پری ماہ رخ کا کردار انسانی کردار ہے کیونکہ شہزادے کو گھوڑا دیتے وقت وہ اس سے یہی کہتی ہے کہ کسی آدم زاد سے دل نہ لگانا:

یہ گھوڑا میں دیتی ہوں کل کا تجھے
ولیکن، یہ دے تو مُچلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جاوے کہیں
دیا، دل کسی سے لگادے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنہ گار کا
وہی حال ہو تجھ سے دل دار کا

پری ماہ رُخ کا یہ ڈر اور خدشہ اس کے انسانی جذبہ کا مظہر ہے۔ دراصل اودھ کا معاشرہ جنسی بے چینی کا شکار تھا۔ جس کی تسکین کے لیے عورتوں کا میسّر نہ آنا بڑی رکاوٹ تھی۔ اگرچہ طوائف ماحول پر چھائی ہوئی تھی پھر بھی اس نہ ملنے والی عورت کو پریوں کے بیان سے پیدا کر کے محظوظ ہوتے تھے اور اس طرح ان کی تعیش پسندی کو سکون و آرام ملتا تھا۔ چنانچہ اسی مثنوی میں اس تہذیبی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے

میر حسن نے مافوق الفطرت عناصر سے اور بھی بڑا کام لیا ہے۔ ان کی کہانی کا ارتقا ان ہی عناصر کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگر ان غیر فطری واقعات کو نکال دیں تو اس کہانی کی کڑیاں منتشر ہوجاتی ہیں۔ ان ہی کے سہارے یہ کہانی آگے بڑھتی اور چلتی ہے۔ میر حسن کی صناعی یہی ہے کہ انھوں نے ان عناصر کو مکمل انسانیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور اُس عہد کے عقائد و رسومات سے بالکل قریب کر کے حقیقت سے ملا دیا ہے۔ ان میں بھی انسانی جذبات مثلاً حسد، محبت، رشک اور انسانی ہمدردی پیدا کردی۔ میر حسن نے پرستان کو بھی انسانوں کا ملک بنا دیا ہے۔

ماہ رخ پری ایک انسان سے محبت کرنے کے باوجود اپنے باپ سے ڈرتی ہے۔ اُسے اپنی بدنامی اور عزت کا احساس ہے۔ اِن کے بیان میں یہ انسانیت اس لیے آئی ہے کہ وہ اس کہانی کو اپنی معاشرت اور ماحول کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ ایسے اور واقعات بھی ملیں گے جہاں جنوں اور پریوں کے جذبات اور احساسات انسانوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں:

غرض ماہ رُخ اُس پری کا تھا نام
پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام
کبھی گھر میں رہتی، کبھی رہتی واں
کہ، تا راز اُس کا نہ ہووے عیاں
وہ پریوں میں از بس کہ تھی ذی شعور
نئی چیز لاتی تھی اُس کے حُضور
عجائب غرائب پرستان کے
دکھاتی تھی ہر شب اُسے آن کے

لکھنوی تہذیب و معاشرت اور اُس دور کی زندگی کو دربارداری سے جو گہرا تعلق تھا، اس کو بھی میر حسن نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس تہذیبی پہلو کی تصویریں آدابِ دربار اور درباروں میں اپنے اپنے مراتب کے مطابق انعام و اکرام پانا سب کچھ انھوں نے بیان کیا ہے۔ امیروں، وزیروں اور دوسرے لوگوں کا دربار میں پہنچنا مبارک باد دینا انعام دینا وغیرہ۔ شہزادے کے پیدا ہونے کی خوشی کا اظہار شاہی دربار میں اس طرح ہوتا ہے:

چلے لے کے نذریں امیر و وزیر
لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر
دیے شاہ نے شاہ زادے کے ناؤں
مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر، لشکر کو زر
وزیروں کو الماس ولعل و گہر
خواصوں کو،خوجوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیے

واقعہ نگاری اور ماحول کی تصویر کشی اس مثنوی کی جان ہے۔ اس میں لکھنوی تہذیب وزندگی کی پوری حرکت نظر آتی ہے۔ کردار نگاری کی طرف عموماً میر حسن سے پہلے مثنوی نگاروں نے بہت کم توجہ دی ہے۔ مگر اس مثنوی میں کردار نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کردار نگاری کی کوئی خامی نہیں ہے البتہ اس کے کردار واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

بالخصوص نجم النساء کا کردار بہت جاندار ہے۔ اس کا کردار سب سے بلند اور منفرد ہے وہ تیز طرار عورت ہے۔ لیکن اپنی دوست سے محبت اور خلوص بھی رکھتی ہے۔ جدوجہد بھی کرتی ہے۔ مصیبتوں میں بھی اپنے آپ کو ڈال دیتی ہے۔ بے پایاں خلوص کی بنا پر آفتوں سے بھی دوچار ہوتی ہے۔ اسے موسیقی کے فن میں بھی کمال حاصل ہے۔

یہ دراصل اس عہد کے لکھنؤ کی وہ ایک تیز طرار عورت ہے جو گانے اور موسیقی میں مہارت رکھتی ہے۔ کردار نگاری کے ساتھ ساتھ بعض جگہ جذباتی اور نفسیاتی پہلو بھی اجاگر ہیں۔ غرض یہ سب اس تہذیب کی مکمل تصاویر ہیں۔ اس میں انسانوں کی تمنائیں اور خواہشیں ہیں۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی آرزوئیں ہیں۔ یہ سارے اثرات لکھنوی تہذیب و ماحول کے ہیں۔

میر حسن کے فن میں اس قدر وسعت کے باوجود کہیں ابتذال نہیں پیدا ہوا ایک آدھ موقع پر جہاں عریانی کا کچھ احساس ہوتا ہے وہ وہاں ناگزیر اور ضروری ہے۔ میر حسن دراصل دہلوی روایات سے تعلق رکھتے تھے۔ وہی رچاؤ ان کے مزاج اور شخصیت میں تھا۔ جس میں لکھنوی فضا نے رنگینی پیدا کردی تھی اور اس طرح دہلی اور لکھنوی روایات کے باہمی امتزاج کی بنا پر وہ نشاط والم کی ایک حسین اور رنگارنگ تصویر بنانے میں کامیاب ہوگئے اور وہ عریانیت وسوقیانہ پن دونوں سے بچ نکلے اور ایک جداگانہ انداز اختیار کرکے اپنے فن کو لازوال بنادیا۔

میر حسن لکھنوی خارجیت کے باوجود دہلوی داخلیت سے روشناس تھے۔ اس لیے انھوں نے سحر البیان میں جہاں نشاط و مسرت کے مواقع کی تصویر کشی کی ہے وہاں غم والم کے جذبات کی بھی حقیقی اور واقعی تصویریں پیش کی ہیں، بلکہ غم کی حالت میں نفسیاتی اور احساساتی اعتبار سے جو حالتیں ہوتی ہیں اس مثنوی میں ان کو بھی ظاہر کردیا گیا ہے مثلاً شہزادی بدر منیر کے دردوغم کی تصویر کتنی حقیقی اور فطری ہے کہ محبوب کی جدائی کی کسک سے دل پر جو گزرتی ہے اُسے دل ہی جانتا ہے:

دِوانی سی ہر طرف پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب

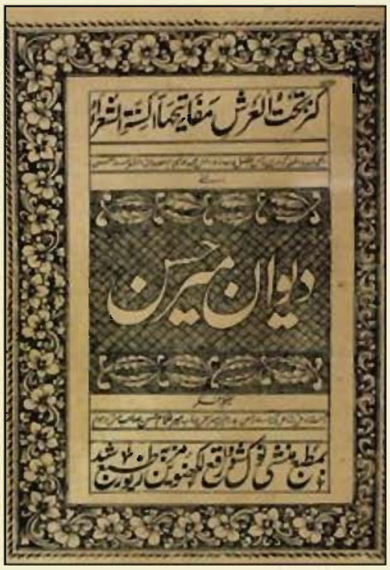

لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے رونے لگی
تپ غم کی شدت سے پھر کانپ کانپ
اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
کہا گر کسی نے کہ بی بی، چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کے،ہاں جی، چلو
کسی نے جو کچھ بات کی،بات کی
اگر دن کی پوچھی،کہی رات کی

کسی محبت کے مارے کی اس سے بہتر تصویر اور کیا ہوسکتی ہے۔ دراصل لکھنوی فضا میں فن کے خارجی پہلوؤں کی آرائش وزیبائش میں بہت توجہ صرف کی جاتی تھی۔ مگر داخلی اور وجدانی کیفیتوں کو بہت ہی کم مدنظر رکھا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس مثنوی میں ہندوستانی معاشرت پورے طور پر اجاگر ہے کہ کس طرح ہمارے ہندوستان میں بے کار اور فضول رسم و رواج میں لوگوں نے اپنے قیمتی وقت کو برباد کیا ہے اور کرتے ہیں۔ اپنی دولت ایسے فضول کاموں میں صرف کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں، تمام رسم و رواج کو ضروری قرار دے کر سماج کے اصول بنا لیے ہیں۔ جس طرح شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے بیاہ میں بڑی دھوم دھام ہوئی۔ اس کو میر حسن نے بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ سحر البیان کا ہر موضوع ساقی نامہ سے شروع ہوتا ہے۔

کدھر ہے تو اے ساقی گل بدن
دھری آج اس شمع لو کی لگن
بلا مُطربانِ خوش آواز کو
کہ آویں لیے اپنے سب ساز کو
وہ اسباب شادی کا تیار ہو
مکرر نہ پھر جس کی تکرار ہو
بڑی خوشی سے جب آیا وہ روز
چڑھا بیاہنے وہ مہہِ شب فراز

شہزادہ گھوڑے پر سوار ہوا تو چاروں طرف شادیانے بجنے لگے۔ کوئی ہاتھی پر سوار ہوا اگر کسی کو کچھ نہ ملا تو بیل گاڑی پر سوار ہوئے شہنائیوں اور طبلوں کے غُل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ آگے آگے فانوس جارہا تھا۔ اتنا چراغاں تھا کہ اسے دیکھ کر لوگ بے اختیار نوری کے دیوان سے اشعار پڑھنے لگے۔ سودے والوں نے اپنے سودے بیچنے شروع کردیے۔ آتش بازی داغی جانے لگی جب بارات اس اہتمام کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچی تو باراتیوں کے لیے بادلوں کے خیمے تیار تھے۔ بیچ میں مسند بچھا ہوا تھا۔ باراتیوں نے خوشی خوشی گیت گائے۔ دولہا مسند پر بیٹھا تھا، اس کے ساتھ اس کے رفیق بیٹھے تھے۔ طوائفوں نے ناچ گانے شروع کیے۔ کچھ طوائفیں اپنا کمال دکھارہی تھیں اور کچھ اپنے جمال کا نظارہ کرا رہی تھیں۔ باہر تو یہ محفل رقصاں تھی اور اندر سمدھنوں کو شادی کی مبارکباد دی جارہی تھی اور ہنس ہنس کر پھولوں کے ہار پہنائے جارہے تھے۔ چٹاچٹ پھولوں کی چھڑیاں ماری جارہی تھیں اور سمدھنیں اٹھلا اٹھلا کر اپنا حسن دکھارہی تھیں اور خوش ہوہو کر گالیاں کھارہی تھیں۔

ہندوستانی معاشرت کی عکاسی اس سے بہتر طریقے پر اور کیا نمایاں ہوسکتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر عام طور پر یہی رسم و رواج ہندوستان اور خاص کر لکھنوی ماحول کے لیے ضروری ہیں۔ اتنی دھوم دھام نہ کرنے والوں کو معاشرہ و ماحول کا ڈر رہتا ہے کیونکہ یہ سب ان کی تہذیب ان کے سماج کے لیے لازمی ہیں۔ مثنوی سحر البیان ہندوستان کے تہذیبی، تمدنی، سماجی و معاشرتی غرض ہر پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص با آسانی ہندوستانی معاشرت کا تصور کرسکتا ہے۔

■

Dr Farzana Nasim, House no. 1615, Sector -26, PANCHKULA-134116 , HARYANA

شمیم احمد صدیقی

اردو میں تخلص کی روایت

اردو والے لفظ تخلص کو برسوں سے سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں اور بخوبی واقف ہیں کہ 'تخلص' وہ قلمی یا مخصوص نام ہوتا ہے جس کو کوئی شاعر اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اُس کے سامع یا قاری اس شاعر کو اُسی عرفیت سے جانیں اور پکاریں۔

اہلِ علم کا ماننا ہے کہ لفظ تخلص عربی کے لفظ استخلصَ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو چن لینا یا حاصل کرلینا۔ تخلص اختیار کرنے کی روایت ترکی، فارسی، اُردو اور ہندی زبانوں کے شعرا میں رائج ہے۔ اُردو شعرا نے تخلص اختیار کرنے میں مختلف طریقوں کو اپنایا ہے۔ بہت سے شعرا نے اپنے نام کے ایک حصّے کو ہی بطور تخلص اپنا لیا مثلاً دہلی کے حکیم مومن خاں نے مومن، سیالکوٹ کے علاّمہ محمد اقبال نے اقبال اور نگ آباد کے شاہ حسین نہری نے شاہ، بنارس کے سراج العارفین نے سراج اور فیض احمد فیض نے فیض کو بطور تخلص اختیار کیا۔ اُن میں سے بعض نے اپنے تشخص کی وضاحت کے لیے تخلص کے ساتھ اپنے مقام کے نام کو بھی شامل کرلیا۔ مثلاً تلہر کے سید اختر علی نے اختر تلہری، شاہجہانپور کے اختر علی خاں نے اختر شاہجہانپوری، الہ آباد کے محمد اکبر نے اکبر الہ آبادی، بھوپال کے محمد عبدالباسط نے باسط بھوپالی، میرٹھ کے حفیظ الرحمن نے حفیظ میرٹھی، فیض آباد کے خلیق الرحمن خاں نے خلیق فیض آبادی جیسے تخلص سے، جس میں نام کے ایک حصّے کے ساتھ مقام کا نام بھی شامل ہے، اپنی شناخت کرائی لیکن بعض دیگر شعرا نے اپنے تخلص کے ساتھ جائے پیدائش یا جائے سکونت کو شامل کرنے کے بجائے اپنے اسی نام کے دوسرے ٹکڑے کو یا تیسرے ٹکڑے کو بھی جوڑنا مناسب سمجھا مثلاً خیرآباد سے تعلق رکھنے والے جاں نثار اختر نے اپنے اس نام سے، فتح پور کے محمد انیس انصاری نے انیس انصاری سے، لکھنؤ کے محمد عمر انصاری نے عمر انصاری سے، لکھنؤ کے نسیم اختر صدیقی، دہلی کی فاطمہ زہرہ نے فاطمہ زہرہ سے اور پاکستانی شاعرہ پروین شاکر نے اپنے اسی نام سے خود کا تعارف کرایا، مقام کے نام کو ساتھ میں جوڑنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ ہمارے بیشتر شعرا نے تخلص کے سلسلہ میں یہ وطیرہ اپنایا کہ انھوں نے اپنے نام کا کوئی بھی ٹکڑا بطور تخلص اختیار نہیں کیا بلکہ ایک بالکل علیحدہ لفظ کو اپنے تخلص کے لیے استعمال کیا اور اس

> بہت سے شعرا نے اپنے نام کے ایک حصّے کو ھی بطور تخلص اپنا لیا مثلاً دھلی کے حکیم مومن خاں نے مومن، سیالکوٹ کے علاّمہ محمد اقبال نے اقبال اور نگ آباد کے شاہ حسین نھری نے شاہ، بنارس کے سراج العارفین نے سراج اور فیض احمد فیض نے فیض کو بطور تخلص اختیار کیا۔ اُن میں سے بعض نے اپنے تشخص کی وضاحت کے لیے تخلص کے ساتھ اپنے مقام کے نام کو بھی شامل کر لیا

کے ساتھ اپنے مقام کے مام کو بھی جوڑا۔ مثلاً لکھنؤ کے جعفر علی خاں نے اثر لکھنوی سے، موہان کے سید فضل الحسن نے حسرت موہانی سے، فرخ آباد کے جیوتی پرساد مصرا نے حیرت فرخ آبادی سے، عظیم آباد یعنی پٹنہ کے سید علی محمد نے شاد عظیم آبادی سے، ملیح آباد کے شبیر حسن خاں نے جوش ملیح آبادی سے، بدایوں کے شوکت علی خاں نے فانی بدایونی سے، لکھنؤ کے مرزا ذاکر حسن نے ثاقب لکھنوی سے، مراد آباد کے علی سکندر نے جگر مرادآبادی سے، بریلی کے شیام موہن سکسینہ نے جگر بریلوی سے، کانپور کے عبدالوکیل انصاری نے جوہر کانپوری سے اور بجنور کے چندر پرکاش نے جوہر بجنوری سے اپنا تعارف کرانا مناسب سمجھا۔ ہمارے بعض شعرا نے خود کو متعارف کرانے کے لیے اپنے نام کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ایک دوسرا لفظ بھی شامل کرلیا اور اپنے مقام کے نام کو ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا مثلاً کاندھلہ کے احسان الحق نے احسان دانش، کانپور کے محمد غلام انور نے انور صابری، کانپور کے سید محمد بشیر نے بشیر بدر، عظیم آباد کے کلیم احمد نے کلیم عاجز، بیکانیر کے محمد عثمان نقشبندی نے عثمان عارف کو بطور تخلص اختیار کیا۔ ان کے علاوہ بعض اُردو شعرا نے تو یہ کمال کیا کہ انھوں نے اپنے تخلص کے لیے نہ تو اپنے نام کا کوئی ٹکڑا استعمال کیا اور نہ ہی مقام کو کوئی اہمیت دی بلکہ دو الفاظ پر مشتمل ایک بالکل نیا نام اختیار کرلیا مثلاً بریلی کے اخلاق محمد خاں نے خود کو شہریار، لکھنؤ کے مزاح گو شاعر رشید الحسن نے خود کو ساغر خیامی، رامپور کے وجاہت حسین نے عندلیب شادانی، کلکتہ کے عبدالغفار انصاری نے معصوم شرقی، کانپور کے حفیظ الرحمن نے نشور واحدی، دہلی کے جمیل احمد نے

نشمس رمزی، کشمیر کے غلام نبی بٹ نے فرید پربتی، ہری پور کے اورنگ زیب خاں نے قتیل شفائی اور شاہجہانپور کے پروفیسر مصاحب علی خاں نے خود کو قمر رئیس جیسے غیر مروجہ تخلص سے متعارف کرایا۔

تخلص کو اپنانے کے سلسلے میں شعرائے کرام کے طور طریقوں کی درجِ بالا تمہید کے بعد اہم سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر اپنے نام کے علاوہ کسی دیگر قلمی نام کو بطور تخلص اپنا کر اپنی شناخت کرانا چاہتا ہے تو اُس کے اِس فعل سے ہم جیسے عام قاری یا سامع کو کیا پریشانی ہے۔ اولاً خاکسار خود کے ساتھ پیش آئے دلچسپ واقعات کو بیان کرتا ہے۔

ہم نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے بارہا یہ بات سُنی تھی اور ایک مرتبہ بھارت سرکار کے پبلی کیشن ڈویزن سے شائع ہونے والے بچوں کے ہندی ماہنامے 'بال بھارتی' میں بھی پڑھا تھا کہ مشہورزمانہ شعر :

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

رام پرشاد بسمل شاہجہانپوری کا ہے لیکن سات آٹھ سال قبل ایک روز ہمارے ایک دوست مسلم شبنم نوری صاحب کے ذریعے جو ایک مقامی پوسٹ گریجویٹ کالج میں فارسی کے استاد رہے ہیں، یہ بات آشکارا ہوئی کہ یہ شعر اصلاً سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کا ہے اور چونکہ رام پرساد بسمل پھانسی دیے جانے سے قبل جیل میں رہتے ہوئے اکثر اس شعر کو گنگنایا کرتے تھے لہٰذا عوام نے غلط فہمی سے اس شعر کو اُن سے منسوب کر دیا تھا۔ میرے ساتھ دوسرا دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ چند سال قبل ایک ماہنامہ میں لکھنؤ کے رام پرکاش بیخود صاحب کی ایک غزل کے درجِ ذیل شعر نے خاصا متاثر کیا :

پہلے پہلے تو ملی مجھ سے ادا و ناز سے
رفتہ رفتہ زندگی اوقات میں آنے لگی

خاکسار نے اُن کو خط لکھ کر مبارکباد دیتے ہوئے اپنا یہ اشکال بھی ظاہر کیا کہ آپ سے قبل بیخود دہلوی، بیخود موہانی اور بیخود بدایونی گزر چکے ہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ آئندہ نسل آپ کے اس شعر کو اُن بزرگوں میں سے کسی سے اسی طرح موسوم کر دے جس طرح بسمل عظیم آبادی کے شعر کو بسمل شاہجہانپوری سے منسوب کر دیا گیا تھا، اس لیے بندہ کی تجویز ہے کہ جس طرح مرزا اسداللہ غالب نے اپنے پرانے تخلص اسد کو ترک کر کے غالب اختیار کیا تھا آپ بھی کوئی دوسرا تخلص اختیار کر لیں لیکن انھوں نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ عمر کے بڑے حصّے میں ہم بیخود تخلص کے ساتھ ملک اور بیرونِ ملک غزلیات پیش کرتے رہے ہیں اب تخلص میں ردّوبدل مناسب نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دو واقعات کے بعد خاکسار نے 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' مرتب کرنے والے مخلص بزرگ عرفان عباسی (مرحوم) کے فرمانے پر مذکورہ کتاب کی 30 جلدوں کا اشاریہ مرتب کرنا شروع کیا تو ایک تہائی کام کرنے پر ہی یہ عجیب بات سامنے آئی کہ نہ صرف علیحدہ علیحدہ مقامات کے شعرا نے ایک ہی تخلص اختیار کیا ہے بلکہ ایک ہی مقام کے بہت سے شعرا کا بھی ایک ہی تخلص ہے۔ خاکسار اس اشاریہ سے اخذ کیے گئے چند مشترک تخلص اور اُن کو اختیار کرنے والے شعرا کے نام و مقام نیز تذکرہ شعرائے اتر پردیش کی جلد کا حوالہ ذیل میں پیش کر رہا ہے۔ قارئین میں سے جو صاحب اُن شعرا کا کلام یا ان کے حالات زندگی دیکھنا چاہیں تو حوالۂ ذیل سے مدد لے لیں۔

مشترک تخلص مع مقام	شاعر کا نام	حوالہ جلد
اختر خیرآبادی	جاں نثار حسین	جلد دوم
اختر خیرآبادی	حکیم محمد اختر علی	جلد 5
اختر خیرآبادی	نذر محمد خاں	جلد 9
اختر لکھنوی	مرزا سجاد علی خاں	جلد 8
اختر لکھنوی	سید کلبِ حسین	جلد 11
اختر لکھنوی	گیان پرشاد سکسینہ	جلد 13
اختر لکھنوی	اختر حسین	جلد 14
اختر لکھنوی	محمد یونس خالدی	جلد 15
اختر لکھنوی	محمود الحسن	جلد 23
اختر لکھنوی	نسیم اختر صدیقی	غیر مطبوعہ
ادیب لکھنوی	امتیاز حسین	جلد 23
ادیب لکھنوی	گُرسرن لال سریواستو	جلد 21
اعجاز الہ آبادی	سید اعجاز حسین	جلد 6
اعجاز الہ آبادی	محمد عباس خاں	جلد 10
ثمر لکھنوی	بادشاہ مرزا	جلد 6
ثمر لکھنوی	ہری رام	جلد 9
جگر گورکھپوری	غلام مرتضیٰ خاں	جلد۔ اوّل
جگر گورکھپوری	رنگ بہادر لال	جلد 4
جوہر بدایونی	آفتاب احمد	جلد 3
جوہر بدایونی	لکشمی نرائن	جلد 5
حزیں میرٹھی	توفیق الحق حقی	جلد 6
حزیں میرٹھی	صابرہ سلطان	جلد 26
شوق لکھنوی	وشنو کمار	جلد 9
شوق لکھنوی	مہادیو پرشاد سریواستو	جلد 11
شوق لکھنوی	سنجے مصرا	بقیدِ حیات
عرفان لکھنوی	سید بادشاہ حسین	جلد 14
عرفان لکھنوی	سید عرفان احمد	جلد 22
عرفان لکھنوی	محمد عرفان	بقیدِ حیات
نور بدایونی	نور جہاں بیگم	جلد 8
نور بدایونی	نورالدین احمد	جلد 15
نور رامپوری	ریاست نور خاں	جلد 4
نور رامپوری	نورالصباح بیگم	جلد 17

طوالت سے بچنے کے لیے درجِ بالا فہرست میں خاکسار نے مشترک تخلص اختیار کرنے والے شعرا کی دس وہ مثالیں پیش کی ہیں جو ایک ہی جائے پیدائش والے شعرا سے متعلق ہیں جبکہ تذکرہ شعرائے اتر پردیش کی 30 جلدوں میں اس طرح کی مثالیں کم و بیش ڈھائی درجن ضرور ہیں۔ اس مختصر فہرست سے ہی یہ بات واضح ہے کہ اگر ہم مذکورہ بالا کسی شاعر کے کسی شعر کو کہیں پیش کرنا چاہیں تو ہم کو اُس کا پورا نام بھی درج کرنا ضروری ہے۔ محض تخلص اور مقام کا نام بتانا کافی نہ ہوگا یعنی تخلص اختیار کرنا بے معنی ہو گیا۔

اُردو آج بھی عوام میں ایسی مقبول ہے کہ اس کے شعرا اور اُن کی شعری تخلیقات کی تعداد دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں تمام محبانِ اُردو کی ذمے داری ہے کہ شعرا کے تخلص کے سلسلے میں ایسے ضوابط مرتب کریں کہ آئندہ یہ ابہام پیدا ہونے کا کہ اصلاً یہ شعر کس اختر لکھنوی، جوہر بدایونی، شیدا فرخ آبادی یا نور رامپوری کا ہے کوئی احتمال نہ رہے۔

تخلص کے انتخاب میں شعرا یہ طریقہ اپنا سکتے ہیں کہ اپنے نام کے کسی ٹکڑے کے ساتھ اپنے استاد کے نام کو جوڑنے کا اہتمام کریں۔ وضاحت کے لیے دو مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ کُندرکی ضلع مرادآباد کے شاعر ریاض اختر نے اپنے استاد گُرسرن لال ادیب لکھنوی کے تخلص کو شامل کرتے ہوئے اپنا تخلص ریاض اختر ادیبی رکھا تھا۔ سہارنپور کے شاعر محمد حنیف نے اپنے استاد سیماب اکبرآبادی کی نسبت سے اپنا تخلص حنیف سیمابی اختیار کیا تھا۔ بعض مرتبہ کوئی شاعر ایک سے زائد اساتذہ سے کسب فیض کرتا ہے اور کبھی کبھار وہ کسی شخص کو بھی استاد نہیں بناتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں وہ اپنے خاندان کے کسی بزرگ سے نسبت جوڑ سکتا ہے۔ مثلاً رامپور کے شاعر صابر رضا خاں نے اپنے دادا مولوی عنایت اللہ خاں صاحب کی نسبت اختیار کرتے ہوئے اپنا تخلص محشر عنایتی رکھا۔

■

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui, Naseem Manzil, Madah Ganj Police Chouki, Seetapur Road, Lucknow - 226020 (UP)

مظفر حسین سید

بیادِ سید حامد

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

(پیدائش: 28 مارچ 1920، وفات: 29 دسمبر 2014)

سیّدِ اوّل، سیدِ اعظم یعنی سر سیدؒ کو سید والا گہر کا خطاب تفویض کرنے والے سید حامد بہ نفسِ نفیس ایک گہرِ عالی تھے۔ جنھیں ان کی خدمات گراں وصفات جمیلہ کے اعتراف میں اکابرین ملت نے سید ثانی کے خطاب سے سرفراز کیا۔ گرچہ انھوں نے اس لقب کو کبھی خوش دلی سے قبول نہیں فرمایا، اور نہ ہی کبھی اس کا اعادہ کرنے والے کی ستائش یا ہمت افزائی کی، بلکہ اکثر فہمائش کی۔ ان کی اس تنبیہ، بلکہ سرزنش کا ہدف راقم السطور بھی کئی بار بنا۔

دانشگاہ سید پر، نیز برادران علی گڑھ پر، سید عالی مقام کے بعد برشگال احسانات کرنے والوں کی فہرست کچھ مختصر نہیں، اس ضیا پاش کہکشاں کے روشن ستاروں میں محسن الملک، وقار الملک، شیخ عبداللہ، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سید حامد جیسی ذی شان ہستیاں شامل رہی ہیں — حیف کہ اب آخری ہستی بھی رخصت ہوئی، سید حامد صاحب بھی عالم ناسوت کا سفر تمام کر کے راہیِ عالم لاہوت ہوئے، نشان راہ دکھانے والا آخری میر کارواں بھی رخصت ہوا — اب ان کے بعد حد نظر تک ایک تاریک خلا ہے، اور کم از کم سر نگاہ روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، سرنگ کے آخری سرے پر بھی نہیں، حد سماعت تک ایک مہیب سناٹا ہے، کوئی خوش کن آواز پردۂ گوش سے نہیں ٹکراتی — امت مسلمۂ ہند آج جس دوراہے پر کھڑی ہے، اس نازک مرحلے میں سید حامد جیسے محسن ملت کی رحلت کے سبب احساس زیاں دو چند ہے۔ آج جبکہ علی گڑھ تحریک کو ایک اور سر سید کی ضرورت ہے، اس لمحے سید ثانی نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔

آج اولاً سر سید اور دوئم مولانا آزاد کی وفیات کے بعد ملت ایک بار پھر یتیم ہوگئی ہے۔ اب کوئی سر پر ہاتھ دھرنے والا تو کیا تسلی کے دو بول بولنے والا بھی نظر نہیں آتا۔ سر سید عالی بخت تھے کہ ان کے بعد ان کے ایسے لائق مرید اور جانشین موجود تھے جنھوں نے محض بائیس برس کے اندر اپنے مرشد کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دکھایا۔ پھر سر سید کی رحلت کے کوئی پون صدی بعد سید حامد نے علی گڑھ تحریک کو از سر نو زندہ کیا۔ اسے مہمیز کیا، اسے رفتار دی، مگر ان کے بعد اب نہ کوئی ان کا جانشین ہے نہ پس رو — عہد وسطیٰ میں ایک بزرگ اپنے شیخ کے وصال کے بعد سریر آرائے منبر ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ ''بڑے نہیں رہے، اس لیے ہم بڑے ہو گئے، کہ اس مسند پر کوئی تو بیٹھتا۔'' مگر آج کے پر آشوب عہد اور دور کساد بازاری میں اب کوئی چھوٹا بھی نظر نہیں آتا کہ سید ثانی کی جگہ لے لے اور اگر ہو بھی تو:

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

سید حامد ہمارے ملّی معاشرے میں علم ودانش کی آخری شمع تھے وہ بذات خود یک نفری فوج تھے، اپنے مرشد معنوی کی طرح، جس کام کی ٹھان لیتے، یا جس مقصد کی بار آوری کا بیڑا اٹھاتے، تنہا راہ پر خار پر گامزن ہوجاتے۔ مقلّد و پیرو اقتدا میں خود آجاتے اور آہستہ آہستہ کارواں بن جاتا۔ صرف علم نہیں تھا، عمل بھی تھا، وہ سراپا عمل تھے، بلکہ یوں کہیے کہ:

علم وفضل وکمال کی صورت

سید حامد صاحب نابغۂ عصر تھے، وہ ادیب تھے، شاعر تھے، صحافی تھے شعلہ بیان مقرر تھے، مصلح قوم تھے، ماہر تعلیم تھے، ایک اعلیٰ منتظم تھے، مگر سب سے بڑھ کر ایک عالم تھے، آج ہمارے معاشرے میں حقیقی معنیٰ میں علما (اسکالرز) کا فقدان ہے۔ حامد صاحب اس صف کے آخری سالار تھے، انگریزی، فارسی اور اردو پر یکساں عبور رکھنے والے اس دور میں عنقا ہیں، مگر وہ تھے، یہ کوتاہ فہم ان کی انشا پردازی کا گرویدہ ہے۔ ان کی فارسی آمیز نثر بیشتر لوگوں کے سروں سے گزر جاتی ہے مگر سمجھنے والوں کو لطف سے مالا مال کر دیتی ہے۔ خاکسار کو بعض اخبارات سے وابستگی کے طفیل ان کی اکثر تحریرات کا قبل از اشاعت، مطالعہ کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا، جو باعث صد افتخار تھا۔

سید حامد صاحب کو نہ خود نمائی پسند تھی نہ خودستائی، بلکہ وہ اپنی تمام ترنیکیوں کو درگلیم رکھنے کے عادی تھے۔ ملت کے مفاد

اور خصوصاً دانشگاہ سید کے حوالے سے مع اس کمترین، ان کے کئی مداحوں وہم خیالوں نے عوامی سطح پر ان کی خدمات اور عطا کا جائز اعتراف کرنا چاہا تو انھوں نے ایک نرم لفظی مگر سخت لہجہ والے انکار سے سب کا منہ بند کر دیا۔ پیہم اصرار کے جواب میں کہا تو یہ کہا کہ ”سید حامد تشہیر نہیں چاہتا، اس سے ملّت اور علی گڑھ کے وسیع تر مفاد کو نقصان پہنچے گا۔“ اک عجب مومنانہ شان تھی، یہ ناچیز اکثر سوچتا کہ شاید اقبال کے تصور مردِ مومن کا ایک زندہ و تابندہ پیکر یہ بھی ہیں۔ انہیں جب دیکھا، جب پایا، معاشرہ و ملّت کے غم میں مبتلا اور نونہالان قوم کے درد میں غلطاں پایا، بالخصوص تعلیم و تربیت کے حوالے سے۔ عام خیال، بلکہ غلط فہمی ہے کہ حامد صاحب مدمّغ و متکبر تھے، زاہد خشک تھے، کسی حد تک بدمزاج اور غصہ ور تھے، لیکن یہ سب دور پار کی اور سنی سنائی باتیں ہیں، جن خوش بختوں کو ان کی ہم جلیسی کا شرف حاصل ہوا، وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ ان اعتراضات میں چنداں صداقت نہیں، البتہ ان کے یہاں ایک کیفیت ضرور تھی:

خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

یہ کوتاہ قلم اپنے ذاتی مشاہدے و تجربے کی بنیاد پر، بلا خوفِ تردید یہ عرض کرتا ہے کہ حامد صاحب انتہائی خلیق، مشفق اور منکسر المزاج تھے۔ ہم عصروں ہی نہیں اصغروں کے لیے بھی۔ وہ خود تو کم سخن تھے، حسب ضرورت بڑی کفایت لفظی سے گفتگو کرتے تھے، مگر اپنے ہم مجلسوں کی بات بہ کمال توجہ سنتے تھے اور صائب رائے، خواہ وہ کسی کی ہو، اسے تسلیم بھی کرتے تھے، اور داد بھی دیتے تھے۔ وہ خود کسی معاملے میں رائے قائم کرنے میں خاصے محتاط اور دقّت پسند تھے، مگر ایک بار کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اپنے موقف پر اٹل ہو جاتے تھے، اس معاملے میں، وہ قدرے متشدّد بھی تھے، ان کا ایک بے مثل وصف ان کی نیک نیتی، نیز ہر قبیل کی بدعنوانی سے پاکی تھی، جس کے قائل ان کے دشمن بھی تھے —— ان سے فیصلے کی غلطی تو ہو سکتی تھی کہ بشر تھے، لیکن ان کے اخلاص پر انگشت نمائی کی گنجائش ہرگز نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ حق پرست تھے اور حق کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ اس کی زبردست مخالفت ہوتی ہے، سو ان کی بھی ہوئی —— بردباری، قناعت اور تحمل، ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے، ان کی ہمہ جہت شخصیت کو اگر چند الفاظ میں سمونا مطلوب ہو تو حالی کا یہ شعر کافی ہے:

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

حکیم عبدالحمید مرحوم کی سرپرستی میں سید حامد نے قوم مسلم کے لیے جتنی تعلیمی خدمات انجام دی ہیں اور جس قدر وسیع پیمانے پر بے مثل کاوشیں کی ہیں، ان کی مثالِ دگر سر سیّد کے بعد نظر نہیں آتی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ گزشتہ کئی عشروں کے دوران بعض دردمندان ملت نے تعلیم کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ خصوصاً مغربی اور جنوبی ہند میں، تاہم ان کی حیثیت کم و بیش مقامی و علاقائی ہے، حامد صاحب کی طرح ملک گیر نہیں۔ جامعہ ہمدرد کا قیام بلاشبہ حکیم عبدالحمید مرحوم کا رہین منت ہے۔ مگر اسے باضابطہ دانشگاہ مرکزی کا درجہ دلانا، نیز اس کے وجود کو استحکام بخشنا حامد صاحب کا ہی کمال ہے، یہ کہنا درست ہوگا کہ جامعہ ہمدرد کو قائم تو حکیم صاحب نے کیا مگر اس کی بتدریج تشکیل حامد صاحب کے ہاتھوں ہوئی، ایک نے بنیاد کا سنگ اوّل رکھا تو اس کو خشت در خشت بشکل عمارت دوسرے نے تعمیر کیا —— ہمدرد برادری نے اس کا اعتراف عملی بھی کیا اور بایں جامعہ کے بعد امارت جامعہ کا تاج حامد صاحب کے سر پر ہی رکھا گیا۔

حامد صاحب سے اس کم سواد کے فدویانہ تعلق اور ان کے مشفقانہ سلوک کا ایک سبب، ایک ہی مادر درسگاہ کا فرزند ہونے کے علاوہ یہ بھی تھا کہ ان کا اور اس خاکسار کا آبائی وطن بھی ایک، شہر جگر، مراد آباد تھا۔ یعنی مٹی ایک تھی، تاہم سب سے بڑی وجہ ارتباط یہ تھی کہ ان کا دل ملت کے تئیں دردمندی سے سرشار تھا، وہ ہمہ وقت ملّت کی فلاح کے لیے بے قرار اور مضطرب رہتے تھے، ایسی تڑپ بہت کم اکابرین میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہ بہت خوش امید کبھی نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ ایک بے حس اور خود بیزار معاشرے کے حالات انھیں ہمیشہ آزردہ و افسردہ رکھتے تھے۔ اکثر کہتے بھی تھے کہ ”عجیب قوم ہے، جو خود آپ اپنی دشمن ہے۔“ تاہم اس کے باوجود وہ قنوطی نہیں تھے اور روشنی کی پیامبر ایک کرن کی تلاش انھیں ہمیشہ رہتی تھی۔

اگرچہ سید حامد صاحب سے راقم نارسا کی وابستگی و تعلق بہت بے تکلّفانہ نہ تھا۔ تاہم یہ ربطِ باہم بالا جہت تھا، نیز اس کی مدت کم و بیش تین چار عشروں کو محیط رہی۔ خاکسار کو ان کی زیارت کا شرف اولاً جمعیۃ العلما ہند کے ترجمان ’الجمعیۃ‘ کے دفتر میں حاصل ہوا، جہاں وہ غالباً مولانا اسعد مدنی یا مولانا سید احمد ہاشمی سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ ان کی شخصیت پہلی ہی نظر میں جاذب، پرکشش و متاثر کن محسوس ہوئی۔ موصوف سے ناچیز کی پہلی باضابطہ ملاقات، کوئی پینتیس برس قبل، دہلی میں ان کے، دفتر میں ہوئی، اس وقت وہ مرکزی حکومت کی ذیلی ملازمتوں کے ادارے کے سربراہ تھے، بلکہ اس کے بانی بھی وہی تھے۔ یہ نارسا اس وقت علی گڑھ میں ایک کل ہند مذاکرہ منعقد کرنے کی تگ و دو میں تھا اور اس کے لیے ایک معقول افتتاح کنندہ درکار تھا، اگرچہ موصوف نے ناچیز کی پیش کش کو بوجوہ شرف قبولیت نہیں بخشا، تاہم وہ ایک طویل اور یادگار ملاقات تھی۔ وہ مذاکرہ تو برپا ہوا اور خوب ہوا۔ پھر ان کے مصلحتی انکار کا عقدہ بھی حل ہو گیا اور محض چند ہفتوں بعد ہی یہ خبر گرم ہوئی کہ سید حامد اپنی مادر درسگاہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے علی گڑھ تشریف لا رہے ہیں، اور وہ بھی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے خصوصی ایما پر، کیونکہ نیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قانون اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور وزیر اعظم بوجوہ مناسب خیال کرتی ہیں کہ سید حامد صاحب اس مثبت تبدیلی کے وقت بہتر اور زیادہ کارگر ثابت ہوں گے، بہ نسبت کسی غیر کے —— پھر چند ماہ میں سید صاحب علی گڑھ تشریف لے آئے اور سفینۂ علی گڑھ کی کمان سنبھالی۔ مگر تب تک راقم السطور عازم دہلی ہو چکا تھا۔

حسن اتفاق کہ حامد صاحب کے دور اقتدار کے آخر میں یہ کوتاہ قلم پھر سرزمین علی گڑھ وپروارد ہوا، دہلی کے کئی اخبارات کے اجازۂ نمائندگی کے ساتھ —— حامد صاحب سے پھر ملاقات، بلکہ ملاقاتیں ہوئیں۔ اپنے قیام علی گڑھ کے دوران ناچیز نے اپنی مادر درسگاہ کی ترقی و کامرانی کو موضوع بنا کر کئی مفصّل مضامین شائع کرائے، جن میں سے کم از کم دو تین کو اتنی ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہندوستان کے بیشتر اخبارات نے ان کی اشاعت وسیع پیمانے پر کی، اور ان کا حوالہ بیرونی ذرائع مواصلات نے بھی دیا —— ان کاوشوں کی بنیاد پر بندۂ ناچیز کو حامد صاحب کی توصیف اور شاباشی بارہا

وصول ہوئی، گوکہ یقین تھا کہ یہ دادودہش اس کی سیاہ قلمی کی نہیں بلکہ موضوع بیان یعنی مادر درسگاہ کی ہے، جو حامد صاحب کو بہت عزیز تھی اور ناچیز کی عقیدت کا مرکز اسی دوران حامد صاحب کا مجموعہ مقالات 'نگار خانۂ رقصاں' منظر عام پر آیا، جس کا دستخط شدہ نسخہ خودان کے دست مبارک سے حاصل ہوا، وہ آج بھی اس ناچیز کا سرمایۂ افتخار ہے۔ اس کے بعد خاکسار نے بہ سلسلۂ معاش پھر دہلی کی جانب مراجعت کی، اورادھر حامد صاحب کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔

ان کا عہد گرچہ مادر درسگاہ کی علمی ترقی، درسی عروج، نیز جملہ کامرانیوں سے مزین تھا۔ تاہم مجموعی طور پرانتہائی پرآشوب تھا، اس لیے کہ یاران میکدہ نے انھیں ایک لمحہ بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حقیت تلخ یہ کہ حامد صاحب کا دور مشکلات اور مسائل کا دور تھا۔ حالات کی نامساعدت کے باوصف انھوں نے جوکارنامے انجام دیے، وہ انھی کا حصہ تھے۔ ورنہ زیادہ وقت تو مخالفین سے عہدہ برآ ہونے اور ریشہ دوانیوں کا سدباب کرنے میں ہی ضائع ہوا، پھر بھی ایک نامکمل مدت کار میں ان کے زور بازو سے وہ تاریخی کارہائے نمایاں پائے جو، دوسروں کے ذریعے ایک طویل عرصے میں ممکن نہ ہو سکے تھے۔ حامد صاحب اس امر کے سزا وار تھے کہ انھیں دوسری مدت کار تفویض ہوتی، مگر غلط بخشیوں کے اس دور میں یہ کہاں ممکن تھا۔ انھی دنوں حامد صاحب نے دوکارہائے عظیم انجام دیے، اور وہ تھے سرسیدؒ کی یادگار جریدۂ 'تہذیب الاخلاق' کا اجرائے نو، اس کی تجدید واستحکام اور سرسید کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا احیا، جس کی سالانہ کانفرنس اب بھی ہوتی ہے اور اس سال بھی ہوگی۔

یہاں یہ ذکر لازم ہے کہ حامد صاحب نے اپنے عہد کار میں مادر درسگاہ کی بعض بنیادی خدمات انجام دیں، مسلم یونیورسٹی ایکٹ 1 8 ان کے دور میں نافذ ہوا، اس میں انھوں نے ایک بڑی فیض رساں اور دور رس شق کا اضافہ کیا جس سے اس دانشگاہ کا دائرہ کار وسیع تر ہوا، اور اب اس کے مراکز کی شکل میں اس کی برکتیں ملک کے چہار طرف پہنچ رہی ہیں انھوں نے نئے شعبے قائم کیے، عمارات تعمیر کیں اور دانشگاہ کے نظم ونسق کو جدید تر بنا کر نئی تکنیک سے منسلک کرکے نئی جہتیں فراہم کیں۔

اپنے علی گڑھ کے دوران قیام حامد صاحب نے کئی منصفانہ اقدامات کیے، کئی مشکل اور جرأت مندانہ فیصلے کیے، جن میں سے دو اہم فیصلے جید عالم دین مولانا تقی امینی اور کمترین کے استاد محترم قاضی عبدالستار صاحب کو منصب پروفیسری پر فائز کرنے کے بھی تھے، ہر دو حضرات کے ساتھ مسلسل ناانصافی ہورہی تھی۔ حامد صاحب نے ان کی حق تلفی کا ازالہ کیا، انھیں پروفیسر بنایا، ان کی شرطوں پر بنایا، کئی ضابطے اور قاعدے پس پشت ڈال کر بنایا، اس لیے کہ وہ حق دار کو اس کا حق رسید کرنے کے قائل بھی تھے اور اس پر عامل بھی۔ ایسے کتنے واقعات ہیں جو ذہن ودل کے افق پر برقی قمقموں کی مانند روشن ہیں۔ اگرچہ اس ہستی جاوید سے اکثر ملاقاتیں مختصر تھیں، بالفصل تھیں، تاہم سیر حاصل تھیں۔ افسوس کہ اب یہ یادیں بس یادیں اور باتیں صرف باتیں رہ گئی ہیں۔

دہلی آمد کے بعد سید حامد صاحب نے مسلمانوں کے ترجمان ایک انگریزی روزنامے کا منصوبہ بنایا تھا، اس کے لیے باضابطہ ایک کمپنی قائم کرلی تھی، کچھ سرمایہ بھی جمع ہوگیا تھا مگر جہد مسلسل کے باوجود، ملت کی عام بے حسی، اکابرین ملت کی سردمہری اور سرمایہ کی عدم فراہمی کے باعث ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ قابل ذکر ہے کہ جو سرمایہ میسر آیا تھا، وہ اس منصوبے کی تنسیخ کے بعد، تمام عطیہ دہندگان کو بہ کمال عجلت واپس کردیا گیا تھا۔ تب بطور اشک شوئی انھوں نے انگریزی کے ایک نیم ماہی جریدے 'نیشن اینڈ دی ورلڈ' کا اجرا کیا۔ یہ جریدہ کاروباری سطح پر بھلے ہی کامیاب نہ ہوا ہو، مگر اپنے بانی کی طرح اس کی سنجیدگی اور بردباری اپنی مثال آپ تھی۔ سوئے اتفاق، اس سے قبل راقم التحریر 'رائزنگ نیشن' کے عنوان سے ایک ماہانہ انگریزی جریدے کی اشاعت شروع کرکے موقوف بھی کر چکا تھا۔ ایک باران کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو خاکسار نے اس مرحوم جریدے کے چند شمارے ان کی نذر کیے۔ لوح کی یکسانیت دیکھ وہ متعجب بھی ہوئے اور محظوظ بھی، کیونکہ عنوان 'نیشن' دونوں میں نمایاں تھا۔

اس کے بعد گاہ بگاہ نیاز حاصل ہوتا رہا، کبھی کسی جلسے جلوس میں، کبھی علی گڑھ میں کبھی دہلی میں، ناچیز جیسے ایک عامی مدیر کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ علی گڑھ میں سرسید سیمینار کے جلسہ عام میں حامد صاحب نے اس کے شائع کردہ ماہنامہ 'حال ہند' کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نمبر کا اجرا فرمایا، معروف ادیب اور استاد محترم قاضی عبدالستار صاحب اس جلسے کے میزبان خصوصی تھے اور سید حامد صاحب مہمان خصوصی، شاید انھی برکات کے سبب 'حال ہند' کا وہ شمارہ ایک یادگار کی حیثیت اختیار کرگیا اور آج تک محبان علی گڑھ کے ذہن ودل اور ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

ایک ملاقات کے دوران راقم الحروف نے اپنے انگریزی ہفتہ وار 'اسٹار' کے لیے ان کے مصاحبہ (انٹرویو) کی تجویز رکھ دی، جو مقبول ہوئی۔ حامد صاحب نے انتہائی فصیح وبلیغ انگریزی میں کئی گھنٹے گفتگو کی، اس طولانی گفتگو کے موضوعات میں ملّی مسائل، معاشرتی اصلاح، اور تعلیمی صورت حال کے علاوہ ان کے محبوب موضوع، تحریک سید کی توسیع واجرائے نو، جیسے متعدد امور شامل تھے۔ ہر سوال انھیں مہمیز کرنے والا تھا اور ان کے جوابات انتہائی تحمل سے پر، مدبرانہ ودانشوارانہ تھے، اخبار کے قارئین اور مدیر دونوں کے لیے چشم کشا— یہ انٹرویو اخبار کے کئی صفحات کو محیط تھا۔ انٹرویو کے اختتام پر ناچیز نے ان کا شکریہ ادا کرتے وقت انھیں 'سید ثانی' کے لقب سے مخاطب کیا تو انھوں نے حسب روایت فہمائش کی۔ ''نہیں میں اس اعزاز کے لائق نہیں اور اسے لکھیے گا ہرگز نہیں''— اس نافہم نے جذبات کے سیل میں مزید توصیفی جملے ادا کیے تو انھوں نے بہ کمال انکسار فرمایا کہ ''میں صرف قوم کا خادم ہوں، قوم کی فلاح میرا نصب العین اور اس کی خاموش خدمت میرا شعار ہے۔''

حامد صاحب کی ملّی خدمات کی فہرست دراز تر ہے۔ مادر درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ہمدرد کے علاوہ، وہ تاریخی ادارہ جات اینگلوعربک اسکول اور دہلی کالج، نیز انجمن ترقی اُردو، ہند کی انتظامیہ کے سربراہ بھی رہے۔ اس کے علاوہ دہلی میں جدید تعلیم کے تمام تر مسلم اداروں کی اساس اور ان کے انتظام و انصرام میں کسی نہ کسی سطح پر ان کا دخل تھا۔ مشہور زمانہ، انڈیا اسلامک سینٹر کی بنیادوں میں بھی ان کا پاک پسینہ شامل تھا۔ بڑی حکمت سے حامد صاحب نے ایک کرشمہ یہ کیا تھا کہ جملہ مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے ایک نظم تشکیل دے کر، اُسے اِس طرح کارگر بنایا کہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں مسلم طلبا کی نمائندگی کئی گنا ہوگئی اور سب کچھ

حامد صاحب نے ان کی حق تلفی کا ازالہ کیا، انھیں پروفیسر بنایا، ان کی شرطوں پر بنایا، کئی ضابطے اور قاعدے پس پشت ڈال کر بنایا، اس لیے کہ وہ حق دار کو اس کا حق رسید کرنے کے قائل بھی تھے اور اس پر عامل بھی۔ ایسے کتنے واقعات ہیں جو ذہن ودل کے افق پر برقی قمقموں کی مانند روشن ہیں۔ اگرچہ اس ہستی جاوید سے اکثر ملاقاتیں مختصر تھیں، بالفصل تھیں، تاہم سیر حاصل تھیں۔ افسوس کہ اب یہ یادیں بس یادیں اور باتیں صرف باتیں رہ گئی ہیں۔

انتہائی خاموشی سے۔ درحقیقت گزشتہ نصف صدی میں شاید ہی کوئی ملّی منصوبہ ایسا ہو، جس کی شیرازہ بندی، تکمیل اور کامیابی میں حامد صاحب کا عمل دخل نہ رہا ہو۔ سچر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے اس کی سفارشات میں ان کی تجاویز اور مشورے شامل تھے اور وہ اس کے نفاذ کے سلسلے میں خاصے پرامید تھے، مگر انجام کار جب کوئی موثر نتیجہ سامنے نہ آیا تو اس پر ملول رہا کرتے تھے۔ ان کی رحلت سے کتنے ادارے یتیم و یسیر ہو گئے۔ اس خسارے کا اندازہ ملّت کو آہستہ آہستہ ہوگا اور قدر دانوں کے دلوں میں ان کی اہمیت افزوں تر ہوتی جائے گی۔ اگرچہ وہ علی گڑھ سے دل برداشتہ گئے تھے، مگر انھوں نے کبھی کوئی کینہ نہیں پالا اور نہ کبھی حرف شکایت ان کی زبان پر آیا۔ اپنے دورِ اقتدار کے بعد بھی وہ علی گڑھ کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے اور اربابِ اختیار کی رہنمائی کرتے رہے۔

علی گڑھ کے بعد کی زندگی میں 'کاروانِ تعلیم' اور 'کاروانِ صحت' ان کے دو بڑے کارنامے ہیں۔ رابطہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے کاروانِ تعلیم کا آغاز انھوں نے علی گڑھ سے ہی کیا۔ ستر برس کی عمر میں، اٹھارہ دن میں تیرہ ریاستوں کے تیس سے زائد شہروں کی خاک چھان کر، خوابیدہ ملت بیضا کو بیدار کرنے کی سعیِ مسلسل کی اور ابھی تکان اتری نہ تھی کہ کاروانِ صحت کی راہ نمائی کے لیے پھر سرگرم سفر ہو گئے۔ ملت کی خیر خواہی کا ایسا جنون سرسید اور مولانا آزاد کے بعد اگر نظر آیا تو ان میں نظر آیا۔ اہل علی گڑھ شاہد ہیں کہ اپنی تحریک تعلیمی کے دور میں وہ اکثر ایک رفیق صغیر کے اسکوٹر کی عقبی نشست پر بیٹھے نظر آتے۔ شاندار سواری کا انتظار منظور نہ تھا کہ تاخیر ہوتی، بس منصوبے کی تکمیل مقدم تھی، کیا کوئی اور سابق شیخ الجامعہ ایسی مثال پیش کر سکتا ہے؟ مگر وہ سید حامد تھے۔ اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ علی گڑھ سے سبکدوشی کے بعد مبینہ طور پر حامد صاحب کو ایک ریاست کا گورنر، کسی ملک میں سفیر اور مرکزی حکومت کا مشیرِ اعلیٰ مقرر کرنے کی پیش کش اعلیٰ سطح پر کی گئی تھی۔ مگر اس مردِ آزاد نے ہر سہ تجاویز کو یک زبان مسترد کر دیا، انھیں اس سے بڑے کام جو کرنے تھے۔ ستم یہ کہ ہماری ناشکری قوم کا ایک طبقہ پھر بھی ان سے شاکی رہا۔ تاہم اکثریت نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور کم از کم دو نسلیں ان کی گرویدہ رہیں، ہیں اور رہیں گی—

سید حامد صاحب کو قدرت نے ایک طویل حیات سے نوازا اور انھوں نے ایک شکر گزار بندے کے طور پر تقریباً ایک صدی پر محیط اپنی زیست کے ایک ایک لمحے کو بڑی دانش مندی، منصوبہ بندی اور کفایت سے صرف کیا اور ہمیشہ بہترین مصرف کی تلاش کی، جب تک صحت نے ساتھ دیا اور خوب دیا کہ وہ تقریباً نوے برس کی عمر تک ذہنی و جسمانی طور پر فعال رہے۔ یہاں ان کے علم و تعلم کے ہمرشتہ کھیل سے ان کی رغبت اور تربیت کام آئی۔ فعالیت کی حد یہ ہوئی کہ پچاسی برس کی عمر میں 'کل ہند تحریک تعلیمی' کا آغاز کیا اور اسے کامیابی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ حامد صاحب نے ایک طویل، کامیاب و کامران و سرخ روحیات کی تکمیل کی، ان کی رخصت ان کے مداحوں کے لیے فطری طور پر تکلیف دہ تو ہے، مگر ہر قلب کو اس لحاظ سے سکون و طمانیت ہے کہ ان کی خدمات ناقابل

فراموش، ان کی عطا طویل العمر اور ان کی عظمت لازوال ہے۔ دنیاوی زندگی جس قدر ناپائیدار ہے، ان کا صلۂ خرمن ہستی اتنا ہی پائیدار ہے۔ ان کی حیات بافوز، ان کے اہل خانہ، اعزہ، احباب، رفقا، ہم چشموں اور اصاغرین کے لیے مشعل راہ ہے، لائق صد افتخار ہے۔ گو کہ ان کا جانا ایک سانحۂ دل شکن اور خسارۂ عظیم ہے، جس کی تلافی بعید از امکان نظر آتی ہے، بہر کیف ہم سب خوش نصیب ہیں کہ ہم نے انھیں دیکھا، برتا اور ان سے فیض حاصل کیا۔

اس ناچیز نے تو جب بھی ان سے شرف ملاقات حاصل کیا، سراپا شرافت و نجابت کے اس پیکر میں کبھی سرسید کی انقلابی روح متحرک دیکھی، کبھی گفتگو میں اقبال کی فکر گرماتی پائی تو کبھی مولانا آزاد کی فراست اور تبحر علمی، ان کی شبیہ سے عیاں نظر آئے، وہی بردباری، وہی متانت، وہی عالمانہ شان۔ تو کبھی ذاکر صاحب کا جلوہ نظر آیا، وہی دور رسی، وہی تدبر وہی وقار مگر اس مردِ حق نما کو یہی کہتے سنا کہ یہ بندۂ ناچیز، ایک گنہ گار اور ناکارہ انسان ہے، اگر کچھ ہے تو صرف اور صرف قوم کا خادم، تب یہ خاکسار شرارت بھری عقیدت سے یہ آسمانی فقرہ ادا کرتا — 'سید القوم خادمہم' — اور جواباً وہی مشفقانہ فہمائش، وہی ابتسام اور ازلی صبر و سکون۔ اس کم فہم اور کوتاہ نظر کو ان میں کبھی کوئی عیب نظر نہ آیا، اگر کچھ تھا تو ان کی انا تھی، حد سے بڑھی دقت مزاجی تھی، سو یہ اوصاف انھیں زیب دیتے تھے۔

مرحوم سے آخری ملاقات کچھ عرصہ قبل تعلیم آباد میں ان کی رہائش گاہ پر ہوئی، صاحب فراش تھے، نقاہت کا غلبہ تھا، مگر شرف ملاقات بخشا، روایتی وضع داری کا بھرپور ثبوت دیا اور معمول سے سوا تواضع کی — دیرینہ شفقت میں کوئی کمی نہ تھی، ذہن بہ تکمیل بیدار تھا، حاضر تھا، البتہ کم سخنی بڑھ گئی تھی — ان دنوں ایک انگریزی، اردو علمی ادارے کے قیام کا سودا سر میں سمایا ہوا تھا۔ عین خواہش تھی کہ موصوف اس کی سرپرستی قبول فرمالیں۔ خاموش رضامندی بھی عطا ہوئی، لیکن وہ ادارہ ان کی حیات میں وجود پذیر نہ ہو سکا۔ سر میں سودا اب بھی ہے مگر سودائیوں کا سردار اب نہیں رہا — اس آخری ملاقات میں راقم کو ایک تعجب خیز مسرّت یہ نصیب ہوئی کہ موصوف نے قرۃ العین حیدر پر اس ناچیز کے ایک مضمون کا ذکر کیا، جس میں اس کوتاہ علم نے ان کا حوالہ دیا تھا اور ان کی تحریروں کے اقتباسات درج کیے تھے۔ امر حیرت ناک یہ تھا کہ عمر کے اُس حصے میں انھوں نے نہ صرف اس مضمون کو ملاحظہ فرمایا تھا، بلکہ یاد بھی رکھا تھا۔

خود حامد صاحب نے بیرون ملک اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا: ''سرسید کے قد و قامت کا کوئی دوسرا مسلمان نظر نہیں آتا'' — ستم یہ ہے کہ اب خود ان کے قد و قامت کا کوئی فرد ملّت بھی نظر نہیں آتا۔ تا حد نگاہ ظلمت ہے۔ دار تو اپنی جگہ قائم ہے، مگر سرِ دار سروں کے چراغ رکھنے والے سب عالم جاوید کے لیے پرواز کر گئے۔ تمام تر حصولیابیوں کے بعد بھی حامد صاحب کے چند خواب ہائے گراں بے تعبیر رہ گئے، کئی منصوبے نامکمل رہ گئے، مثلاً وہ ایک اعلیٰ، جدید، تکنیکی دانشگاہ قائم کرنا چاہتے تھے، مسلمانوں کے انگریزی و ہندی اخبارات جاری کرنا چاہتے تھے، ملت کی ترجمانی کے لیے ایک نیوز چینل شروع کرنا چاہتے تھے اور بھی کئی منصوبے ذہنی و فکری سطح پر تھے — یہ سب ارمان ان کے ساتھ گئے، ہمیشہ کے لیے، مگر دل سمجھتا ہے کہ:

شاید آجائے کوئی آبلہ پا اس کے بعد

Dr. Muzaffar Husain Syed, 29/11 Sir Syed Road, Darya Ganj, New Delhi - 110002
Emai.: syedmh92@yahoo.com, syedmh92@gmail.com

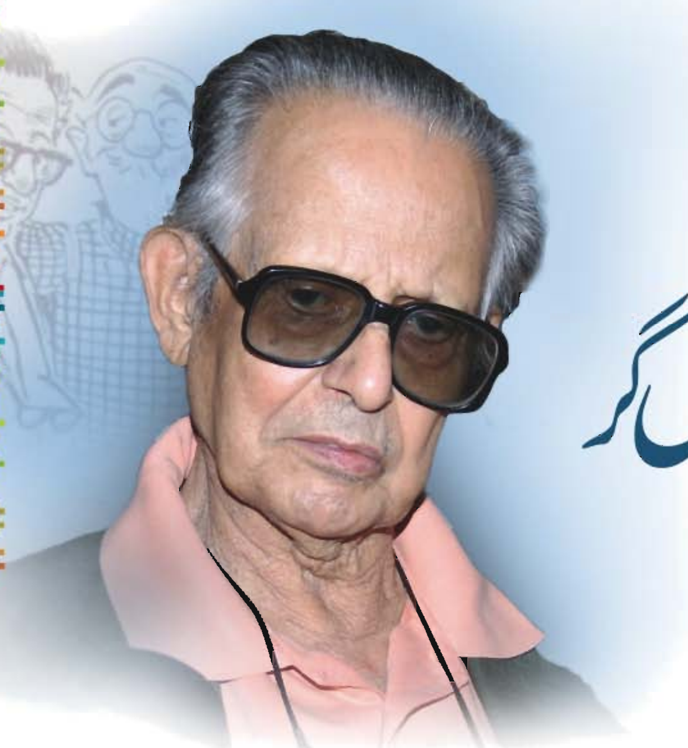

لئیق رضوی

عام احساسات کا خاص نقش گر
آر کے لکشمن

ہندوستان میں کارٹون نگاری کا جائزہ لینے کے بعد کوئی بھی یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کر سکتا ہے کہ کارٹون میں گزشتہ صدی دراصل آر کے لکشمن اور ان کے کامن مین کی صدی تھی! حال ہی میں ان کے انتقال کے ساتھ ہندوستانی کارٹون نگاری کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں۔ لیکن ہمارے درمیان ان کا 'کامن مین' ہمیشہ زندہ رہے گا! ادارہ

25 اکتوبر 1921 کو میسور کے ایک اسکول ماسٹر کے گھر آنکھ کھولنے والے آر کے لکشمن سات بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ بچپن میں ہی انھوں نے تصویر کشی میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ فطرت انھیں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ انھیں جب بھی موقع ملتا وہ اپنے اردگرد کی دنیا اور ماحول کو پڑھنے، سمجھنے اور پھر لکیروں کے سہارے اپنے انداز میں اسے شکل دینے کی کوشش کرتے۔ اپنی خودنوشت میں آر کے لکشمن لکھتے ہیں:

''میں نے تصویر کشی کب شروع کی؟ شاید تین برس کی عمر میں، ظاہر ہے پہلے دیوار پر۔۔۔ کسی بھی عام بچے کی طرح۔ ان دنوں والدین زیادہ برداشت کر لیتے تھے۔ دیوار پر اس طرح لکیریں کھینچنے سے مجھے کسی نے روکا نہیں۔ میں کوئلے کے ٹکڑوں سے لکیریں کھینچتا تھا، جو میں پچھواڑے کے گرم پانی کے چولہے سے لے آتا تھا۔ میں بناتا کیا تھا؟ عام چیزیں۔۔۔ درخت، گھر، پہاڑ کے پیچھے سورج۔ کلاس میں پڑھائی میں اچھا نہیں تھا۔ ایک بار جب میرے ٹیچر نے شاباشی میں میری پیٹھ تھپتھپائی تھی تو وہ بھی میری مصوری کے لیے۔۔۔ کوّے مجھے متوجہ کرتے، کیونکہ پورے منظر میں کوّا بہت متحرک لگتا تھا۔ میرے باغیچے میں ہرے درختوں، نیلے آسمان، لال زمین اور زرد چہار دیواری کے بیچ الگ سے ہی کالا دکھائی دیتا تھا۔ باقی چڑیاں ڈرپوک ہوتی تھیں۔ وہ خود کو چھپا لینے کی کوشش کرتیں لیکن وہ اپنا دھیان بڑی اچھی طرح رکھ سکتے تھے۔ تین سال کی عمر میں میں نے کوّوں کی تصویر بنانا شروع کر دی۔ میں انھیں مزاحیہ انداز میں بناتا... ہر پیڑ متوجہ کرتا۔ میں ان کے اوپر چڑھ جاتا اور وہاں سے دنیا کو دیکھا کرتا۔ وہی پرانی جگہیں پیڑ کی بلندی سے کتنی مختلف دکھائی پڑتی ہیں۔''

عمر کے ساتھ شوق بھی بڑھا اور کوئلے سے کھینچی گئی لکیروں سے شروع ہوا 'اسکیچنگ کا' یہ سفر پروان چڑھتا رہا۔ مشق مسلسل نے فطری ہنر میں جلا پیدا کر دی۔ اسکول، کالج کے دنوں میں ہی آر کے لکشمن کے بنائے 'السٹریشن'، 'کیریکیچر' اور کارٹون 'بلٹز' اور 'سوجراج' جیسے اخبار و جرائد میں جگہ پانے لگے تھے۔ دریں اثنا لکشمن اپنے بڑے بھائی ممتاز انگریزی ناول نویس آر کے نارائن کی تحریروں کے لیے السٹریشن بھی بناتے، جو 'دی ہندو' میں شائع ہوتیں۔ پھر انھوں نے 'السٹریشن' اور کارٹون نگاری کو ہی اپنا کریر بنا لیا۔ میسور سے وہ بمبئی آ گئے اور 'فری پریس جرنل' سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں آر کے لکشمن ممتاز انگریزی اخبار 'ٹائمس آف انڈیا' میں سیاسی کارٹونسٹ مقرر ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا نے انھیں اظہار کا نیا آسمان دیا اور پھر انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آر کے لکشمن نے 1951 میں اپنا ہر دل عزیز کارٹون کردار 'کامن مین' یہیں تخلیق کیا، جو ان کی کارٹون پٹی 'یو سیڈ اٹ' کا مستقل کردار بن گیا۔ انھوں نے اخبار میں کارٹون اور کارٹونسٹ کا وقار بڑھایا۔ یہ اپنے فن میں مہارت ہی تھی کہ آر کے لکشمن کو اپنے اخبار کے چیف کارٹونسٹ جیسا رتبہ حاصل تھا۔ ان کے کارٹون ہمیشہ پہلے ہی صفحے پر شائع ہوتے۔

آر کے لکشمن اپنے فن میں طاق تھے۔ سدھی ہوئی لکیروں اور مخصوص خطوط ان کے کارٹونوں کی جان تھے اور پہچان بھی۔ برطانیہ کے ممتاز کارٹونسٹ سر ڈیوڈ لوو (ایوننگ اسٹینڈرڈ) سے متاثر تھے۔

ایک سیاسی کارٹونسٹ کے طور پر آر کے لکشمن نے خاص جگہ بنائی۔ تقریباً نصف صدی تک ان کے خیالی کردار 'کامن مین' نے دلوں پر راج کیا۔ لکشمن آزادی کے بعد تیزی سے ابھرے متوسط طبقے کے نقیب تھے۔ اس کے سکھ، دکھ اور شکایتیں، ان کے کارٹون کا موضوع بنتے۔ اس طبقے کے ساتھ ان کے قارئین کا دائرہ بھی بڑھتا گیا۔ وہ دادا کے بھی پسندیدہ تھے اور پوتے پوتیوں کے بھی۔ لوگ بے صبری سے اس کا انتظار کرتے۔

آر کے لکشمن نے اپنے کارٹون میں عام آدمی کے روز مرہ کے مسائل، تشویش اور سوالوں کو بڑے فنکارانہ طور پر زبان دی ہے۔ اس کے درد کو پوری شدت اور ہمدردی سے بیان کیا۔ وہ حالات کی تصویر کشی ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف پرزور مداخلت اور احتجاج بھی کرتے۔ ان کے کارٹون ذمہ داروں کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں، بے ساختہ ہنسا ہی نہیں دیتیں، بلکہ سوچنے پر مجبور کر دیتیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مسائل دوراں پر یہی بے باک تبصرہ، یہی چبھتے ہوئے سوال، لکشمن کو منفرد پہچان دیتے ہیں۔ وہ

حالات کو لے کر اندیشے میں تھے لیکن مایوس بالکل نہیں۔ ان کے کارٹون بہتری کی امید بھی جگاتے۔ جو باتیں لمبی لمبی تقریروں اور تحریروں میں بھی مشکل سے بیان کی جا سکتیں آر کے لکشمن چند لکیروں اور جملوں سے یوں کہہ دیتے کہ سب کچھ جیسے دل پر نقش ہو جاتا۔

آر کے لکشمن کل وقتی کارٹونسٹ تھے۔ انھیں اپنے کام سے عشق تھا۔ مجبوریاں یا مصروفیت کبھی ان کے ہاتھ نہیں پکڑ پائیں۔ 2002 میں فالج کا اثر ہونے کے بعد بھی وہ کانپتے ہاتھ سے کارٹون بناتے رہے۔ یہ فرض کے تئیں ان کے جنون اور وابستگی کا ثبوت ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے کام میں ڈوبے رہتے۔ ذرا سی بھی چوک انھیں برداشت نہیں تھی۔

آر کے لکشمن اپنے دور کے شنکر پلئی، ابو ابراہیم اور او وی وجین جیسے کارٹونسٹ جیسی بلیغ سیاسی بصیرت نہ بھی رکھتے ہوں، لیکن ان کے کارٹون کی دھار کسی سے کم نہیں تھی۔ دراصل وہ عام فہم کے کارٹونسٹ تھے۔ موضوع کا انتخاب اور اس کا ٹریٹمنٹ وہ عام آدمی کے نظریہ سے ہی کرتے۔ ان کی لکیریں اور ٹون عام آدمی کے احساسات کے سچے ترجمان تھے۔ یہی رویہ ان کے کارٹون کی کاٹ بڑھا دیتا تھا۔

آر کے لکشمن کی انگلیاں ہمیشہ وقت اور حالات کی نبض پر رہیں۔ دو ڈھائی تین انچ کے چوکھٹے میں نصف صدی تک وہ عام آدمی کی زندگی کا رزمیہ ہی تخلیق کرتے رہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے اپنے مخصوص انداز میں پیش کر دیا۔ ان کے تبصروں نے عام آدمی کے دبے کچلے احساسات کو زبان ہی نہیں دی، بلکہ جمہوریت میں اس کی طاقت کا احساس کرایا۔ ملک کے سیاسی اور سماجی منظر نامہ کے سیاہ کونے آر کے لکشمن کو پریشان کرتے اور یہی بے چینی اور درد ان کارٹون میں ڈھل کر سامنے آتا۔ بقول ساحر لدھیانوی:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

آر کے لکشمن کے کارٹون ان کی انسان نواز فکر کی زبان تھے۔ آس پاس جو بھی غلط نظر آتا وہ پوری فنکارانہ حسیت کے ساتھ ان کے کارٹون میں ظاہر ہوتا۔ معاشرے کی صورت حال انھیں کارٹون بنانے کے لیے تحریک دیتی اور کبھی کبھی دباؤ بھی ڈالتی۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا:

''سیاسی اور سماجی حالات اتنے خراب ہیں کہ اگر میں کارٹون نہ بناؤں تو خودکشی کر لوں۔''

آر کے لکشمن کو ان کے کردار 'کامن مین' کے لیے بھی یاد کیا جائے گا۔ دھوتی کرتا، کوٹ، گاندھی چشمہ پہنے اور ہاتھوں میں چھتری پکڑے لکشمن کا گنجا اور ادھیڑ سا 'کامن مین' جیتے جاگتے انسان کی طرح ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ بغیر بولے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس کے خدوخال اس کی بدحالی کی بولتی ہوئی علامتیں ہیں۔ اس کا چھاتا، جو ظلم کی تپش اور مسائل کی بارش سے بچانے کی جھوٹی تسلی کے سوا کچھ نہیں۔ کسی بھی کارٹون میں وہ چھتری کھولتا نہیں۔ لیکن اس کردار کے سہارے آر کے لکشمن نے عام آدمی کے دل میں گھٹ کر رہ جانے والے جذبات کو گویائی بخشی۔ غالب کے لفظوں میں کہیں تو یوں لگتا ہے کہ آر کے لکشمن یہ کردار بھیس بنا کر تماشہ اہل کرم دیکھنے نکلا تھا۔ نصف صدی تک یہ اپنے عجب غضب استفہامیہ انداز سے لوگوں کو ہنساتا اور گدگداتا رہا۔ بظاہر چاہے جتنا کمزور اور بے بس نظر آتا ہو لیکن اس نے اپنے تیور سے اقتدار اور انتظامیہ کو بار بار خوفزدہ کیا ہے۔ ایک بار لکشمن سے پوچھا گیا کہ 'کامن مین' پر عمر کا اثر نہیں؟ ہمیشہ ایک جیسا ہی کیوں نظر آتا ہے؟ لکشمن نے جواب دیا تھا:

''یہ اتنا ہی مستقل ہے جتنا چاند، ستارے اور آسمان۔ یہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں؟ نہیں ہوتے۔ تو پھر کامن مین بھی کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔''

اپنی مخصوص باڈی لینگویج کے سبب آر کے لکشمن کا یہ 'کامن مین' دلوں میں بس گیا۔ اس نے زمان و مکان کی سرحدیں عبور کر کے ایک لافانی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اس کے مجسمے لگتے ہیں۔ اپنے (مہاراشٹر) میں انفوسس انسٹیوٹ میں 'کامن مین' کا آٹھ فیٹ اونچا مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ ممبئی کے ورلی علاقہ میں بھی سمندر کے سامنے 'کامن مین' کا ایک مجسمہ لگایا گیا ہے۔ یہ 'کامن مین' کی مقبولیت ہی نہیں آر کے لکشمن کی کردار نگاری کو سلام ہے۔ یہی نہیں ایک گھریلو ائر لائنس (ڈکن ائرویز) نے 'کامن مین' کو اپنا علامتی نقش بنایا۔ یہ فلموں میں نظر آیا اور ٹی وی سیریل میں بھی۔ ٹائمس آف انڈیا کی تو پہچان ہی بن گیا تھا۔ اخبار کے ایک سو پچاس برس پورے ہونے پر جو یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا تھا، 'کامن مین' اس پر بھی موجود تھا۔ 'کامن مین' کے بعد آر کے لکشمن نے ایک اور کردار کامن مین کا کاجی بھی تخلیق کیا تھا، لیکن اسے وہ شہرت نہیں حاصل ہوئی۔

آر کے لکشمن نے اپنے کام اور کرداروں سے ہم عصر آرٹ اور اظہار کے دوسرے میڈیم پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کے لیے ان کے کردار و آہنگ کا بار بار سہارا لیا گیا۔ ان کے کارٹون بالی ووڈ فلم 'مسٹر اینڈ مسز ففٹی فائیو' اور تمل فلم 'کامراج' میں نظر آئے۔ ٹی وی سیریل 'آر کے لکشمن کی دنیا' کی کہانی آر کے لکشمن کے کارٹونوں کے ارد گرد ہی گھومتی ہے۔ فلم 'کھٹا میٹھا' میں اکشے کمار کا کردار 'کامن مین' سے ہی متاثر ہے۔ ٹی وی سیریل 'مال گڈی ڈیز' میں کرداروں کے کیریکیچر آر کے لکشمن نے ہی بنائے تھے۔ 'ایشین پینٹس' کا 'گٹو' بھی ان کی ہی تخلیق تھا، جو 1954 سے 2002 تک اس کمپنی کا 'ماسکٹ' بنا رہا۔

آر کے لکشمن کے کارٹون میں صحافتی تیور ہوتا تھا۔ انھوں نے غربت، مہنگائی، کالا بازاری، بے روزگاری، بدعنوانی جیسے عوامی مسائل کو موضوع بنایا تو سیاست، صنعت، فلم، کھیل اور بازار کے سیاہ پہلوؤں کو بھی پوری ایمانداری سے آئینہ دکھایا۔ فلم اور سپورٹس اسٹار کے اشتہاروں پر گہرے طنز کیے۔ آر کے لکشمن نے عصری دیس دنیا کو اثر انداز کرنے والے ہر مثبت اور منفی رویوں اور کرداروں کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ان کے نشانے پر رہے سیاسی لیڈر۔ انھوں نے اچھے کام کی تعریف کی تو بے ایمانیوں کے لیے روکا ٹوکا بھی۔ ان کے چبھتے ہوئے کارٹون نے کئی بار لیڈروں کو جھینپنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ ایمرجنسی کے دنوں میں تب کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بار بار ان کے نشانے پر رہیں۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا:

'ہٹلر، مسولنی اور چرچل کا شکریہ۔ انھوں نے مجھے سیاسی کارٹونسٹ بنایا۔ ٹی ایس ایلیٹ، برٹرینڈ رسیل سے لے کر بالی ووڈ اداکار، جن سے میں مل نہیں سکا۔ شکریہ نرسمہا راؤ اور لالو پرشاد یادو جیسے لیڈروں کا، ان سے میری روزی روٹی چلتی رہی۔'

آر کے لکشمن کے کارٹون کی لائنیں اپنے اندر معنی کی ایک دنیا چھپائے ہوتیں۔ ان کے علامتی نقش اسے اور وسعت

بخش دیتے۔ گڈھے دار سڑک، ٹیڑھا لیمپ پوسٹ، تنکا چباتا ٹریفک سپاہی اور بے خوف آوارہ جانور اپنے آپ میں انتظامیہ کی قلعی کھول دیتے۔ ان کے کارٹون سماجی سروکار کی زمین پر کھڑے ہوتے۔ یہ سماج کی باریک تفتیش کرتے۔ ہر لیڈر کے لیے انھوں نے کچھ مخصوص خطوط وضع کر رکھے تھے۔ مثلاً بنا ٹوپی والا گنجا سر نہرو جی، توتے کے ٹونٹ جیسی ناک اندرا جی، لٹکے ہوئے ہونٹ نرسمہا راؤ اور بالوں سے ڈھکے کان لالو یادو کے کارٹون کی بنیادی پہچان تھے۔ معنی خیز لائنیں اور چست درست کیپشن ان کے کارٹون کو دو آتشہ کر دیتا۔

2005 میں جب آر کے لکشمن کو 'پدم وبھوشن' اوارڈ دیا گیا، اس وقت بھی انھوں نے سیاسی لیڈران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا "میں یہ ایوارڈ سیاسی لیڈروں کے ساتھ حاصل کر رہا ہوں، 'میری روزی روٹی آخر کار ان لیڈروں کے بل بوتے ہی چلتی ہے۔' سیاست ہی نہیں، بالی ووڈ اداکار اور کھلاڑی بھی ان کے موضوع بنے۔ انھوں نے امیتابھ بچن، شاہ رخ خان پر بھی کارٹون بنائے اور سنیل گواسکر اور کپل دیو وغیرہ کے بھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"میری زندگی میں کچھ بھی ارادتاً نہیں ہوتا۔ سب کچھ حادثہ جیسا ہوتا ہے۔ میں یہاں فلاسفی، اکونامکس، پالٹکس کا طالب علم ہوں۔ آٹو کریسی، پلیٹو کیسی، ڈیموکریسی، بینکنگ، کرنسی، مہنگائی، ویدانت، سقراط اور پلیٹو سب کچھ پڑھ رہا ہوں۔"

سچا کارٹون حالات حاضرہ میں اپنے آپ میں دانشورانہ مداخلت ہے۔ کارٹون نگاری کا کارنامہ یہ ہے کہ شکار ہونے والا بھی آہ بھر کر مسکرا اٹھے۔ آر کے لکشمن کو اپنے فن میں مہارت حاصل تھی۔ کہتے ہیں ایک کارٹون عصری سماج اور سیاست کی خامیوں کے خلاف احتجاج کی ایک پوری لائبریری ہوتا ہے۔ آر کے لکشمن ایسی ہزاروں، لاکھوں لائبریری چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا رویہ مثبت ہوتا اور مقصد انتہائی مقدس۔ آر کے لکشمن نے کسی کی کھلی نہیں اڑائی۔ ان کے یہاں دہراؤ نہیں نظر آتا۔ ہر بار وہ ایک نئے رخ سے ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے۔ وہ پوری شدت اور سنجیدگی سے مسائل کی جڑ اور واقعے کی روح کو چھونے کی کوشش کرتے:

"اگر اصل زندگی سے آپ کا تعلق نہیں۔ باہر کیا ہو رہا ہے اس کی آپ کو خبر نہیں۔ آپ لوگوں کے برتاؤ اور ان کی سمجھ کو اپنی سمجھ میں ڈھال نہیں سکتے تو آپ کارٹون نہیں بنا سکتے۔"

ہم عصر کارٹونسٹ سے بھی وہ اسی سنجیدگی کا مطالبہ کرتے۔ ایک انٹرویو میں لکشمن نے کہا تھا:

"کارٹون نگاری صرف ڈرافٹسمین شپ نہیں ہے۔ خیال بھی نہیں ہے۔ مزاحیہ طور پر ہی سب لوگ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ جبکہ اس میں مزاح کچھ بھی نہیں۔ کارٹون نگاری سنجیدہ صنف ہے۔ یہ مذاق نہیں ہے۔"

آر کے لکشمن نے اپنے موضوع اور کردار ارد گرد سے ہی اٹھائے ہیں۔ ان کی نگاہیں دور رس تھیں۔ وہ منظر میں وہ دیکھ

لیتے تھے جو عام نگاہوں سے نظر نہیں آتا۔ انھیں خوبیوں نے انھیں وہ بلندی دی جو دوسروں کو نصیب نہیں۔ لیکن یہ سب آسانی سے نہیں مل گیا۔ اس کے لیے انھوں نے تمام مشکلیں جھیلیں۔ کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ وہ جے جے اسکول آف آرٹ میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن انھیں یہ کہتے ہوئے لوٹا دیا گیا کہ ان میں واجب 'ٹیلینٹ' نہیں ہے لیکن دس برس بعد

انھیں اسی اسکول میں ایک پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا۔ آر کے لکشمن نے اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ ایک بار ان پر پابندی لگانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ ایمرجینسی کے دنوں میں سینسر کے بہانے شکنجہ کسنے کی کوشش کی گئی لیکن ان چند استثنا کو چھوڑ دیں تو زیادہ تر لیڈر چاہتے تھے کہ لکشمن ان کا کارٹون بنائیں۔ کئی لوگوں نے تو فرمائش بھی کی۔ 1962 میں چین سے جنگ میں ملی شکست کے بعد لکشمن نے ایک کارٹون میں پنڈت نہرو کی پالیسی پر نشانہ لگایا تھا۔ اس کارٹون میں نہرو جی فریفتہ انداز میں گلاب کا پھول دیکھ رہے ہیں اور بغل میں ان کی کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' رکھی ہوئی ہے۔ طنز صاف تھا مگر بقول لکشمن نہرو نے برا ماننے کے بجائے اس کارٹون کی بڑی کاپی کی فرمائش کی تھی۔

اپنے بھائی آر کے نارائن کی طرح ان کا قلم بھی مضبوط تھا۔ انھوں نے دو انگریزی ناول (ہوٹل ریویرا اور دی مسینجر) بھی لکھے۔ ان کی خود نوشت 'دی ٹنل آف ٹائم' بھی تخلیقی نثر کا نمونہ ہے۔ لیکن ان کا شناخت نامہ ان کی لائنیں ہیں، ان کے کارٹون ہیں۔ آر کے لکشمن اپنے فن میں طاق تھے۔ دنیا نے ان کے ہنر کا لوہا مانا۔ ان کے ہنر اور منفرد رنگ و آہنگ کے لیے انھیں مختلف قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ان میں 'پدم بھوشن'، اور 'رمن میگسیسے' وغیرہ خاص ہیں۔ یہی نہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں میسور یونی ورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی تھی۔ 2000 میں ایک کارٹون نمائش کے لیے بھوپال گئے آر کے لکشمن سے ایک اخبار نویس نے سوال کیا، "کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟" آر کے لکشمن کچھ دیر خاموش رہے پھر جواب دیا تھا۔ "گاڈس بلیوز ان می۔"

کہتے ہیں ایک کارٹون عصری سماج اور سیاست کی خامیوں کے خلاف احتجاج کی ایک پوری لائبریری ہوتا ہے۔ آر کے لکشمن ایسی ہزاروں لائبریری چھوڑ گئے ہیں۔ اسی لیے آج آر کے لکشمن اگرچہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی ان کی آڑی ترچھی لکیریں، سادہ رنگ و آہنگ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے چست اور برجستہ تبصرے کل بھی با معنی تھے اور آج بھی ہیں۔ جب تک سیاسی سماجی حقائق نہیں بدلتے تب تک ان کی معنویت یوں ہی برقرار رہے گی۔

■

Laeeq Rizwi, 96/B 3 Arawali, Sector 34, Noida 20130 (UP)

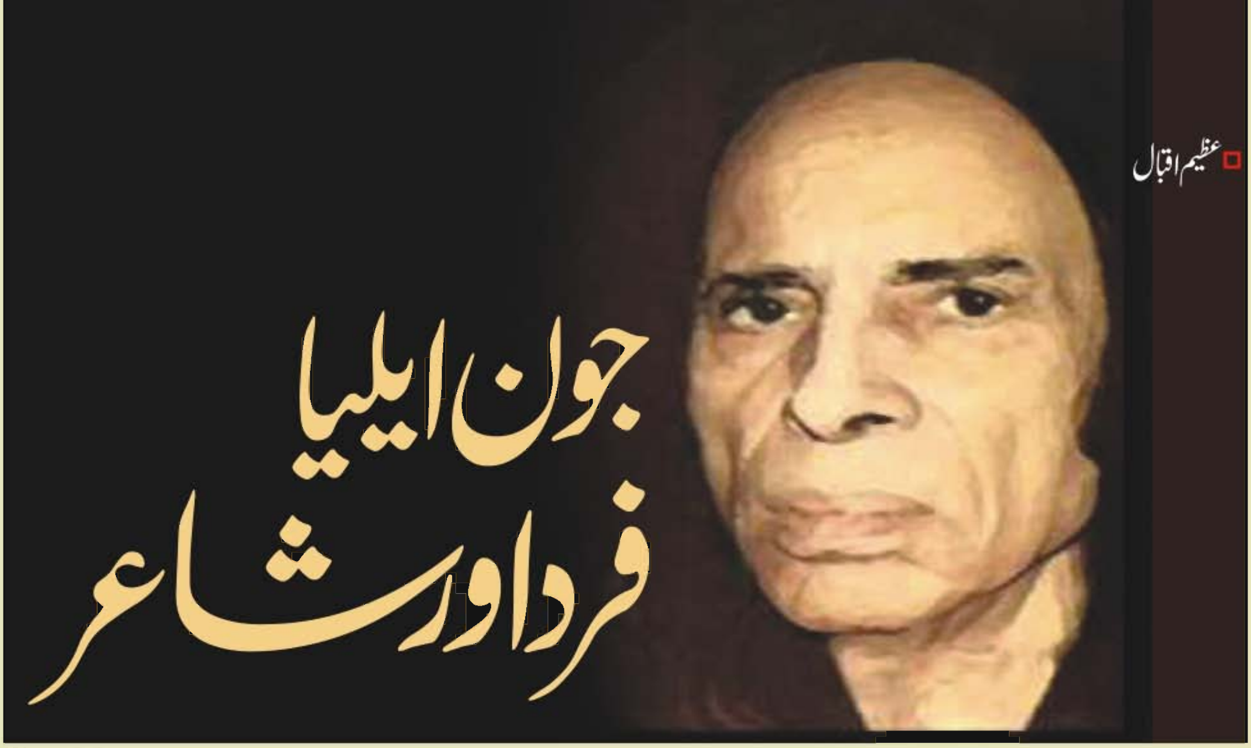

جون ایلیا فرد اور شاعر

عظیم اقبال

اردو ادب سے عمومی اور شعر و شاعری سے خصوصی شغف رکھنے والوں کے لیے 9 نومبر 2002 کا دن بے حد سوگوار تھا۔ اُسی دن ہندو پاک کے خطوں میں یکساں معروف اور عالمی افق پر از حد مقبول شاعر جون ایلیا طویل علالت کے بعد شہر کراچی میں رحلت فرما گئے۔ بہ وقت رحلت ان کی عمر 72 سال تھی۔ ان کے پس ماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں بتائی گئی ہیں۔

جون ایلیا کی شہرت کئی بنا پر رہی۔ وہ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ ایک مدت تک انھوں نے رسالہ ’عالمی ڈائجسٹ‘ کی ادارت کی ذمے داریاں نبھائیں۔ ان کا مجموعہ کلام ’شاید‘ ادبی حلقوں میں ہنگامہ خیز رہا۔ وہ سرزمین ہند (امروہہ) میں پیدا ہوئے اور انھوں نے سرزمین پاک (کراچی) میں آخری سانس لی۔ اپنی زمین سے اُجڑنے کا غم انھیں تاعمر رہا۔ کراچی میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود دم بہ دم وہ امروہہ کی یاد میں کھوئے رہے۔ اپنے بے جڑ ہونے کا احساس انھیں پل پل رہا۔ اپنی مٹی انھیں متواتر آواز دیتی رہی، لیکن یہ مٹی انھیں نصیب نہ ہو سکی! ان کا غم ذاتی بھی تھا اور اس غم کی نوعیت اجتماعی بھی تھی۔ ان کی شمولیت ان ہزار ہا افراد میں رہی، جو اِس احساس سے دوچار رہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ ان کی شاعری ایک طرح سے اس احساس کی ترجمانی بھی ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کے ساتھ منافقت کبھی نہ کی۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا، اُسے صفحۂ قرطاس پر بکھیر بھی دیا۔

جون ایلیا اپنی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کی زندگی میں اس تہذیب کی بڑی اہمیت تھی یہ انوکھی تہذیب تھی، جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ہجرت نے انھیں اپنی تہذیب سے جدا کر دیا۔ یہ جدائی ان کی شخصیت اور شاعری، دونوں کو متاثر کرتی رہی۔ حقیقتِ حال انھی کی زبان سنیے:

بان ندی کے پاس امروہے میں جو لڑکا رہتا تھا
اب وہ کہاں ہے میں تو وہیں ہوں گنگا جی اور جمنا جی

اپنے ماضی سے کٹ کر جینا انھیں پسند نہ تھا۔ خواب و خیال میں ہی نہیں، حقیقت میں بھی وہ اس ماضی سے بار بار جڑتے رہے اور جب جب ایسا ہوا، ان کی زندگی کی تلخیاں اور بھی بڑھ گئیں۔ ماضی سے جڑنا انھیں پسند تھا اور اس جڑنے کے عمل میں وہ مزید سوگوار ہوئے۔ اس کی نشاندہی ان کی بھانجی ہما رضوی یوں کرتی ہیں—

”وہ ہر بار جب کراچی سے آتے تھے بے حد تنہا اور اُداس ہوتے تھے۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ میں بہت ٹوٹ گیا ہوں۔ بے خوابی کا شکار تھے۔ ہمیشہ راتوں کو دیر تک جاگتے رہتے، لکھتے رہتے اور پیتے رہتے اور روتے رہتے تھے۔ اُن کی تنہائی، اُداسی اور مزاج کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔“

یہی وہ گھڑیاں تھیں جو شاعر کو اپنی کم نصیبی پر سوچنے کے لیے مائل کرتی تھیں۔ اس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑتا تھا اور اس کا لہجہ غم ناک بن جاتا تھا۔ بقول عظیم امروہوی:

”جون ایلیا کی شاعری خون تھوکنے اور اندر سے پاش پاش ہونے کے بعد وجود میں آئی ہے۔ ان کی شاعری کا پودا فکر و ہمت کی زمین میں پھوٹ کر تناور درخت بنا ہے۔“

شاعر کی سوچ دیکھیے:

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
دھوپ تھے سائباں کے تھے ہی نہیں
اب ہمارا مکان کس کا ہے
ہم تو اپنے مکاں کے تھے ہی نہیں

ہجرت کے باوجود جون ایلیا ذہنی طور پر ہندوستان کے رہے۔ پھر جب کبھی ہندوستان آئے، یہاں اپنے وقتی قیام سے جتنا خوش ہوئے، اُتنا ہی ناخوش بھی ہوئے— ان کی مٹی انھیں ہمیشہ پکارتی رہی اور اس پکار پر وہ لبیک کہتے رہے، لیکن بیک وقت اس حقیقت سے بھی آشنا رہے کہ اُنھیں دیارِ دگر میں مراجعت کرنی ہے۔ اُن کی یہ سوچ اس شعر سے ظاہر ہے:

مہماں سمجھ کے کیجیے ہم کو نہ یوں اُداس
ہندوستاں میں آئے ہیں ہندوستاں کے تھے

جون ایلیا کی شاعری میں شاعر کی محرومیاں اور ناکامیاں سر اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بقول کمال احمد صدیقی:

”جون ایلیا کی شاعری کا دوسرا نام ناآسودگی ہے۔“

زاہدہ حنا نے جون ایلیا کی شخصیت کی تعمیر سے پردہ اٹھایا ہے۔ کہتی ہیں:

”جون ایلیا نے اپنی ذات میں ایک ایسے شخص کو تعمیر کیا جس کا مسئلہ اس کی اپنی کربلا تھی۔“

اُس کی ذات کی کربلا اُس کی شاعری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ بے شک اس کربلا سے نمٹنے میں شاعر شکست و ریخت سے گزر کر معرفت و آگہی حاصل کرتا ہے۔

جون ایلیا کی معرفت و آگہی اُنھیں دنیا، نہ دنیا کی نیرنگیوں سے بیگانہ و بے نیاز بناتی ہے۔ نہ زندگی کے رنگ و بو سے وہ آنکھیں چراتے ہیں۔ نہ ان سے حاصل کیف و سرور کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق وزیر آغا گویا ہیں:

”جون ایلیا کی شاعری جمنا اور گنگا کا سنگم ہے۔ جمنا کے حوالے سے اس میں بانسری کی لے، بدن کی گرماہٹ، پازیب کی جھنکار اور زرخیز مٹی کی خوشبو ہے۔ یہ سب چیزیں باہم آمیز ہو کر ایک ایسی دل ربا کیفیت پر منتج ہوگئی ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ گنگا کے حوالے سے اس میں کیسا گیان دھیان اور جذب و استغراق ہی نہیں، وقت کی روانی کا شعور اور نیرنگِ جہاں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کا وہ رویہ بھی موجود ہے جو

گیانیوں اور صوفیوں کو ہمیشہ سے عزیز رہا ہے۔''

جون ایلیا کی شاعری مختلف کیفیات، نت نئے تجربات اور گوناگوں مشاہدات کی شاعری ہے۔ بقول عظیم امروہوی:

''ان کی شاعری نہ تفریح طبع کا سامان ہے، نہ کسی خاص مقصد کی تبلیغ، نہ وہ نعرے بازی ہے، نہ چیخ پکار، نہ شعلہ ہے نہ چنگاری بلکہ غور وفکر کی وادیوں میں پہنچ کر خرام ناز کی کیفیت، ستاروں کی چمک اور کلیوں کی چٹک ہے جو تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے۔''

چند مثالیں دیکھیے:

میں تو سودا لیے پھرا سر میں
خاک اُڑتی رہی، مرے گھر میں

مر نہ جاتے، تو اور کیا کرتے
بے تمنا جیا گیا ہی نہیں

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے

کھینچے ہے تصور لب و رخسار کے نقشے
دیکھا نہیں اُس کو مگر آواز سنی ہے

جون ایلیا کے یہاں پختہ شعور کی نشانیاں ہیں تو ناپختہ فکر کی جھلکیاں بھی ہیں۔ ان کے اشعار میں کم سنی کی سوچیں ہیں تو جوانی کی ترنگیں بھی ہیں۔ نارسائی کے شکوے گلے تو ہیں، لیکن یہ سب شائستگی کی حدوں میں ہیں۔ اشعار دیکھیے:

ہے محبت حیات کی لذت
ورنہ کچھ لذتِ حیات نہیں

ترے بھیجے ہوئے تنگ پیرہن کی شمیم
لہو میں آگ لگا کر بدن جلاتی ہے

ترے بغیر مجھے چین کیسے پڑتا ہے
مرے بغیر تجھے نیند کیسے آتی ہے

جو حقیقت ہے اس حقیقت سے
دور مت جاؤ لوٹ بھی آؤ

کسی سے عہد و پیماں کر نہ رہیو
تو اس بستی میں رہیو پر نہ رہیو

مست ہوں میں مہک سے اس گل کی
جو کسی باغ میں کھلا ہی نہیں

جون ایلیا ایسے شاعر ہیں جنھیں تک بندی پر قناعت ہے، نہ سہل پسندی پر۔ شعر گوئی ان کا مشغلہ تو ہے، لیکن مجبوری نہیں۔ ان کی شعر گوئی سے معنی ومطلب کے دفتر کھلیں نہ کھلیں، حیات وزیست کی حقیقتیں ضرور کھلتی ہیں۔ کہتے ہیں:

ہم نے رنجش میں یہ نہیں سوچا
کچھ سخن تو زباں کے تھے ہی نہیں

روح نے عشق کا فریب دیا
جسم کو جسم کی عداوت ہے

ہیں دلیلیں ترے خلاف مگر
سوچتا ہوں تری حمایت میں

اس سے ہر دم معاملہ ہے مگر
درمیاں کوئی سلسلہ ہی نہیں

جون، گویائی میں ضرر تھا بہت
پر لبوں کو سیا گیا ہی نہیں

بن ملے ہی بچھڑ گئے ہم تو
سو گلے ہیں، کوئی گلہ ہی نہیں

لیجیے میں چمن سے جاتا ہوں
اب تو کانٹا چبھا ہوا نہ رہا

جون ایلیا کی شاعری کائنات کی عظمتوں کے بیان کا دم تو نہیں بھرتی، لیکن یہ ذات کی وسعتوں کی داستان سناتی ہوئی ضرور نظر آتی ہے۔ ذکر کائنات پر وہ فکرِ ذات کو یقینا ترجیح دیتی ہے۔ یہ رویہ درست بھی ہے، کیونکہ ذات کے تصور کے بغیر کائنات کا تصور محال ہے۔

جون ایلیا طبعاً ذہین ہیں اور فطرتاً حساس، ان کی ذات کی یہ خوبیاں ان کی شعر گوئی کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ بقول قمر رئیس:

''جون کی تخلیقی ذہانت نے ایک ایسا شعری اسلوب تراشا ہے جو حرف ومعنی کے ارتباط اور احساس وتخیل کے اختلاط سے مالا مال ہے۔''

جون ایلیا کے مزاج میں اختراع پسندی تھی۔ علاوہ ازیں، قافیہ تراشی، زمیں تلاشی اور علامت نگاری میں اُنھیں دسترس حاصل تھی۔ ان کی شاعری میں استعمال کی گئیں تشبیہات نادر الوجود ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

یادیں ہیں یا بلوا ہے
چلتے ہیں چاقو مجھ میں

اس سمندر میں تشنہ کام ہوں میں
بان تم اب بھی بہہ رہی ہو کیا

خواب وخیال و وہم وگماں کچھ نہیں بچا
کیا پوچھتے ہو دل کا زیاں کچھ نہیں بچا
اب کیا دکھاؤں فردِ حساب نبود و بود
بس مختصر یہ ہے کہ میاں کچھ نہیں بچا

ماضی پرستی جون ایلیا کی شخصیت اور فن دونوں پر محیط ہے۔ چھوٹی ہوئی زمین انھیں عزیز ہے تو چھوٹا ہوا رشتہ بھی انھیں عزیز ہے۔ دونوں ہی کی یاد سے وہ خوش ہوتے ہیں تو دونوں ہی کی یاد سے وہ کرب میں بھی مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ کرب آمیز مسرت جون ایلیا کا مقدر ہے۔ کہتے ہیں:

اُس گلی سے جو ہو کے آئے ہیں
اب تو وہ راہبر بھی پیارے ہیں

پھر اس گلی سے اپنا گزر جاتا ہے یہ دل
اب اس گلی کو کون سی بستی سے لاؤں میں

"جون ایلیا اپنی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کی زندگی میں اس تہذیب کی بڑی اہمیت تھی یہ انوکھی تہذیب تھی، جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ہجرت نے انھیں اپنی تہذیب سے جدا کردیا۔ یہ جدائی ان کی شخصیت اور شاعری، دونوں کو متاثر کرتی رہی۔"

آبسے ہیں ترے دیار سے دور
رہنے والے تو ہم وہیں کے ہیں

اے جانِ داستاں تجھے آیا کبھی خیال
وہ لوگ کیا ہوئے جو تری داستاں کے تھے

اپنی غزلوں کی طرح اپنے قطعات میں بھی جون ایلیا نے شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ جذبے اور احساس کی آمیزش نے ان قطعات کو نئی آب وتاب دی ہے۔ کہتے ہیں:

مری جب بھی نظر پڑتی ہے تجھ پر
مری گلفام جانِ دل رُبائی
مرے جی میں یہ آتا ہے کہ مَل دوں
ترے گالوں پہ نیلی روشنائی

میں نے ہر بار تجھ سے ملتے وقت
تجھ سے ملنے کی آرزو کی ہے
تیرے جانے کے بعد بھی میں نے
تیری خوش بو سے گفتگو کی ہے

پاس رہ کر جدائی کی تجھ سے
دور ہوکر تجھے تلاش کیا
میں نے تیرا نشان گم کرکے
اپنے اندر تجھے تلاش کیا

جون ایلیا کی شاعری کا کینوس زیادہ بڑا نہ سہی، معتبر ضرور ہے۔ اس میں فلسفے کی آنچ نہ سہی، دھڑکنوں کی لو ضرور ہے۔ ہجر اور ہجرت جون ایلیا کی شاعری کے دو ناگزیر پہلو ہیں۔ ان کی شاعری میں ہجر کے صدمے کے شانہ بہ شانہ ہجرت کا کرب بھی اُجاگر ہوا ہے۔ ناآسودگی کے ساتھ ساتھ نارسائی ان کا مقدر ہے اور جو کچھ ان کا مقدر ہے، اُسی کی بازگشت ان کی شاعری ہے!

■

Azim Iqbal, Adabistan, Ganj No One,
Bettiah - 845438 (Bihar)

مصنف: آچاریہ چانکیہ
مترجم: شان الحق حقی

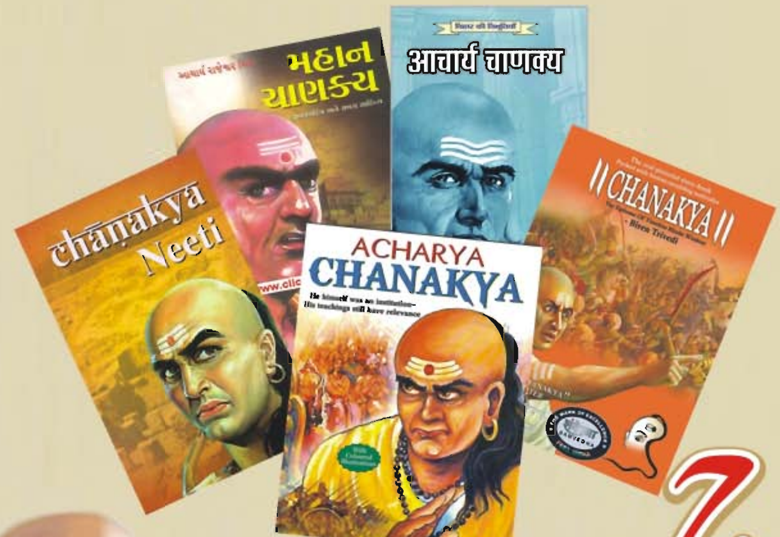

راج کاج

کونسل کے اجلاس کی کارروائیاں

اندرونی اور بیرونی عناصر پر قابو پانے کے بعد راجہ انتظامی امور کی طرف متوجہ ہوگا۔

سوجھ بوجھ سے بنائی ہوئی کونسل میں تمام امور غور وخوض کے بعد طے پاتے ہیں۔ کونسل کی کارروائیاں خفیہ رہنی چاہئیں۔ جن کی بھنک پرندے بھی نہ پاسکیں۔ کیونکہ سنا گیا ہے کہ بعض اوقات طوطوں یا میناؤں نے راز اگل دیا اور کتوں یا دوسرے ذلیل جانوروں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس لیے راجہ اچھی طرح رازداری کا یقین کر لینے کے بغیر کونسل میں لب کشائی نہ کرے۔

جو کوئی مشوروں کو طشت از بام کرے، اس کے ٹکڑے اڑا دیے جائیں۔

راز کے فاش ہونے کا پتہ ایلچیوں، وزیروں اور سرداروں کے چہروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ نیت کا فرق انداز کے فرق سے ظاہر ہو جاتا ہے اور انداز کا آئینہ چہرہ ہوتا ہے۔

کونسل کے معاملات کی رازداری اور جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا ان کی نگرانی اس وقت تک جاری رکھی جائے گی جبکہ عملدرآمد کا آغاز ہو۔

بے خیالی، مخموری، سوتے میں بڑبڑانا، عشق و آشنائی اور کونسلروں کی دوسری بدحرکات عموماً راز کے افشا ہونے کا سبب بنتی ہے۔

گھنّی طبیعت کا یا دل جلا آدمی عموماً افشائے راز کرتا ہے۔ اس لیے مشوروں کو راز میں رکھنے کے لیے پوری احتیاط کی ضرورت ہے۔ رازوں کے افشا ہونے سے راجہ اور اس کے ساتھیوں کو نہیں، دوسروں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔

لہٰذا ''بھر دواج کہتا ہے۔ راجہ خفیہ معاملات پر خود ہی غور کرے، کیونکہ وزیروں کے اپنے وزیر (یا مشیر) ہوتے ہیں اور پھر اُن کے مشیروں کے بھی اپنے مشیر۔ اس طرح واسطہ در واسطہ راز دور تک پہنچ جاتا ہے۔

'لہٰذا' کوئی دوسرا آدمی بادشاہ کے ارادے سے باخبر نہ ہونے پائے صرف وہی اس سے واقف ہو جن کے ذریعے سے کام کرنا ہے، وہ بھی اس وقت جب کام کا آغاز ہو یا اختتام کو پہنچے۔''

وِشالاکُش کا کہنا ہے کہ ''کوئی تجویز جو صرف ایک آدمی کے ذہن کا نتیجہ ہو کامیاب نہیں ہوسکتی۔ راجہ کے دل میں جو ارادہ ہو اس کے کچھ چھپے اور کچھ کھلے اسباب (نتائج) ہوسکتے ہیں اور دونوں پر غور کرنا ہوگا۔ نظر سے چھپی ہوئی باتوں کو خیال میں لانا اور جو کچھ نظر آرہا ہے اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنا اور جس امر میں دو راہیں ممکن ہوں ان کے بارے میں شکوک رفع کرنا اور جزوی

مشاہدے سے کل مسئلے کی بابت حکم لگانا۔ یہ سب وزیر ہی حل کرسکتے ہیں۔ لہٰذا راجہ ایسے لوگوں کو ساتھ بٹھا کر غور وخوض کرے گا جن کی نظر اور ذہن وسیع ہو۔

وہ کسی کو حقیر نہیں گردانے گا، بلکہ سب کی سنے گا۔ عاقل آدمی بچے کے منہ سے نکلی ہوئی معقول بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔"

پراشر کہتا ہے کہ اس طرح دوسروں کی رائے دریافت ہوگی مگر اس میں رازداری کہاں رہی۔

وہ اپنے وزیروں کی رائے کسی ایسے امر میں طلب کرے جو اس امر کے مماثل ہو جو اس کے دل میں ہو۔ وہ کہے گا "یہ بات یوں ہے۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا اور ایسا ہو تو کیا کرنا چاہیے۔"

پھر وہ ان کی رائے کی روشنی میں فیصلہ کرے گا۔ اگر ایسا ہو تو مشورہ بھی مل جائے اور رازداری بھی قائم رہے۔

پِشنا کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں "نہیں، کیونکہ اگر وزیروں سے بعید بات کے لیے رائے مانگی جائے یا کسی تکمیل شدہ یا کسی غیر تکمیل شدہ (فرضی) منصوبے کی بابت پوچھا جائے تو وہ نیم دلی سے رائے دیں گے پوری دلچسپی سے نہیں۔ یہ بہت بڑی قباحت ہے۔ لہٰذا وہ ایسے افراد سے مشورہ کرے جو صائب الرائے ہوں اور جو مسئلہ درپیش ہے اس کی بابت فیصلہ کی بات کہہ سکیں۔ اس طرح مشورہ لیا جائے تو اچھی رائے بھی ملے گی اور رازداری بھی قائم رہے گی۔

جی نہیں۔ کوٹلیہ اس سے اختلاف کرتا ہے، کیونکہ اس طرح تو مشاورت کا سلسلہ لامتناہی ہوگا۔ وہ تین یا چار منتریوں سے رائے طلب کرے۔ پیچیدہ معاملات میں کسی ایک سے مشورہ شاید فیصلہ کن ثابت نہ ہو۔ تنہا ایک وزیر بے دھڑک اور ہماہمی کے ساتھ بات کرتا ہے۔ دو سے بات کی جائے تو شاید وہ متفق الرائے ہوکر بادشاہ کو مجبور کردیں یا آپس میں الجھ کر معاملے کو مخدوش بنادیں، لیکن تین یا چار وزیروں سے بات کرنے میں ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی، اور خاطر خواہ نتیجہ نکل سکے گا۔ چار سے زیادہ وزیر ہوئے تو فیصلہ بڑی مشکل سے ہوسکے گا اور رازداری کا بھی بھروسا نہیں

ہنگامی صورت میں راجہ اپنے وزیروں نیز مجلس وزرا کو بلائے گا اور ان کو صورت حال سے آگاہ کرے گا۔ وہ اکثریت کی رائے پر عمل کرے گا۔ کسی کارروائی کے دوران میں اس کے کسی مخالف کو اُس کے رازوں کی خبر نہ ہوگی لیکن وہ خود ان کی کمزوریوں سے واقف ہوگا۔ وہ کچھوے کی طرح اپنے اعضا خول کے اندر سمیٹ لے گا۔ جس طرح پرکھوں کو نذر کیا جانے والا کھانا کسی ایسے شخص کے ہاتھوں سے جو ویدوں سے ناواقف ہو، سمجھدار آدمی کے لیے کھانا ٹھیک نہیں۔

ہوگا۔ بعد میں وہ وقت موقع اور مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے اپنی صوابدید کے مطابق ایک یا دو وزیروں سے بھی مشورہ کرسکتا ہے یا خود ہی فیصلہ کرسکتا ہے۔

کونسل کے غورطلب مسائل یہ ہیں۔ بہت سے لوگوں اور بہت سے مال کو قابو میں لانا، کسی کام کے وقت اور مقام کا

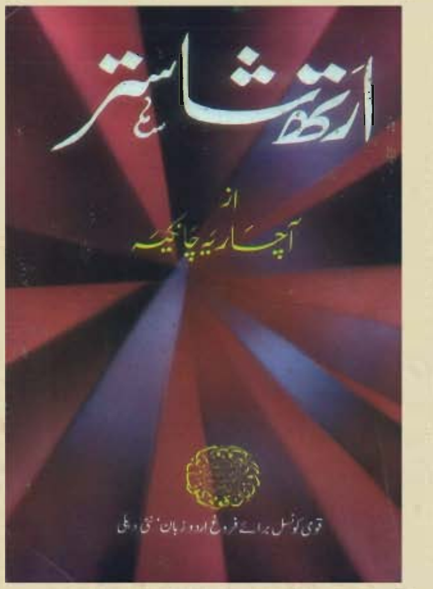

تعین، خطرات کا تدارک، کامیابی کی تدابیر۔

راجہ اپنے وزیروں سے رائے مانگے۔ خواہ فرداً فرداً خواہ سب سے ایک ساتھ اور ان کی لیاقت کا اندازہ اُن کے دلائل سے لگائے۔

وہ موقع آنے پر تاخیر روا نہ رکھے اور ان لوگوں کے ساتھ جنھیں چوٹ دینی ہے گفت وشنید کو طول نہ دے۔

منو کے ہم خیال کہتے ہیں کہ وزیروں کی کونسل (منتری پریشد) میں بارہ آدمی ہونے چاہئیں۔ برہسپت کے حامیوں کا خیال ہے کہ سولہ ہوں۔

اُشانس کے مکتبِ فکر والے بیس کی تعداد کے حق میں ہیں۔ مگر کوٹلیہ کے خیال میں ارکان اتنے ہونے چاہئیں جتنا کہ راجدھانی کی ضروریات کا تقاضا ہو۔

یہ وزرا اپنے راجہ اور اس کے دشمن سے تعلق رکھنے والے تمام امور کو زیر غور لائیں گے۔ وہ اس کام کا جو شروع نہ کیا گیا ہو آغاز کریں گے، جو جاری ہو اس کی تکمیل کریں گے، اور جو مکمل ہو چکا ہو اس میں اور بہتری پیدا کرنے کی سوچیں گے۔

وزیر اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ مل کر کام کی نگرانی کرے گا جو اس کے قریب ہوں، اور جو دور ہوں ان سے احکام و پیغام کے ذریعے مشورہ طلب کرے گا۔

اندر کی مجلس وزرا میں ایک ہزار گیانی ہیں۔ وہ اس کی آنکھیں ہیں۔ اسی لیے اُسے 'ہزار چشم' کہا جاتا ہے، حالانکہ اُس کے چہرے پر صرف دو آنکھیں ہیں۔

ہنگامی صورت میں راجہ اپنے وزیروں نیز مجلس وزرا کو بلائے گا اور ان کو صورت حال سے آگاہ کرے گا۔ وہ اکثریت کی رائے پر عمل کرے گا۔ کسی کارروائی کے دوران میں اس کے کسی مخالف کو اُس کے رازوں کی خبر نہ ہوگی لیکن وہ خود ان کی کمزوریوں سے واقف ہوگا۔ وہ کچھوے کی طرح اپنے اعضا خول کے اندر سمیٹ لے گا۔

جس طرح پرکھوں کو نذر کیا جانے والا کھانا کسی ایسے شخص کے ہاتھوں سے جو ویدوں سے ناواقف ہو، سمجھدار آدمی کے لیے کھانا ٹھیک نہیں۔

اسی طرح جو کوئی بھی علم سے بے بہرہ ہو وہ کونسل کے سوچ بچار کو سننے کا مستحق نہیں۔

سفیروں کا کام

جو کوئی کونسلر کے طور پر کامیاب رہا ہو وہ سفارت کے لائق ہے، جو کوئی وزیر کے منصب کی اہلیت رکھتا ہو وہ نائب سفیر ہوگا۔ جو اس سے چوتھائی کم قابلیت کا حامل ہو وہ کسی خاص مشن پر نمائندہ (ایجنٹ) بن کر جاسکتا ہے جس کی لیاقت نصف ہو وہ شاہی ایلچی بن سکتا ہے۔

سفیر اپنی سواری، سامان سفر، ہمراہی ملازمین اور خوراک کا اعلیٰ بندوبست کرنے کے بعد سفارت پر روانہ ہو، اور سوچتا رہے کہ "دشمن سے یہ بات کہی جائے گی، وہ اس پر یہ کہے گا، اس کا یہ جواب دیا جائے گا، اور یوں اُسے قائل کیا جائے گا۔"

سفیر دشمن کے افسروں سے دوستی پیدا کرے گا، مثلاً ان سے جو ویران، علاقوں، سرحدوں اور شہروں اور ضلعوں کے حاکم ہوں۔ وہ دشمن کے فوجی ٹھکانوں، لاؤلشکر اور مورچوں کا اپنے راجہ کی انھی چیزوں سے مقابلہ کرے گا۔ وہ قلعوں اور ریاست کے رقبے اور وسعت کی تحقیق کرے گا، نیز خزانوں اور دوسرے ٹھکانوں کی بابت بھی اور پتہ چلائے گا کہ کہاں

حملہ کارگر ہوسکتا ہے کہاں نہیں۔

اجازت حاصل کرنے کے بعد وہ راجدھانی میں داخل ہوگا اور اپنے آنے کا ٹھیک وہی مقصد بیان کرے گا جس کی ہدایت کی گئی ہوگی، خواہ اس میں جان ہتھیلی پر رکھنی پڑے۔

شگفتہ لہجہ، چہرے اور آنکھوں کی چمک، پرتپاک خیر مقدم، دوستوں کی خیریت دریافت کرنا، گن بیان کرنے میں شریک ہونا، تخت کے قریب جگہ دینا، ملاحظے سے پیش آنا، واقف کاروں کو یاد کرنا اور بات چیت کو خیر و خوبی سے ختم کرنا۔ ان سب باتوں سے خلوصِ نیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہو تو خفگی و ناراضگی کا۔

بگڑے ہوئے دشمن سے یوں خطاب کیا جائے۔

’’سفیر بادشاہ کی زبان اور ترجمان ہوتے ہیں، نہ صرف آپ کے سفیر بلکہ اوروں کے بھی۔ اس لیے انھیں ہتھیاروں کی زد میں بھی وہی کہنا ہوتا ہے جس کی انھیں ہدایت کی گئی ہو، اور خواہ غیر سہی، موت کے مستحق نہیں ہوتے۔ برہمن ذات کے سفیروں کو تو مارنے کا ویسے بھی جواز نہیں۔ یہ میری اپنی تقریر نہیں۔ یہ (جو کچھ میں دوہرا رہا ہوں) فرض کے طور پر ادا کر رہا ہوں۔

سفیر اپنی عزت افزائی پر پھولے گا نہیں اور وہاں اس وقت تک رہے گا جب تک رخصت کی اجازت نہ ملے۔ وہ دشمن کے دبدبے سے مرعوب نہیں ہوگا۔ عورتوں اور شراب سے یکسر پرہیز کرے گا۔ اکیلا سوئے گا، کیونکہ معلوم ہے کہ سفیروں کے ارادے سوتے میں یا نشے کی حالت میں جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وہ فقیروں اور تاجروں کے بھیس میں کام کرنے والے جاسوسوں اور ان کے چیلوں کے ذریعے یا وید طبیب یا مذہب سے پھرے ہوئے افراد کا روپ بھرے ہوئے مخبروں کے ذریعے یا دونوں طرف سے تنخواہ پانے والوں کے ذریعے پتہ چلائے گا کہ اس کے مالک کے طرفداروں نیز مخالف گروہوں کے درمیان کیا سازشیں چل رہی ہیں اور تحقیق کرے گا کہ پبلک اس دشمن راجہ کی کس حد تک وفادار ہے، اور یہ کہ اس کی دکھتی رگیں کونسی ہیں۔

اگر براہِ راست اس قسم کی گفتگو کا موقع نہ ہو (یعنی وفاداری جانچنے کے لیے) تو وہ بھکاریوں، شرابیوں، پگلوں یا سونے میں بڑبڑانے والے اشخاص کی طرف کان لگا کر یا تیرتھوں وغیرہ میں دکھائی دینے والی علامات و مظاہر کے ذریعے یا تصویروں اور خفیہ تحریروں سے مطلب اخذ کرکے حقائق کو جاننے کی کوشش کرے۔

اس طرح جو باتیں معلوم ہوں ان کو دوسری ترکیبوں سے پرکھا جائے۔ اس کے اپنے راجہ کے اختیار اور طاقت کی بابت جو اندازے لگائے جائیں وہ ان پر رائے زنی نہیں کرے گا۔ صرف اتنا کہے گا کہ ’’تم تو سب کچھ جانتے ہی ہو۔‘‘ نہ وہ ان تیاریوں کا کوئی ذکر کرے گا جو اس کے راجہ نے اپنے حصولِ مقصد کے لیے کی ہوں گی۔

اگر وہ اپنی سفارت کے مقصد میں کامیاب نہ ہو اور پھر بھی ٹھہرایا جائے تو وہ اس کا مطلب سمجھنے کے لیے اس طرح غور کرے گا۔

’’یا تو مجھے اس لیے روکا گیا ہے کہ اِس نے اُس خطرے کا احساس کرلیا ہے جو میرے راجہ کو درپیش ہے، یا یہ خود کسی خطرے سے بچنا چاہتا ہے، یا یہ ہمارے کسی عقبی دشمن کو جس

سفیر اپنی عزت افزائی پر پھولے گا نہیں اور وہاں اس وقت تک رہے گا جب تک رخصت کی اجازت نہ ملے۔ وہ دشمن کے دبدبے سے مرعوب نہیں ہوگا۔ عورتوں اور شراب سے یکسر پرہیز کرے گا۔ اکیلا سوئے گا، کیونکہ معلوم ہے کہ سفیروں کے ارادے سوتے میں یا نشے کی حالت میں جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ فقیروں اور تاجروں کے بھیس میں کام کرنے والے جاسوسوں اور ان کے چیلوں کے ذریعے یا وید طبیب یا مذہب سے پھرے ہوئے افراد کا روپ بھرے ہوئے مخبروں کے ذریعے یا دونوں طرف سے تنخواہ پانے والوں کے ذریعے پتہ چلائے گا کہ اس کے مالک کے طرفداروں نیز مخالف گروہوں کے درمیان کیا سازشیں چل رہی ہیں اور تحقیق کرے گا کہ پبلک اس دشمن راجہ کی کس حد تک وفادار ہے، اور یہ کہ اس کی دکھتی رگیں کونسی ہیں۔

کی سرحد میرے راجہ کی سرحد سے ملی ہوئی ہے۔ یا دور ہے اور کچھ دوسرا علاقہ بھی درمیان میں پڑتا ہے، میرے راجہ کے خلاف اکسا رہا ہے، یا یہ میرے راجہ کی ریاست میں بغاوت پھیلانے کی سوچ رہا ہے۔ یا کسی وحشی قبیلے کے سردار کو ایسی ہی شے دے رہا ہے، یا یہ اپنے کسی دوست یا کسی بڑے راجہ سے جس کی ریاست میرے راجہ کی ریاست سے ملحق ہے کام لینا چاہتا ہے یا یہ اپنی ریاست میں کسی ہونے والی بغاوت کو فرو کرنے یا کسی بیرونی حملے یا قبائلی یلغار کو روکنے کی فکر میں ہے یا یہ میرے راجہ کے منصوبے کے مقررہ وقت کو ٹالنا چاہتا ہے یا یہ اپنی قلعہ بندیوں کی درستی کے لیے مسالہ جمع کر رہا ہے یا مدافعت کے لیے ایک مضبوط فوج اکٹھی کرنے والا ہے یا اپنی فوجی تربیت کو مکمل کرنے کی مہلت چاہتا ہے یا بیرونی اتحادی پیدا کرنے کی کوشش میں ہے تاکہ اس خطرے سے جو اُس نے غفلت سے کھڑا کردیا ہے نجات حاصل کرسکے۔‘‘

پھر وہ موقع کے مطابق یا تو ٹھہرا رہے یا بھاگ نکلے یا مطالعہ کرے کہ اس کے سفارتی مشن کا جلد تصفیہ کیا جائے۔

یا دشمن کو دھمکی دینے کے بعد، اپنی جان کے خوف یا قید سے بچنے کے بہانے بلا اجازت ہی روانہ ہوجائے، ورنہ ممکن ہے کہ اُسے سزا دی جائے۔

سفارتی پیغام رسانی، معاہدات کی تعمیل، الٹی میٹم حوالے کرنا۔ دوست پیدا کرنا، سازش، تفرقہ اندازی، عزیزوں یا قیمتی جواہر کو اڑا لانا، جاسوسوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا، معاہدہِ امن کی خلاف ورزی، دشمن کے ایلچیوں اور افسروں کو توڑنا۔ یہ ایلچی (راج دُوت) کے کام ہیں۔

راجہ ان کاموں کے لیے اپنے خاص ایلچی مقرر کرے گا اور خود کو مخالف ایلچیوں کی کارروائی سے بچنے کے لیے حریف ایلچی، جاسوس اور کھلے یا خفیہ محافظ تعینات کرے گا۔

راجکماروں کی نگرانی

اپنے آپ کو پہلے اپنی بیویوں اور بیٹوں کی طرف سے محفوظ کرلینے کے بعد ہی راجدھانی کے تحفظ کی فکر کرسکے گا جس کو قریبی یا بیرونی دشمنوں سے خطرہ درپیش ہوسکتا ہے۔

ہم بیویوں کے تحفظ کی بابت ’حرم کی نسبت سے ذمہ داریاں‘ کے زیرعنوان بحث کریں گے۔

راجہ اپنے بیٹوں کی پیدائش کے وقت سے اُن پر خاص نظر رکھے گا۔

’کیونکہ‘ بھردواج کہتے ہیں ’’شہزادے کیکڑوں کی طرح اپنے جنم دینے والوں کو کھاجانے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔‘‘ جب ان میں محبت و اطاعتِ فرزندانہ کا فقدان پایا جائے تو انھیں بہتر ہے کہ چپکے سے سزا دے دی جائے۔‘‘

وشالاکشہ کا خیال ہے کہ ’’یہ ظلم ہے۔ کھتری کے پوت کو تباہ کرنا اور اس کی تقدیر کو ملیا میٹ کرنا ہے۔ اس لیے اُن کو کسی خاص جگہ کے محافظوں کی نگرانی میں رکھنا بہتر ہوگا۔‘‘

پراشر کے مکتبِ فکر کا کہنا ہے کہ ’’یہ تو ایسا ہے جیسے آستین میں سانپ پالنا کیونکہ راج کمار یہ سوچے گا کہ اس کے باپ نے خطرے کے احساس سے اُسے بند کر رکھا ہے، اور وہ خود اسے اپنی آغوش میں بٹھانے (باپ کی جگہ لینے؟) کی کوشش کرے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ راجکمار کو سرحدی محافظوں کی نگرانی میں یا کسی قلعے کے اندر رکھا جائے گا۔

پُشنہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایسا ہے جیسے بھیڑوں کے ریوڑ میں بھیڑیے کا خوف۔ (گیرولا۔ جیسے مینڈھا حملہ کرنے سے پہلے دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے ک: جیسے لڑا کا مینڈھے کا خطرہ) اپنے دور پھینکے جانے کا مطلب بھانپ کر وہ سرحدی محافظوں کے ساتھ (باپ کے خلاف) گٹھ جوڑ کرسکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اُسے اپنی عملداری سے بہت دور کسی بیرونی راجہ کے قلعے میں بند کیا جائے۔

کونُڑ پدنت کا قول ہے کہ ''یہ بچھڑے کی مثال ہوتی ہے کیونکہ جس طرح گوالا بچھڑے کو ساتھ رکھ کر دودھ دوہتا ہے۔ اسی طرح بیرونی راجہ راجکمار کی مدد سے اس کے باپ کو موس لے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ راجکمار اپنی ننھیال میں رہے۔''

وات ویادھی کہتے ہیں کہ ''یہ تو جھنڈے کی مثال ہے کیونکہ راجکمار کے ننھیالی رشتہ دار اس جھنڈے کو لہرا کر اَدتی اور کوشک کی طرح مانگتے ہی چلے جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ راجکمار کو عیش و عشرت میں پڑا رہنے دیا جائے، کیونکہ عیاش پوت اپنے خطاپوش پتا سے بیزار نہیں ہوتے۔''

کوٹلیہ کہتا ہے کہ ''یہ تو زندہ درگور کرنا ہوا، کیونکہ کوئی شاہی گھرانا جس کے راجکمار یا راجکماری عیاشی میں پڑے ہوں بیرونی حملے کی تاب نہیں لاسکتا اور گھن کھائی لکڑی کی طرح ڈھے جاتا ہے) لہٰذا جب رانی بلوغ کی عمر کو پہنچے، پجاری اندرو بر، ہسپتی کو مقررہ نذر پیش کریں۔

جب وہ حاملہ ہو تو راجہ زمانۂ حمل اور ولادت کی خودنگرانی کرے۔ ولادت ہونے کے بعد طُہر کی بابت مقررہ رسوم ادا کریں۔

جب راجکمار بڑا ہو تو لائق اتالیق اس کی تربیت کریں۔''

آمبھیہ (سیاسی مفکروں کا ایک گروہ) کہتے ہیں کہ اس کے ہم سبقوں میں سے کوئی جاسوس، راجکمار کو شکار، قمار بازی، شراب نوشی اور عورتوں کی طرف رغبت دلائے اور اسے اپنے پاپ کے خلاف اکسائے اور راج پاٹ پر قبضہ کرنے کی شہ دے۔ دوسرا مخبر اُسے ایسے ارادے سے باز رہنے کی تلقین کرے۔''

کوٹلیہ کہتا ہے کہ کسی معصوم جان کو بری باتوں کی طرف بھٹکانے اور ورغلانے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہوسکتا۔

جس طرح ایک صاف ستھری چیز کسی دوسری چیز سے مس ہوکر داغدار ہوسکتی ہے، اسی طرح ایک شہزادہ جس کا ذہن تازہ اور ناپختہ ہو، جو کچھ سنے گا اس پر یقین کرے گا۔ اس لیے اُسے صرف نیکی کی ترغیب دی جائے۔ صحیح اقدار سکھائی جائیں، بدی اور بے مغز باتوں کی تلقین نہ کی جائے۔ اس سے ہم سبق جاسوس اس کے ساتھ تپاک برتیں اور کہیں کہ ہم تیرے وفادار ہیں جب وہ جوانی کے تقاضے سے عورتوں کی طرف نظر کرے تو طوائفیں، آریہ (شریف) بن کر راتوں کو اکیلی جگہ اسے ڈرائیں (ک: متنفر کرائیں) اگر شراب کا شوق کرے تو اسے ایسی شراب پلا کر بددل کیا جائے جس میں 'یوگ پان' (خاص خواب آور نشی مشروب) ملا ہوا ہو؛ اگر جوئے کی طرف راغب ہو تو مخبر دھوکے باز بن کر اُسے بددل کریں؛ اگر شکار کا شوق رکھے تو جاسوس اسے ڈاکو بن کر ڈرائیں اور اگر اپنے راجہ پتا کے خلاف کھڑا ہو تو رفیق بن کر اُسے خوش اسلوبی کے ساتھ اس ارادے سے باز رکھیں اور کہیں کہ ''راج صرف راج کرنے کی خواہش سے ہاتھ نہیں آتا، اگر تو ناکام ہوا تو مارا جائے گا۔ کامیاب ہوا تب بھی جہنم میں جائے گا اور خلقت تیرے باپ کی موت پر سوگ منائے گی اور اکیلے ڈھیلے کو (مراد تیری ذات) غارت کردے گی۔

جب بادشاہ کا ایک ھی لڑکا ھو جو یا تو دنیوی لذتوں سے محروم رکھا گیا ھو یا بہت لاڈلا ھو، تو اسے بادشاہ زنجیر میں رکھے۔ اگر اس کی کئی اولادیں ھوں تو وہ ان میں سے بعض کو ایسے راج میں بھیج دے جھاں وارثِ تخت موجود نہ ھو، نہ پیدا نہ پیٹ میں۔اگر راجکمار اچھے اطوار اور پسندیدہ خصلت رکھتا ھو تو اسے فوج کا سپہ سالار بنایا جائے گا یا ولی عھد مقرر کردیا جائے۔بیٹے تین قماش کے ھوتے ھیں۔ بہت ذھین، کند ذھن، بدطینت، جو نیکی اور اچھی اقدار کی بابت سکھائی ھوئی باتوں پر عمل کرے، وہ ذھین شمار ھوگا؛ جو ان پر عمل نہ کرے وہ کند ذھن کھلائے گا، اور وہ جو خود کو جوکھوں میں ڈالے اور اچھے اعمال اور اچھے اخلاق سے متنفر ھو وہ بدطینت ھوگا۔

جب بادشاہ کا ایک ہی لڑکا ہو جو یا تو دنیوی لذتوں سے محروم رکھا گیا ہو یا بہت لاڈلا ہو، تو اسے بادشاہ زنجیر میں رکھے۔ اگر اس کی کئی اولادیں ہوں تو وہ ان میں سے بعض کو ایسے راج میں بھیج دے جہاں وارثِ تخت موجود نہ ہو، نہ پیدا نہ پیٹ میں۔

اگر راجکمار اچھے اطوار اور پسندیدہ خصلت رکھتا ہو تو اسے فوج کا سپہ سالار بنایا جائے گا یا ولی عہد مقرر کردیا جائے۔

بیٹے تین قماش کے ہوتے ہیں۔ بہت ذہین، کند ذہن، بدطینت، جو نیکی اور اچھی اقدار کی بابت سکھائی ہوئی باتوں پر عمل کرے، وہ ذہین شمار ہوگا؛ جو ان پر عمل نہ کرے وہ کند ذہن کہلائے گا، اور وہ جو خود کو جوکھوں میں ڈالے اور اچھے اعمال اور اچھے اخلاق سے متنفر ہو وہ بدطینت ہوگا۔

اگر راجہ کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہ اسی (مؤخرالذکر) قماش کا ہو تو کوشش کی جائے کہ اس کے ہاں ایک اولاد اور ہو، یا اس کی بیٹیوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوں۔

اگر وہ بہت بوڑھا اور اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہو تو اپنے کسی ننھیالی عزیز یا قریبی عزیز یا ہمسایہ حکمرانوں میں سے کسی خوش اطوار حکمراں کو اپنے باغ میں بیج بونے کے لیے مقرر کرے (یعنی اپنی بیوی کو اس سے حاملہ کرائے)۔

لیکن کسی بدخصلت شہزادے کو ہرگز گدی پر نہ بٹھایا جائے۔

راج پتا جو بہت سے لوگوں کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ اپنے بیٹے کا خیرخواہ ہوگا۔ عام حالات میں جبکہ کوئی خطرہ نہ ہو، بڑے بیٹے کی وراثت کو قبول کیا جاتا ہے۔ راج بعض صورتوں میں پورے قبیلے کی وراثت ہوتا ہے کیونکہ اجتماعی حکومت ناقابل تسخیر ہوتی ہے اور لاقانونیت کی خرابیوں سے مبرا ہونے کی بنا پر پائیدار ہوتی ہے۔

زیرنگرانی شہزادے کا کردار اور چارۂ کار

شہزادہ خواہ تکلیف میں رکھا گیا ہو، یا دشوار کام پر لگایا گیا ہو، پھر بھی اپنے باپ کا وفادار رہے، سوائے اس صورت میں کہ اس کام میں جان کا خطرہ ہو یا رعیت کے بھڑ جانے یا کسی اور مصیبت کا امکان ہو۔ اگر اسے کسی ستھرے باوقار کام پر لگایا جائے تو وہ اپنے نگران کار کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ کام کو توقع سے بڑھ کر خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرے اور اس کو حاصل راجہ کو نذر کرے، بلکہ اس سے کچھ زیادہ بھی جو اس نے اپنی لیاقت سے پیدا کیا ہو۔ اگر راجہ اس سے پھر بھی خوش نہ ہو اور کسی دوسرے شہزادے یا دوسری بیویوں پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو تو وہ راجہ سے بن باس کی اجازت مانگے۔

اور اگر اسے قید یا قتل کیے جانے کا ڈر ہو تو کسی ہمسایہ ریاست کے حکمراں کی پنا حاصل کرے جو نیک دل، مہربان اور قول کا سچا مانا جاتا ہو، چالاک عیار نہ ہو، بلکہ شریف مہمانوں کے ساتھ مدارات سے پیش آتا ہو۔ وہاں رہ کر وہ ساتھی بنائے اور رقم جمع کرے۔ ذی اثر لوگوں کے ساتھ ازدواجی رشتے داریاں قائم کرے، اور نہ صرف وحشی قبائل کے ساتھ اتحاد کرے بلکہ اپنے ملک میں بھی مختلف گروہوں کو توڑنے کی کوشش کرے یا اکیلا اور اپنے بل پر رہ کر سونے یا جواہر کی کان کنی کرے یا سونے چاندی کے زیورات تیار کرے یا اور

کوئی صنعت اختیار کرے۔ 'اُدھرمی' باشندوں' کے ساتھ ربط ضبط بڑھائے جو سمندری تجارت کرتے اور بڑے رئیس ہوتے ہیں، پھر مدن رس کے زہر سے ان کو ٹھکانے لگا دے اور ان کی دولت پر قبضہ کر لے، لیکن برہمن کی دولت پر ہاتھ صاف نہ کرے، یا ایسے طریقے اختیار کرے جن سے کسی بیرونی راجہ کے دیہاتوں پر قبضہ کیا جا سکے یا وہ اپنے باپ کے خلاف اپنی ماں کے ملازمین کے ذریعے کارروائی کرے۔

یا وہ نقاش، بڑھئی، درباری بھاٹ، وید، مسخرے یا ادھرمی کا بھیس بنا کر اور دوسرے ایسے ہی بھیس بدلے ہوئے ساتھیوں کو لے کر موقع پاتے ہی ہتھیاروں سے لیس اور زہر ساتھ لیے، راجہ کے سامنے آدھمکے، اور اس سے یوں کہے۔

میں ولی عہد ہوں۔ تمھارے لیے مناسب نہیں کہ تنہا اس ریاست پر قابض رہو جبکہ ہم دونوں اس میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ یا جب دوسرے بھی اس میں شرکت کا حق رکھتے ہوں۔ مجھے دگنا وظیفہ دے کر دور پھینک دینا روا نہیں۔

زیرِ عتاب شہزادے کے ساتھ حسب ذیل کارروائیاں ممکن ہیں اس کے مخبر یا اس کی ماں، سگی یا منہ بولی، صلح صفائی کرا کے اسے دربار میں واپس بلوائے۔

یا خفیہ ایجنٹ ہتھیار اور زہر لے کر معتوب اور مردود شہزادے کو مروا دیں۔ اگر وہ بالکل رد نہ کر دیا گیا ہو تو اسے کارگزار عورتوں کے ذریعے یا نشہ پلا کر یا شکار کے ہنگام میں گرفتار کر کے دربار میں بلا لیا جائے۔

اس طرح واپس بلا کر بادشاہ اس سے یہ کہہ کر صفائی کر لے کہ وہ اس کے بعد گدی نشین ہوگا (یعنی راجہ کی موت کے بعد) اور اسے کسی خاص جگہ نظر بند رکھا جائے یا اگر راجہ کے اور لڑکے ہوں تو سرکش کو دیس نکالا دے دیا جائے۔

والیِ مملکت کے فرائض

اگر بادشاہ مستعد ہو تو اس کی رعیت بھی سرگرم ہوگی۔ اگر وہ لاپرواہ ہو لوگ بھی نہ صرف اتنے ہی لاپرواہ ہو جائیں گے بلکہ اس کے کاموں کو اور بگاڑیں گے۔ علاوہ ازیں لاپرواہ بادشاہ کو دشمن آسانی سے مغلوب کر لیں گے۔ چنانچہ بادشاہ کو ہر وقت مستعد اور چوکنا رہنا چاہیے۔

وہ دن اور رات کو آٹھ 'نلکیوں' میں تقسیم کرے گا (فی نلکی ڈیڑھ گھنٹہ) یا سائے کے طول کے مطابق تقسیم کرے گا (یعنی دھوپ گھڑی کی مدد سے) تین 'پرش' کے برابر سایہ (36 انگل یا 3/4 انچ) ایک پرش (12)، 4 انگل (3)؛ سائے کا غائب ہونا نصف النہار یا زوال کے وقت کو ظاہر کرے گا۔ یہ ہیں زوال سے پہلے کے چار پہر۔ دوپہر کے بعد اسی طرح الٹی ترتیب سے چار پہر بنیں گے۔

اس تقسیم اوقات میں سے، دن کے پہلے آٹھویں حصے میں وہ محافظ کھڑے کر کے، آمد و خرچ کا حساب دیکھے گا، دوسرے حصے میں وہ شہریوں اور دیہاتیوں دونوں کے معاملات پر توجہ کرے گا، تیسرے حصے میں وہ نہانے اور کھانا کھانے کے علاوہ مطالعہ بھی کرے گا، چوتھے حصے میں وہ نہ صرف مالیہ سونے کے سکے میں وصول کرے گا بلکہ منتظمین کے تقرر بھی کرے گا، پانچویں حصے میں اپنے وزیروں کی مجلس سے ملاقات کرے گا اور مخبروں کی فراہم کردہ خفیہ اطلاعات وصول کرے گا، چھٹے حصے میں وہ اپنے شوق کی تفریحات میں مشغول ہوگا یا غور و فکر میں وقت گزارے گا؛ ساتویں حصے میں وہ ہاتھیوں، گھوڑوں رتھوں اور پیدل فوج کے انتظام کی طرف توجہ دے گا۔ آٹھویں حصے میں وہ اپنے سپہ سالار کے ساتھ فوجی کارروائیوں کے منصوبوں پر صلاح مشورہ کرے گا۔

ایوان میں بیٹھ کر جہاں مقدس آگ جل رہی ہوگی وہ ویدوں (طبیبوں) راہبوں کے معاملات پر توجہ کرے گا۔ اس میں اس کا بڑا بچاری اس کے ساتھ رہے گا اور راجہ عرض داشت سننے سے پہلے (فریادوں کو) پرنام کرے گا۔ تینوں ودیائیں پڑھے ہوئے شخص کو ساتھ لے کر نہ کہ تنہا، کہ کہیں درخواست گزار برا نہ مانیں، وہ تپسیا کرنے والے سادھوؤں نیز جادو منتر اور یوگا کے ماہروں کے معاملات پر نظر کرے گا۔

دن چھپے وہ شام کی عبادت (سندھیہ) سے فارغ ہوگا۔ رات کے پہلے 1/8 حصے میں وہ خفیہ خبر رسانوں سے ملاقات کرے گا، دوسرے حصے میں اشنان کرے گا، کھانا کھائے گا اور مطالعہ کرے گا؛ تیسرے حصے میں وہ نفیریوں کی آواز کے ساتھ خواب گاہ میں داخل ہوگا اور چوتھے پانچویں حصے میں استراحت کرے گا۔ چھٹے حصے میں وہ شاستروں کی ہدایات اور ان کے فرائض پر غور کرے گا۔ ساتویں حصے میں وہ اٹھ کر انتظامی کارروائیوں پر غور کرے گا اور مخبروں کو اپنے کام پر روانہ کرے گا۔ رات کے آٹھویں حصے میں وہ بڑے پجاری کی آشیرواد لے گا، اور اپنے طبیب، رکابدار اور جوتش سے ملے اور گائے اور اس کے بچھڑے اور بیل کے گرد پھرنے اور انھیں پرنام کرنے کے بعد دربار میں داخل ہوگا۔

یا وہ اپنی تاب و طاقت کے مطابق اوقات میں تبدیل کر کے اپنے فرائض کو انجام دے سکتا ہے۔

دربار میں آنے کے بعد وہ درخواست گزاروں کو دروازے پر کھڑا نہیں رکھے گا، کیونکہ اگر بادشاہ خود کو رعیت کی پہنچ سے دور رکھے اور اپنا کام بیچ کے آدمیوں پر چھوڑ دے تو ہمیشہ قباحت پیدا ہوتی ہے۔ پبلک بددل ہوتی ہے اور دشمن کو اسے زک پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔

لہٰذا وہ بذاتِ خود دھرم (دیوتاؤں) یا ادھرمیوں کے معاملات، ویدداں برہمنوں، مویشیوں، مقدس مقامات، نابالغوں، ضعیفوں، مجبوروں، دکھیاروں نیز عورتوں کے معاملات سنے گا۔ یا تو اس ترتیب سے جو یہاں بیان کی گئی ہے یا پھر فوری ضرورت واہمیت کے لحاظ سے۔

فوری اہمیت کے معاملات وہ فوراً سنے گا اور انھیں آئندہ کے لیے اٹھا نہیں رکھے گا کیونکہ ملتوی ہو جانے کے بعد وہ اور بھی دشوار اور ناقابل حل ہو جائیں گے۔

ایوان میں بیٹھ کر جہاں مقدس آگ جل رہی ہوگی وہ ویدوں (طبیبوں) راہبوں کے معاملات پر توجہ کرے گا۔ اس میں اس کا بڑا بچاری اس کے ساتھ رہے گا اور راجہ عرض داشت سننے سے پہلے (فریادوں کو) پرنام کرے گا۔

تینوں ودیائیں پڑھے ہوئے شخص کو ساتھ لے کر نہ کہ تنہا، کہ کہیں درخواست گزار برا نہ مانیں، وہ تپسیا کرنے والے سادھوؤں نیز جادو منتر اور یوگا کے ماہروں کے معاملات پر نظر کرے گا۔

بادشاہ اس عہد کا مذہباً پابند ہے کہ جلد عمل کرے، اپنے فرائض کو خاطر خواہ طور پر ادا کرے، خصوصاً قربانی کے سلسلے میں اور دان دکشنا، اشنان وغیرہ کے معاملے میں سب کے ساتھ ایک سا سلوک کرے۔

اس کی خوشی اس کی رعیت کی خوشی میں مضمر ہے، اس کی فلاح، ان کی فلاح و بہبود میں۔ بھلی بات وہ نہیں جو اُسے بھائے، بلکہ وہ جو اس کی رعایا کو پسند آئے۔

چنانچہ راج کا والی ہمیشہ مستعد اور مصروف کار رہے گا، اپنے فرائض کو ادا کرنے میں غفلت نہیں برتے گا۔ کیونکہ دولت کی بنیاد عمل پر ہے اور عمل کے فقدان کا نتیجہ خرابی۔ عمل کے بغیر ہاتھ آئی ہوئی دولت بھی ہاتھ سے جائے گی اور آنے والی بھی ہاتھ نہ آئے گی۔ عمل کی بدولت وہ اپنے دلی مقاصد بھی حاصل کر سکے گا اور دولت بھی۔ ■

ماخذ: ارتھ شاستر، مصنف: آچاریہ چانکیہ، مترجم: شان الحق حقی، سنہ اشاعت: 1999، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سیدہ شانِ معراج

ہولی - یکجہتی کی علامت

ہندوستان رنگوں، زبانوں اور ثقافتوں کا ایک وسیع و عریض نگارخانہ ہے جس میں مختلف رنگ ونسل کے لوگ مختلف بولیاں بولتے ہیں، مختلف مذاہب کی پیروی کرتے ہیں اور مختلف النوع تہذیبی روایتوں کے علمبردار ہیں لیکن اس رنگارنگی کے باوجود ہندوستان مشترک تہذیب کا ایک بے مثال گلشن ہے اور یہاں کے رہنے والے مختلف راستوں پر گامزن ہونے کے باوجود ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ یک جہتی اور ہم آہنگی کی ڈور کو ہم سب مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستان کی اس منفرد خصوصیت کے، دنیا کے بڑے مورخ اور دانشور بھی قائل ہیں اور شاہد بھی—

اصطلاحی طور پر قومی یک جہتی کی ترکیب نئی ہے لیکن جن معنوی عناصر سے یہ وجود میں آئی ہے وہ ہمیشہ ہندوستان کی رَگوں میں خون بن کر دوڑتے رہے ہیں۔ قومیت کی تعریف کرتے ہوئے لارڈ برائس نے اپنا خیال پیش کیا، ''قوم وہ آبادی ہے جو زبان وادب، تصورات اور رسم ورواج جیسے رشتوں سے اس طرح بندھی ہوئی ہے کہ وہ اپنی ٹھوس اکائی کو محسوس کرے۔''

ارنسٹ رینسان کا خیال ہے کہ ''قومیت کا تصور، نسل، مذہب، زبان مملکت، تہذیب یا اقتصادی مفادات کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ عظیم افراد، صحیح عظمت اور مشترکہ تجربات ایک قومیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔'' اس طرح یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قومیت کا تصور بنیادی طور پر داخلی ہوتا ہے، اس کی بنیاد نفسیاتی اور جذباتی ہوتی ہے۔ اس کے مظاہر میں علاقائی وحدت، نسلی اور لسانی ہم آہنگی ہوتی ہے جو قوم کی تشکیل کرتی ہے۔

کلچر کا لفظ لاطینی لفظ 'کولرے' سے بنایا گیا ہے جس کے معنی خلق کرنے کے ہیں۔ کلچر کی بنیاد کے سلسلے میں نسل، مذہب، جغرافیائی حد بندی اور اقتصادی ضروریات کے نام سامنے آتے ہیں۔ ایک ہی نسل کے لوگ مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے مزاج اور مذاق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ دوسری بات یہ کہ نسل کی بنیاد، رنگ، جسم کی ساخت اور کھال پر ہوتی ہے اور یہ تمام باتیں جغرافیائی حالات کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔

تہذیب زندگی کی اس تنظیم کا نام ہے جو ایک متمدن سماج کو ممکن بناتی ہے۔ تہذیب سماج کی وہ تنظیم ہے جو کلچر کے لیے حالات پیدا کرتی ہے۔ اس لیے بغیر تہذیب کے 'کلچر' نہیں ہوسکتا۔ 'کلچر' کی صحیح تعریف یوں بھی ہوسکتی ہے یعنی 'کلچر' انسان کی اُن تخلیقی کاوشوں کو کہیں گے جو نظامِ حیات کی ترتیب و تنظیم کرتی ہیں جس کے اثرات ارتقائی طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستان کا جغرافیہ دونوں اس اعتبار سے قابلِ غور ہیں کہ بیک وقت یہ مختلف قوموں میں تقسیم بھی نظر آتا ہے اور ایک متحدہ قوم بن کر بھی ابھرتا ہے گویا 'کثرت ہی میں وحدت' کی بہتر مثال پیش کرتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے ہر دور میں یکجہتی کی مختلف علامتیں رہی ہیں۔ اگر وادیِ سندھ کی تہذیب کے زمانے میں لباس، رہن سہن، معاشرہ قدرے مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں تو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں سیاسی اور قومی وحدت کی شکل اختیار کی۔ پنڈت نہرو لکھتے ہیں:

''ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہندوستان میں مشترکہ خصوصیات، عادات، طرزِ رہائش، فنکارانہ ذوق اختیار کیا تھا،

خاص طور سے شمالی ہندوستان میں موسیقی، نقاشی، تعمیرات، کھانا پینا اور ملبوسات وغیرہ مشترکہ روایات تھیں۔ وہ مل جل کر امن و آشتی کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے تیوہاروں میں شرکت کرتے تھے۔ ایک زبان بولتے تھے۔ ایک طرح سے رہتے تھے اور ایک طرح کے اقتصادی مسائل کا سامنا کرتے تھے۔

سید برادران کے سید عبداللہ خاں بسنت اور ہولی دونوں ساتھ مناتے تھے۔ میر جعفر اور سراج الدولہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ ہولی کھیلتے تھے۔ دولت راؤ سِندھیا سبز کپڑے پہن کر اپنے افسروں کے ہمراہ محرم کے جلوس میں شرکت کرتے تھے۔ سماجی حالات نے قومی یکجہتی کے شعور کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔

تیوہار انسانی ثقافت کے فطری اظہار کا وسیلہ ہیں۔ عام طور سے تمام تیوہار مذہب کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیب و تمدن کی دین بھی ہوتے ہیں۔ ہولی کو ہی لے لیجیے جس کا پس منظر دسہرہ، دیوالی اور شیوراتری کی طرح مذہبی بھی ہے اور ایک مخصوص جغرافیائی اور تمدنی روایات کا عکاس بھی۔ 'پرہلاد اور ہولیکا' کی روایت سے کون واقف نہ ہوگا۔ اسی کے ساتھ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ ہولی آمدِ گرما سے متعلق سرخوشی اور کیف و سرور کا خوبصورت اعلان بھی ہے۔

مذہبی حیثیت سے قطع نظر ہولی کا سماجی اور موسمی پس منظر بڑا قدیم اور رنگارنگ ہے۔ ہندوستانی روایات اور اساطیر میں اسے سب سے زیادہ رنگین تیوہار مانا گیا ہے اور سب سے زیادہ مقبولیت بھی حاصل ہے۔ اس کی سماجی مقبولیت اور کشش کا سبب یہ ہے کہ اسے عقائد اور مشرب کے لحاظ کے بغیر سبھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی طور پر اس کی مسرتوں اور رنگینیوں میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو کسی بھی مذہب کے ہوتے ہوئے، انسانیت، رواداری، مساوات، اور بھائی چارے کے آفاقی مذہب کے بھی پیرو ہیں اور انسانی برادری کے خوشی اور غم کو اپنی خوشی اور غم سمجھتے ہیں۔ جو دوسروں کی خوشی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور انھیں غمگین دیکھ کر ان کی غمگساری اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ہندوستانی زبان کا ادیب و شاعر اس سے قطع نظر کہ وہ کسی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو، اس ہفت رنگ تیوہار کے کیف و رنگ، سرشاری و مستی میں چور نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والی دوسری زبانوں کی طرح اردو نے بھی ہولی کی رنگارنگی، سرشاری اور سرمستی، رقص و سرور، ساز و نغمہ کی جھنکاریں اپنے اندر کہیں شاعری کی

میرتقی میر کو بھی اپنی ہندوستانیت عزیز تھی اور اس ہندوستانی طرز فکر کی وجہ سے انھیں بھی یہاں کے تیوھاروں سے دلچسپی رھی۔ ان تیوھاروں کے تذکرے میں اپنے دور کے سماجی اور تھذیبی میلانات کی نمائندگی کرتے ھیں۔ ان کی ھولی عام شعرا کی ھولی سے بالکل الگ حیثیت رکھتی ھے اس لیے کہ اس کے ذریعے لکھنؤ کا وہ مشترکہ 'کلچر' سامنے آجاتا ھے جس میں بادشاہ اپنے مذھب کا پابند رھتے ھوئے بھی دوسرے مذھبی فرقوں کے مذھبی تیوھاروں میں حصہ لیتا ھے۔

شکل میں سموئی ہیں اور کہیں افسانوں اور قصوں کے رنگ میں ڈھالی ہیں۔ میر، انشا، نظیر اکبرآبادی، داراشکوہ اور محمد علی قطب شاہ جیسے شاعروں نے اور دانشوروں نے جہاں اسلامی تیوہاروں پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے وہیں اپنی شاعری کا زیادہ حصہ 'بھکتی شاعری' کی طرح 'کرشن' کے لیے بھی وقف کیا ہے۔ ہولی کی خوشی کا جو بہترین عملی اظہار ہوسکتا ہے اس کا ذکر نہ صرف امراء کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے بلکہ ہندوستانی عوام کس طرح سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ان کی تمام حرکات و سکنات کی جزئیات تک کو نظم کیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے ہولی کو ایک سیکولر تیوہار مانا ہے:

نظیر ہولی کا موسم جو جگ میں آتا ہے
وہ ایسا کون ہے ہولی نہیں مناتا ہے
کوئی تو رنگ چھڑکتا ہے کوئی گاتا ہے
جو خالی رہتا ہے وہ دیکھنے کو جاتا ہے

میرتقی میر کو بھی اپنی ہندوستانیت عزیز تھی اور اس ہندوستانی طرزِ فکر کی وجہ سے انھیں بھی یہاں کے تیوہاروں سے دلچسپی رہی۔ ان تیوہاروں کے تذکرے میں اپنے دور کے سماجی اور تہذیبی میلانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی ہولی عام شعرا کی ہولی سے بالکل الگ حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے لکھنؤ کا وہ مشترکہ 'کلچر' سامنے آجاتا ہے جس میں بادشاہ اپنے مذہب کا پابند رہتے ہوئے بھی دوسرے مذہبی فرقوں کے مذہبی تیوہاروں میں حصہ لیتا ہے۔ نواب آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے ہیں اور ان کے ساتھ تمام رعایا ہولی کھیلتی ہے۔ جب یہ سماں طاری ہوتا ہے تو نواب کی نذر کے لیے اہلِ فرنگ آتش بازی لے کر آتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان حکمراں صرف رسمی طور پر ہولی نہیں مناتے تھے بلکہ اسے اپنا خاص تیوہار مانتے تھے۔ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود آصف الدولہ کا یہی وصف ہے جو انھیں زندہ رکھے گا۔ نواب آصف الدولہ ایامِ بہار میں ہر سال ہولی مناتے تھے۔ ہندوؤں کی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے اس قسم کے کھیل تماشوں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ میرتقی میر کی مثنوی ان باتوں کو اجاگر کرتی ہے:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ محبت سے عجب ہیں خرد و پیر
برگِ گل ملواں اڑاتے تھے عبیر
تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر

ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ مسلمان بادشاہوں اور امراء نے بھی اڑتے گلال، سرشار جذبوں اور بھیگتے پیراہنوں کے اس تیوہار کی ایک بہت پرانے ایرانی تیوہار 'نوروز' سے مماثلت بخوبی محسوس کی ہے اور اسے اپنی مسرتوں میں شامل کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں

تیوہاروں میں بڑی حد تک مشترکہ قدریں پائی جاتی ہیں۔ ونوں تیوہاروں کے پس منظر میں موسم ہے۔ دونوں میں راگ رنگ کی اہمیت ہے۔ دونوں خوشی اور انبساط کے پیغامبر ہیں۔ دونوں شاہ و گدا کے فاصلے کو کم کرتے ہیں۔ دونوں میں اجتماعی مسرت اور بھائی چارے کی مہک پائی جاتی ہے۔

ہولی اپنی اسی اجتماعیت کی روح کی بنا پر اور یک جہتی کی علامت کی حیثیت سے بیجاپور، گولکنڈہ اور اودھ کے درباریوں میں بلاتخصیص مذہب وملت بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی رہی ہے۔ ہولی کے تیوہار کی تہہ میں جو اخلاص ومحبت پنہاں ہے، اس نے تصوف کے حوالے سے ہماری صوفیانہ شاعری کو بھی متاثر کیا ہے۔ بے شمار معروف اور نسبتاً کم معروف صوفی شاعروں کے وہاں 'ہولی رنگ' والہانہ جذبات اور انسانی اخوت کے جوش کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب حقیقی کے روبرو اپنی اندرونی کیفیات کے اظہار کا ایک بے حد موثر وسیلے کے طور پر برتا گیا ہے۔

آج بھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر مذہبی فرقوں کے لوگوں کے درمیان ہولی مجلسی ربط اور اتحاد کا حسین موقع فراہم کرتی ہے۔ ہولی کے موقعوں پر لوگ اپنے احباب کے یہاں جاتے ہیں۔ میزبان اپنے مہمان کی حسب استعداد تواضع کرتا ہے۔ لوگ ٹولیاں بنا کر ہولی ملنے، عبیر لگانے آتے ہیں۔ جس چوپال پر جاتے ہیں، صاحبِ خانہ ان کا منہ میٹھا کرتا ہے۔ یہ رسمیں آج بھی ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں زندہ ہیں اور ان سے اجتماعی اخوت کی خوشبو آتی ہے۔ ملت ومشرب کی تفریق مٹ جاتی ہے اور سب ہندوستانی نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کی وہ حسین خصوصیت ہے، جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکی ہوں کہ ہمارا ملک جس مرکز پر چاہتا ہے، یک جہتی کا رخ اختیار کر لیتا ہے اور رنگ ونسل، زبان ومذہب کے تمام فرق اس کے سامنے جیسے معدوم ہو جاتے ہیں۔

شمالی ہندوستان کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر فائز دہلوی کے مجموعۂ کلام میں بھی ہولی سے متعلق ایک مختصر نظم ملتی ہے جس کے مطالعے سے ہولی کا سماں آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے:

چاند جیسا ہے شفق بہتر عیاں
چہرہ سب کا از گلال آتش فشاں
جوں جھڑی برسو ہے پچکاری کی دھار
ناچتی ہیں ناریاں بجلی کے سار

فائز دہلوی کا ذکر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' میں بھی کیا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی ہولی سے متعلق نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہولی کو ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھا تھا بلکہ ہولی کے رنگ کو اپنے خون میں بھی شامل کر لیا تھا۔ اسی لیے اس کے منانے کے موقعے اور مناسبت سے وہ بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ ایک نظم کے کچھ بند درجِ ذیل ہیں:

ہر خاطر کو خرسند کیا پر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار، گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے
یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حسن بتاؤں ہولی کی
سب ابرق تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھا ٹھنکا
ہنس دینا ہر دم، ناز بھرا، دکھلانا سج دھج شوخی کا
ہر آن خوشی میں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں

نظیر اکبرآبادی کی ہولی سے متعلق دوسری نظموں کا بھی یہی عالم ہے۔ دورِ متوسطین میں انشائ، رنگین، امانت، شاہ تراب کاکوروی اور بہادر شاہ ظفر کی بھی ہولی سے متعلق نظمیں موجود ہیں۔

1875 میں احمد علی شوق نے ہولی سے متعلق ایک نظم لکھی تھی۔ شوق کی اس نظم سے اس وقت منائی جانے والی ہولی کے پھیکے پن کو آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شوق نے بڑی ایمانداری سے عکاسی کر دی ہے — شوق کی نظم سے ہولی سے متعلق شعرا کے محسوسات میں آ جانے والے فرق کی واضح جھلک سامنے آ جاتی ہے—

گرانی میں اب کے جو آئی ہے ہولی
نیا سوانگ میں سوانگ لائی ہے ہولی
جلایا تھا جس طرح سوکھے نے ہم کو
اسی طرح ہم نے جلائی ہے ہولی
گرانی سے پہلے سے پھیری تھی جھاڑو
مگر پھانکنے خاک آئی ہے ہولی

اردو شاعری میں ہولی کی مقبولیت اور اہمیت کا یہ عالم ہے کہ شعرا اسے استعارے کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ دورِ حاضر میں علی جواد زیدی کی ایک نظم کا تذکرہ ضروری ہے جس میں انھوں نے انگریزی سیاست کے ہاتھوں ہندوستانیوں کے ستائے جانے اور ان کے خون بہائے جانے کے واقعات کو ہولی کے رنگوں سے استعارہ کر کے بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے:

پہلے زمانہ اور تھا، مے اور تھی، دور اور تھا
وہ بولیاں ہی اور تھیں
وہ ٹھولیاں ہی اور تھیں
وہ ہولیاں ہی اور تھیں
لیکن مرے پیرِ مغاں
کل تو نیا انداز تھا
اک دور کا تھا خاتمہ، اک دور کا آغاز تھا
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں
نکلے بنا کر ٹولیاں
ہنستے چلے گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے دنیا کو نہلاتے چلے
توڑ ر گیا اے دلِ شکن پیرِ مغاں
کتنا بھیانک خواب تھا
تعبیر کچھ بھی ہو مگر
تیرے وفاداروں نے کل
کس آن سے، کس بان سے، کس شان سے
کھیلی گلابی ہولیاں

ہولی کی برکت سے درونِ ملک پیدا ہونے والی یکجہتی کے علاوہ بحران اور دشمن سے مقابلے کے وقت بھی یہ تیوہار ہمارے اتحاد کا موثر وسیلہ بن سکتا ہے، اس صورت میں ملکی محاذ جنگ پر لڑنے سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ مذہبی، صوبائی، لسانی اختلافات مٹا دیے جائیں۔ ■

Sayyada Shane Meraj, Tareen Takli,
Shahjahanpur - 242001 (UP)

محمود شیخ

بیان کی تلاش

انسانی تاریخ میں لفظوں کی اختراع جذباتی سائنس کا محیرالعقل کارنامہ ہے جس کے ذریعے انسان نے اپنی شخصیت و کردار کو اظہاریت سے ہمکنار کیا اور رشتوں کو نام دے کر ان کی اجتماعی تدوین اور پہچان مرتب کی تھی۔ حیرت انگیز سچائی یہ ہے کہ اس نے زبان کے توسط سے ایک ایسا بین الاقوامی نظم شعور کیسے مرتب کرلیا جس کے مقصد و مفہوم میں گہری یکسانیت پائی جاتی ہے۔ زبان خواہ کوئی ہو دنیا کے تمام خطوں میں 'ماں' کی شفقت و محبت کو انسان ہی نہیں حیوان بھی پہچانتے ہیں۔ مادری زبان کی کوئی لکھاوٹ اور بولی مخصوص نہیں ہے لیکن اسے دنیا کی ہر قوم سمجھتی ہے۔ شیر خوار بچے کے معصوم اشاروں کی زبان سے بھی اسے واقفیت ہوتی ہے۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ ایک مخصوص عورت ہی اس کی ماں کیوں ہے؟ لیکن وہ اسے اس کے جذبۂ مادریت سے پہچانتا ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن کے رشتے جذبۂ ایثار سے استوار ہوتے ہیں جن کی صداقت کو دنیا کی تمام زبانوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے مگر ان کی جذباتی تفہیم میں کوئی انتشار و اختلاف نہیں ہوتا۔ ایک عورت خواہ اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، متمول ہو یا غریب اس کا وجود بذات خود رشتوں کی تعمیر و تجسیم کی نمائندہ حقیقت ہے۔ اسے کسی فلسفیانہ شہادت اور نظریاتی (Theoritical) گواہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے جذباتی اعمال ہی رشتوں کی حقیقت کا پتہ دیتے ہیں۔ خاندان اور معاشرہ ماؤں کے جذبۂ ایثار اور قربانیوں کا ثمر ہیں۔ اگر ماں نہ ہوتی تو خاندان اور معاشرہ بھی نہ ہوتا، رشتے نہ ہوتے، ان کی پہچان بھی نہ ہوتی، زبان نہ ہوتی اور وہ الفاظ بھی نہ ہوتے جن سے تہذیب و تمدن کو شعور و بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ جذبہ عشق و محبت اور خیر انسانیت کا آخری نشان بھی وہی ہے۔ مردانہ حاکمیت (Male dominated society) کا تصور مفلوک الحال اور فلسفہ زدہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔ سماج ایک فطری ادارہ ہے جسے فطرت و کائنات کے نسائی شعور نے ترتیب دیا ہے۔ سیاسی معاشرہ چونکہ مردانہ اذہان کی اختراع ہے اس لیے امیر و غریب، عاقل و جاہل، مالک و مزدور کا تصور پایا جاتا ہے۔ نظم کائنات، خاندان اور معاشرے کی تشکیل، انسان اور حیوان کا وجود قانونِ سیاست کا نہیں قانونِ قدرت کا پابند ہے۔ کائنات کی ہر شے کا نظمِ عمل جذبۂ مادریت (Mother Hood) سے معمور ہے۔ آفتاب کی مرکزیت، زمین کی گردش، دریا کی روانی، سمندر کی خاموشی، دریا کا سکوت، گلوں کی نزاکت اور انسان کی انسانیت سب فطرت و کائنات کے مرتب کردہ

ضابطۂ حیات کی زنجیر میں محبوس ہیں جسے عرفِ عام میں تقدیر کہا جاتا ہے۔ انسان مجبورِ محض بھلے ہی نہ ہو قانونِ قدرت کا پابند ضرور ہے۔ لیکن فلسفی اور فنکار کائنات اور انسان کو جمہوری نظم سیاست کا محکوم دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس نے آج تمام دنیا میں اخلاق و کردار کا بحران پیدا کردیا ہے۔

سیاسی معاشرے کا قیام فطرت و کائنات کے مرتب کردہ اصول و ضابطوں پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ سیاسی فلسفیوں کی ذہنی اپج ہے جس کے درو بست کے لیے وقتاً فوقتاً سیاسی ضابطے اور نظریات کو فروغ دیا جاتا ہے، جو اکثر قانونِ قدرت سے متصادم ہوتے ہیں، اور انسان اپنی اخلاقی ذمے داریوں سے سبکدوش ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً قانونِ قدرت کے مطابق مرد و زن ایک ضابطۂ اخلاق کے مطابق زن و شو کے رشتے سے منسلک ہوکر خاندانی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن عقل کے نزدیک نکاح کی ذمے داری قبول کیے بغیر بھی عورت و مرد جنسی حظ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم جنسی حالانکہ غیر اخلاقی اور غیر فطری طرزِ عمل ہے جسے حیوانی سماج میں بھی قبول نہیں کیا جاتا لیکن بعض ترقی یافتہ ممالک اسے قانونی شکل دے کر حیات و معاشرت کے فطری تقاضوں کو فراموش کرتے ہیں جس سے نظم زندگی کا اخلاقی معاشرتی شعور عقلی دلائل کے آگے کمزور ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جس طرح ہوا، پانی اور روشنی کو قید کیا ہے وہ قدرت کے مرتب کردہ تمام ڈکشن کو اپنی خواہشاتِ نفسی کے مطابق استعمال کرنا چاہتا ہے۔ غلط اور صحیح سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ سائنسی اور عقلی طور پر درست عقائد کا اخلاقی طور پر درست ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ انسان کی اس بہیمیت کے سبب اور اوزون میں سوراخ، دریائی اور فضائی آلودگی میں ہولناک اضافہ ہوگیا ہے، تعمیریت کا یہی تخریبی شعور زبان و ادب و فن کی تمام صورتوں میں در آیا ہے۔ جس نے بیان کی شفافیت کو مجہول فلسفیانہ نظریات کے ذریعے آلودہ کردیا ہے۔ جذبہ و احساس کی فطری صداقتوں پر نفسیاتی شعور حاوی ہے جس کی زبان و بیان کو سائنٹفک اندازِ تحریر سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ جذباتی سائنس اور مادیاتی سائنس دونوں کے بنیادی نہج جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں۔ جذبات قدرت کے عطا کردہ نظامِ شعور کے مطابق پروان چڑھتے ہیں اور سائنسی فہم تکنیکی مہارت سے نشوونما حاصل کرتی ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی شعور خواہشاتِ نفسانی پر منحصر ہوتا ہے لیکن انسانی زندگی کا ارتقائی عمل آفتابی روشنی اور حرارت پر مشتمل ہے۔ دونوں کا لسانی شعور بھی مختلف ہوتا ہے۔ دنیا میں جس قدر سائنس اور سیاست کے فلسفے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ زبان و بیان کی فطری سمجھ اور شعور کے چشمے بھی خشک ہورہے ہیں۔

عالم تمام ذاتِ مطلق کا مظہر ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اظہاریت ہی بیان ہے۔ اظہار کی دو خاص قسمیں ہیں ایک وہ جسے رنگ اور ہیئت سے پہچانا گیا دوسری پہچان حسی ہے جس سے حواسِ خمسہ کے ذریعے متعارف ہوا جاتا ہے۔ جذباتِ انسانی کا وجود ایک فطری عمل ہے جیسے آفتاب اور زمین کا عمل مختص ہے۔ زمین آفتاب کے گرد اور آفتاب اپنے محور پر گردش کرتا ہے۔ اصل چیز تحرک ہے اور یہ تحرک ہی بیان ہے۔ حسی قوتیں جس قدر متحرک ہوتی ہیں بیان کے دائرۂ کار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خواتین مرد کے مقابلے زیادہ حسی اور جذباتی ہوتی ہیں۔ اس لیے ان میں بیان کی قوتِ اظہار بھی زیادہ ہوتی ہے۔

عقل کے نزدیک نکاح کی ذمے داری قبول کیے بغیر بھی عورت و مرد جنسی حظ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم جنسی حالانکہ غیر اخلاقی اور غیر فطری طرزِ عمل ہے جسے حیوانی سماج میں بھی قبول نہیں کیا جاتا لیکن بعض ترقی یافتہ ممالک اسے قانونی شکل دے کر حیات و معاشرت کے فطری تقاضوں کو فراموش کرتے ہیں جس سے نظم زندگی کا اخلاقی معاشرتی شعور عقلی دلائل کے آگے کمزور ہوتا ہے۔

سائنٹفک تحقیق اور مفروضات غلط ہوسکتے ہیں مگر جذباتی حقائق ہمیشہ درست ہوتے ہیں۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، مرد و زن کے آپسی رشتوں کی مہک، ہزار تغیراتِ زمانہ کے باوجود آج بھی قائم ہے۔ سائنسی شعور عقل کی پیداوار ہے جس نے جذباتِ انسانی کو خواہشاتِ نفسانی کی شکل دے کر حیات و معاشرت کو ایک نئے شعورِ تخلیقات سے ہمکنار کیا ہے جس کا مرکزِ فکر نفس اور مادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی فطری نہج سیاست و صارفیت کے مادیاتی شعور پر استوار ہوتی جاتی ہے۔ اگر سیاست و صارفیت کا مقصد اقتدار کا حصول اور مال و زر کی طلب قرار دے دیا جائے تو ادب و زبان و بیان کے مقاصد واضح ہوجاتے ہیں، اور انسانی شخصیت سیاسی حیوان کی صورت اختیار کرتی ہے۔ سچائی اور احتسابِ عمل کا تصور جذباتی صداقتوں کی پیداوار ہے جس پر سیاست و صارفیت کے میکانکی اور سائنٹفک طرزِ بیان کا بوجھ اٹھانے کی ذمے داری عائد کی گئی ہے۔ المیہ ہے کہ سائنسداں اور فلسفی زبان کا کوئی غیر فطری نظم قائم کرنے سے معذور ہیں۔ لہٰذا جو زبان رائج ہے اس سے ایسے الفاظ کا اخراج اور معنویت میں تحریف کا عمل جاری ہے جس نے فطرت و کائنات کے متعین کردہ انسانی رشتوں کی فطری اور جذباتی رشتوں کی تجسیم و تفہیم میں درار پیدا کردی ہے۔ سیاست و صارفیت کے غیر جذباتی ڈکشن نے تاویلاتِ عقلی کی بنیاد پر ثابت کردیا ہے کہ جذباتی حقائق کے بغیر بھی رشتۂ انسانیت استوار کیا جاسکتا ہے۔ جدید طرزِ فکر کے اس عمل نے انسان کا رشتہ اس کے ماضی سے منقطع کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس سے بیان کی شفافیت اور فنی صداقت امیجری سے محروم ہوکر مادۂ محض کی ترجمانی کے لیے وقف ہوگئی ہے۔

زبان و بیان کا لسانی شعور و عمل کسی فلسفی اور سائنسداں کی غیر یقینی ذہنیت کی اختراع نہیں ہے۔ سائنسداں اور فلسفی اپنے افکار و نظریات کو نفسیاتی اور تکنیکی مفروضات کے ذریعے پیش کرتے ہیں جن کی کوئی ادبی حیثیت متعین نہیں ہے۔ اس لیے انھیں علامتوں کی صورت قبول کیا جاتا ہے۔ جدید علامتیں خواہ ان کا ڈکشن کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو غیر بیانیہ ہی شمار کی جائیں گی۔ مثلاً جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل وغیرہ کے مباحث ادب میں عام ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نظریہ اور رجحان ادبی نہیں ہوسکتا۔ جال— دریا اور پانی کا

حصہ نہیں ہے لیکن اسے مچھلی پکڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اسی طرح ادبی تھیوریز ادب کا حصہ نہیں ہوتیں مگر لسانیات کے فطری ڈھانچے کو علامتی طرزِ بیان کے ذریعے متاثر ضرور کرتی ہیں۔لفظوں کی روایتی تفہیم ایک اجتماعی شعور وعمل کو وسعت دیتی ہے جس سے حیات و معاشرت کے فطری رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔الفاظ مختلف زبانوں سے متعلق ہوسکتے ہیں لیکن ان کی معنوی تفہیم اور جذباتی ترسیل میں غضب کی یکسانیت ہوتی ہے۔لفظ اور کائنات کے رشتے اور مزاج و معیار میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔اس کی وجہ جذباتِ انسانی کی فطری سمجھ میں نہاں ہے۔درد وغم،خوشی و انبساط کے تمام رشتے دائمی طور پر قائم ہوتے ہیں جنھیں ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔ہمدردی،دوستی،رفاقت اور موانست محض الفاظ نہیں جذبوں کی اجتماعی پہچان بھی ہیں۔جن کا حاصل مادی نفع وضرر سے پرے ہے۔مگر جب یہی الفاظ سیاسی اور معاشی مفہوم میں استعمال کیے جاتے ہیں تو ان کی معنویت مشکوک اور محدود ہوجاتی ہے۔سیاست دان اور سرمایہ دار اپنے قومی اور ذاتی مفادات کے تحفظ میں لفظوں کو ان کی جذباتی اور اجتماعی حیثیت سے محروم کردیتے ہیں۔خصوصاً فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کے لیڈران کے بیانات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔جذبوں کی طہارت و پاکیزگی کو پریس اور الیکٹرانک میڈیا کے اسالیب و بیان نے اس قدر مشکوک بنادیا ہے کہ الفاظ کی معنویت ہی ختم ہوگئی ہے۔بازار میں آج کل زہریلے مشروبات کی فراوانی ہے جن کی اصلیت پانی ہے لیکن ان میں پانی کے خواص مفقود ہوتے ہیں۔اسی طرح حیات و معاشرت میں استعمال ہونے والی لفظیات بھی اپنی اصلیت سے محروم ہورہی ہیں۔

فنکار کا وجود سماج میں ہے مگر بعض افراد معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کا شکار ہوجاتے ہیں۔وہ اپنی ذات میں سماج کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی انفرادی شخصیت ہی سماج کا آئینہ ہے۔وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ فرد کا وجود سماج میں ہے، انفرادیت میں نہیں۔ارسطو کا قول ہے"جو سماج میں رہنے سے معذور ہے یا جسے سماج کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود پر منحصر ہے۔وہ یا تو دیوتا ہے یا جانور..."لیکن صارفی سماج میں انفرادیت زدگی (Individualism) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ہر شخص اپنی انفرادیت ثابت کرنا چاہتا ہے تاکہ صارفی سماج (Consumer Society) میں اپنی کاروباری حیثیت کو استحکام دے سکے۔اس عمل میں آزاد خیال مرد وزن دونوں برابر کے شریک ہیں۔معاشرتی قدروں کا زیاں ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں مغربی دانشوروں نے مذہبی تعلیمات کے خلاف فکری اور نظریاتی اختلافات پیدا کردیے تھے اور اپنے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے ہیومن ازم (Humanism) کو فروغ دیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی مبلغین کو حکومت و سیاست سے بے دخل کردیا جائے۔انھوں نے خدائی احکامات کے نام پر کی جارہی زیادتیوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور عقل وخرد کو مادی زندگی کا اصل حاصل قرار دیا تھا۔ہیومن ازم ایک

فلسفیانہ اور سائنٹفک نظریہ ہے جس نے انسان کی مادی وجودیت کو تقویت دے کر نفس اور مادہ کی توقیر میں اضافہ کیا تھا۔اس تحریک کے زیر اثر کارل مارکس (Karl Marx) نے دماغ کو مادہ کا سب سے اہم عنصر قرار دیا تھا۔

شخصی اظہاریت کے تمام مفروضات کا بنیادی عنصر بھی دماغ ہے۔جو صرف اپنی وجودیت کی ترجمانی میں ہمہ وقت مشغول رہتا ہے۔اگر جذبوں کی صداقت کو قبول کرلیا جائے تو دماغ کی برتری ختم ہوجاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ 'عقل' مرئی احساسات اور مادیاتی حقائق کی روشنی میں تاویلات کا جال پھیلاتی ہے جس سے بچ نکلنا دشوار ہوتا ہے لیکن اس کی دلیلوں میں عملی کمزوریاں بھی پنہاں ہوتی ہیں۔مولانا جلال الدین رومیؒ کی ایک حکایت کے مطابق سیب کے ایک باغ سے روز کوئی چور سیب چوری کرلیتا تھا۔ایک دن چور پکڑا گیا اور چوکیدار نے اسے پیڑ سے باندھ دیا اور مالک کو خبر کردی۔ مالک نے چور سے دریافت کیا"تو چوری کیوں کرتا ہے؟" چور نے جواب دیا"زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ہوا، پانی اور روشنی سب اس کے اختیار میں ہیں۔اسی کے حکم سے پیڑوں پر پھل لگتے ہیں۔میں اللہ کا بندہ اس کے باغ کا پھل کھاتا ہوں۔تو باغ کا مالک کیسے ہوگیا؟"مالک نے اپنا کوڑا منگوایا اور چور کی پٹائی کرنے لگا۔چور نے درد سے کراہتے ہوئے کہا "تو مجھے مارتا کیوں ہے؟"مالک نے جواب دیا"باغ اللہ کی ملک اور میں اس کا نگہبان ہوں اور اللہ کے حکم سے میں تیری پٹائی کررہا ہوں۔"چور اپنے دلائل میں کامیاب ہے مالک اپنے... لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض عقلی دلیلوں سے کاروبارِ زندگی کا چلنا محال ہے۔اس لیے چور کو سزا ملنا ہی چاہیے لیکن عصر جدید کے دانشور اور فنکار مغرب کے غیر اصولی افکار و نظریات سے تحریک لیتے ہیں جن کی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہوتی۔عقل کے مادی تفکرات کی بنیاد پر نفع وضرر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔فکری بے بصیرتی کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی کہ دانشوروں کا ایک طبقہ مرد کو عورت سے زیادہ خوبصورت بتاتا ہے۔

بصیرتِ قلب ونظر، جلال و جمال کے تصورات اور خیر انسانیت کے اوصاف، احساس وخیال کی پاکیزگی سے رفعت و پرواز حاصل کرتے ہیں۔موجودہ ادبیات میں مذکورہ احساسات کا کوئی گزر نظر نہیں آتا۔افسانہ اور ناول کے موضوعات فنی امیجری کے بغیر اپنا بیانیہ تلاش کرتے ہیں۔واقعہ نگاری اور جزویات کے بیان میں فنکار ایسی لفظیات کا انتخاب کرتے ہیں جن سے عقل کے مجرد تصورات واضح ہوسکیں۔آزادی اور مساوات کے سیاسی تصورات کے ذریعے اخلاق کی متعین کردہ قدروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔میڈیائی دانشور اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام ہیں کہ اگر انسان اپنے باطن میں درست نہ ہو تو اس کا ظاہری عمل بھی ناقص ہوگا۔غلط آدمی نیک راستوں کو بھی خراب کردیتا ہے۔اپنی غیر اصولی فکر کو درست ثابت کرنے کے لیے لوگ دلیل کا سہارا لیتے ہیں جس سے ضمیر اور احتسابِ عمل کا تصور فوت ہوجاتا ہے، اور ایک ایسی فکر ونظر پیدا ہوتی ہے جس کا لسانی ڈھانچہ بھی غیر اصولی ہوتا ہے مگر طاقتور قوموں کے فلسفی، فنکار اور عوام اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے نئی نئی تھیوریز وضع کرکے اپنے فکری اعمال کو درست ثابت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ژاں پال سارترے کے اینٹی ناول اور ساختیاتی مباحث (Structuralism) اس کی ایک عمدہ نظیر ہیں۔

ادبی تھیوریز کی افادیت کیا ہے؟ اس سوال پر کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔دانشور مفروضات وضع کرتے ہیں

اور زبان و بیان کے لسانی ڈھانچے اور عوامی تفہیم کے روایتی شعور پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں جس نے علامت نگاری کے غیر ادبی تصورات کو فروغ دینے میں معاونت کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

مغرب کی علامتی شاعری بڑی حد تک حقیقت اور تعقل کے خلاف ایک داخلی ردعمل ہے۔ جو اظہار حال کی بجائے اخفائے حال پر مجبور کرتا ہے اور اس کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے احساسات و تجربات کے اظہار کے لیے 'خفیہ زبان' وضع کرے تا کہ اس کا قاری اس کی بات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے۔ جیسا کہ سی ڈی لیوس نے ایڈمنڈ ولسن کے ایک خط سے واضح کیا ہے۔

The symbols of the symbolist school are use ally chosen or bitrarily the fact to stand for special ideas of his own. They are a short of disguise for their ideas."

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علامتیت ایک طرح کی 'ٹھگی' ہے۔ یعنی قاری کے ساتھ ٹھگی۔ یہ ایک طرح کی نجی زبان یا 'زمین دوز طرزِ بیان' ہے جسے شاعر خود ہی جان سکتا ہے اور اگر قاری جاننا بھی چاہے تو بڑی دیدہ ریزی اور تحقیق سے جان سکے گا۔ یہ ابلاغ کی زبان ہے ہی نہیں۔ یہ تو اظہار کا وسیلہ بھی نہیں۔ یہ اگر کچھ ہے تو فقط 'از خیر و بر در یزد' کے مصداق اپنے دل کی بات اپنے ہی سے ہے۔ بعض لوگ اس کو استعاری زبان کہتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ استعارہ کم از کم عرفی مماثلت پر قائم ہوتا ہے جس کو سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ علامتیت تو سمجھانے کے لیے ہوتی ہی نہیں۔ چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔'' (مقاماتِ اقبال، ص 296)

مغرب کے کسی بھی ادبی نظریہ کو مشرقی ادبیات میں مقبولیت بھلے ہی نہ ملی ہو۔ مگر اس نے فنکار کے انفرادی اور ذاتی احساسات کو تخلیقیت میں شامل کرنے کا راستہ ضرور ہموار کیا اور لفظوں کی اجتماعی تفہیم کو شخصی مزاج سے متعارف کیا ہے۔

فنکار نظامِ جمہوریت کا پروردہ ذہن رکھتا ہے اس لیے اس کا ادبی اور سماجی شعور بھی سیاسی ہوتا ہے۔ چونکہ فلسفۂ سیاست غیر اخلاقی نظریہ کا ترجمان ہے لہٰذا فلسفی اور دانشور تعلقاتِ نفسی کے مسائل کو ان کی مادی حقیقتوں کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے انسانی رشتوں کی جذباتی اور غیر مرئی صداقتوں کا بیان ثانوی ہو جاتا ہے۔ اور وہ لفظیات جن پر حیات و معاشرت کا انحصار ہے کمتر ثابت ہوتی ہیں۔ سماجی مسائل کے حل میں سیاسی شعور کی عطا کردہ لفظیات کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے جس کی ابتدا 'ترقی پسند تحریک' سے ہوئی تھی۔ 'بورژوا سماج'، 'سرمایہ داری' اور 'جاگیردارانہ طبقہ' کے ظلم و جبر و استحصال پر خیالات کے اظہار میں کارل مارکس، انجلز، اور لینن کے مادیاتی شعور زندگی سے اکتسابِ فن کیا جا رہا تھا۔ فنکار کے ایک طبقے نے سگمنڈ فرائڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نفسیاتی فلسفے سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ اس دوران علامت نگاری کا تصور بھی جڑ پکڑ رہا تھا۔ بعد کو جس نے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مذکورہ تحریکاتِ ادب نے زبان و بیان کے سیاسی اور معاشی شعور میں اضافہ ضرور کیا لیکن زبان کی فطرت ساخت اور بیان کی شفافیت معدوم ہو گئی۔

دانشوروں نے دنیا کو ایک تجربہ گاہ بنا دیا ہے۔ علم اور زندگی کا کوئی شعبہ تجربے سے خالی نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی انفرادیت ثابت کرنا چاہتا ہے۔ لوگ اپنی کمزوریوں کو درست کرنے کی بجائے انھیں خوبیاں سمجھتے ہیں۔ چونکہ احتسابِ عمل کا تصور مفقود ہے اس لیے عام طور پر لوگوں میں

سماجی مسائل کے حل میں سیاسی شعور کی عطا کردہ لفظیات کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے جس کی ابتدا 'ترقی پسند تحریک' سے ہوئی تھی۔ 'بورژوا سماج'، 'سرمایہ داری' اور 'جاگیردارانہ طبقہ' کے ظلم و جبر و استحصال پر خیالات کے اظہار میں کارل مارکس، انجلز، اور لینن کے مادیاتی شعور زندگی سے اکتسابِ فن کیا جارہا تھا۔

تکبر اور غرور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ دانشورانہ تفکرات میں بنی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا تصور مفقود ہے۔ وہ صرف قومی، ذاتی اور نسلی بنیاد پر غور و فکر کرتے ہیں۔ تخریب و انتشار میں زندگی کے عناصر تلاش کیے جاتے ہیں۔ مثبت اور منفی رویوں سے زیادہ انھیں اپنے نظریے کو درست ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ایٹم بم اور دیگر تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری میں سائنسدانوں کی متخرب ذہنیت کو کیوں کر فراموش کیا جا سکتا ہے؟ ترقی یافتہ ممالک معاش و معیشت پر بالادستی قائم رکھنے کے لیے اسٹاک **ایکسچینجز** کی معرفت تمام کاروبارِ دنیا کنٹرول کرتے ہیں۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ یورپی یا امریکی معیشت بحران سے دوچار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان ممالک کی آمدنی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ بلکہ ان کی امیدوں کے مطابق فائدہ نہ ہونے کو وہ اپنا نقصان سمجھتے ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی، سیاست و سرمایہ کے کاروبار سے وابستہ افراد کا کردار اخلاقی نہیں ہوتا مگر ان کے پیش کردہ خیالات کو فطری زبان و بیان کے پیرائے اظہار میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے نفس و مادہ کی حقیقتوں کو عقلی سطح پر سمجھنا آسان ہوتا ہے لیکن زندگی کی فطری سمجھ اور شعور پر زوال آتا ہے۔ دانشور مفروضات وضع کرتے ہیں۔ جن کا دائرۂ کار نفسیاتی حقائق کی ترجمانی تک محدود ہوتا ہے۔ ان میں فطری بیانیہ کی سی وسعت نہیں ہوتی۔ لہٰذا فکر و فہم کو ازموں (Ism) کے خانوں میں بانٹ کر مفہوم و مطالب واضح کیے جاتے ہیں مثلاً : Individualism, Behaviourism, Feminism, Terriorism, Facsism وغیرہ اصطلاحات کے ذریعے زبان و بیان کی معنویت کو ایک مخصوص جہت میں منضبط کیا جاتا ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو ازم (Ism) کی تعداد کا شمار کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تحقیق مکمل ہو گئی۔ تمام دنیا ازم (Ism) کے پھیر میں گرفتار ہے۔ دانشور ازم (Ism) سے منسلک اصولیات (Theories) پر گفتگو تو ضرور کرتے ہیں مگر مقصد کی وضاحت کوئی نہیں کرتا۔ ایک ہی نظریہ کی تعریف مختلف افراد اپنے اپنے طریقے سے متعین کرتے ہیں۔ کسی بھی ایک نظریہ کی کوئی حتمی تعریف کبھی متعین نہیں کی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے انفرادی معنی اور مفہوم اخذ کرنے کے لیے آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رولاں بارتھ (Rolond Barthes) لفظوں کی معنویت کو استعاراتی زبان کا ادنیٰ عمل قرار دیتا ہے اور قاری کے معنیٰ اخذ کرنے کی آزادی کا قائل ہے تا کہ Ism کے ذریعے پیش کردہ تشریحات اور مفاہیم کو استحکام دیا جا سکے۔

Theory یونانی لفظ Thea سے ماخوذ ہے۔ جس کے لغوی معنی چشمہ یا عینک کے ہیں۔ جس کے ذریعے مادیاتی حقائق کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح نظریاتی عمل ... ذہنی تصورات (Conceptional Amages) کی زمین پر واقعاتی سچائی کو پرکھنے کا رول ماڈل (Role Model) ہوتا ہے۔ John K. Pulparampil کا خیال ہے کہ 'نظریہ' ذہنِ انسانی میں اٹھنے والی مختلف تغیراتی لہروں کو سمجھنے اور خیالات کا موازنہ کرنے کے لیے بھی ایک حوالہ جاتی ڈھانچہ (Frame of Reference) کی تکمیل میں معاونت کرتا ہے۔ David Easton کے مطابق:

Such a frame of reference which raised to the level of consciousness is refined in to what may be turned as theory

حوالہ جاتی ڈھانچہ شعوری حدود میں واضح ہو کر Theory کی شکل اختیار کرتا ہے۔

(Political System, p 75)

دنیا میں بہت سی کمپنیاں کار بناتی ہیں۔ تمام کاروں کی بناوٹ جدا ہوتی ہے لیکن کار کا انجن، پہیے، ونڈ اسکرین، اور دیگر میکانزم میں یکسانیت ہوتی ہے۔ مقصد بھی ایک ہوتا ہے۔ منزل پر پہنچنا— اسی طرح Theories کا مقصد بھی مادیاتی شعور کی استواری ہے۔

ہزاروں سال سے مشرق تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ اس نے حرف و لفظ کی ایجاد و اختراع، معنی اور مفاہیم کے تعین میں قانونِ قدرت کے متعین کردہ فطرت و کائنات کے مزاج و معیار کے مطابق ایک ایسا انسانی دستورِ عمل اور ڈکشن ترتیب دیا تھا جس کو زبان کی ناواقفیت کے باوجود انسان وحیوان کو جذبہ و احساس کی مدد سے سمجھنا ممکن ہے۔ مگر جذبۂ عشق و محبت ہی تمام دانشورانہ شعورِ انسانی کا مرکز و منبع ہے جس کے بغیر تہذیب و ثقافت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بنیاد پر زبان و بیان کا تشکیلی عمل دریافت کیا گیا تھا۔ مشرقی دانشور اس حقیقت سے واقف تھے کہ انسان ایک جذباتی وجود رکھتا ہے۔ عقلی وجود میں تفریق ہوسکتی ہے لیکن جذباتی وجود ایک مشترکہ حقیقت ہے۔ عقل مند اور دانشور افراد کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ مگر دانشمند اور نادان دونوں ہی جذبات و احساسات کی دنیا میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ علم، دولت، طاقت، اقتدار اور اختیار کے باوجود انسان سے انسان کا ایک عالمی رشتہ ہوتا ہے۔ دولت مند کو غریب سے، طاقتور کو کمزور سے، حکمراں کو عوام سے محبت ہوسکتی ہے۔ لہٰذا جذبوں کی سلامتی کے لیے خاندانی اور معاشرتی قدروں کا تعین کیا گیا۔ والدین کی ذمے داریاں اور بچوں کے حقوق مقرر کیے گئے۔ ضعیف کمزور اور نادار لوگوں کی دادرسی کے لیے قانون و انصاف کا تصور بیدار کیا گیا۔ رشتوں کی زنجیر حالانکہ نظر نہیں آتی لیکن اس نے تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جذبات انسانی کے بیان کو ان کے نام اور تعلق سے پہچانا جاتا ہے مگر ان کی کوئی مادیاتی اور عینی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس لیے ان پر تفریط قائم کرنا آسان ہوتا ہے۔ اگر انسانی جذبات واحساسات میں فطری یکسانیت اور سمجھ نہ ہوتی تو کتابوں کا ترجمہ کرنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ ضمیر اور احتسابِ عمل کا آفاقی تصور بھی خاص مشرقی تہذیب کی عطا ہے۔

مشرق نے سائنس و ٹکنالوجی کے علم کو کبھی تہذیبی اور ثقافتی علوم وفنون پر ترجیح نہیں دی۔ اس نے مادیاتی علوم کو ہمیشہ دوسرے درجے پر رکھا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی مشینی اور میکانکی نظام تہذیب و ثقافت کا منبع و مرکز نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا سب سے بہترین ادب مشرق میں پایا جاتا ہے۔ اس ادب کا اخلاقی معیار مغربی فلسفیوں کی فکر وفہم سے بالاتر ہے۔ مگر چونکہ اقتدار واختیار مغربیوں کے قبضے میں ہے لہٰذا اسے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مغرب نہ تو رومیؒ کی مثنوی کا کوئی جواب پیش کرسکا۔ نہ فردوسی کا شاہنامہ ہی لکھا جاسکا۔ الف لیلیٰ، پنچ تنتر، حکایات اور داستان کی کوئی نقل بھی مغربی ادبیات میں نہیں ہے۔ نہ صرف کبیر، تلسی اور جائسی بلکہ میر وغالب واقبال کے علاوہ پریم چند، کرشن چندر، منٹو اور بیدی کی تخلیقاتِ ادب کسی بھی زبان و ادب کے لیے وجہ افتخار ہوسکتی ہیں۔ مشرقی بیانیہ کی وسعت کا اندازہ اس کے مذہبی صحیفوں سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن سائنس و

ٹکنالوجی کے میکانکی شعور زندگی اور فلسفہ و سیاست کے عطا کردہ نفسیاتی شعور کی آویزش نے انسان کی حیوانی شخصیت کے فلسفیانہ نقوش تراش دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دانشور مغرب کی سائنسی ترقی کا جواز لے کر تہذیب و ثقافت کی جذباتی اور اخلاقی قدروں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ جس سے زبان و بیان کا لسانی شعور متزلزل ہوتا ہے۔

'تحریر کا آغاز و ارتقا...' مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''تحریر کے نمونے پتھروں، مٹی کے برتنوں اور لکڑیوں کی تختیوں پر محفوظ ہیں۔ تہذیبی ماہرین کا خیال ہے کہ ان نمونوں میں مصری، سمیری، فینیقی، کھروشٹھی اور براہمی رسم خطوط کے باقیات محفوظ ہیں۔ ان باقیات پہ کندہ تحریروں کی عمر تین ہزار قبل مسیح سے شمار کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کے زمانے میں ترسیل کے ذرائع تصویریں، لکیریں وغیرہ ہوا کرتی تھیں۔ تحریر کا آغاز کنعاں (مصر) ایلم (جنوبی ایران) اور ہندوستان سے ہوا۔

زبیر شاداب، رسالہ فکر وتحقیق، اکتوبر دسمبر 2009

محولہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کی طرح زبان و بیان کے مشرقی تصورات نے دیارِ مغرب کے تاریک گوشوں کو علم وفن کی روشنی سے منور کیا ہے جس میں مصر، ایران، اور ہندوستان سرفہرست ہیں۔ آدمی کی نفسیات میں شامل ہے کہ بااختیار ہونے پر وہ اپنے ماضی کی محکومیت کے خوف سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ تاکہ اپنے اختیار کو مستحکم بنا سکے۔ تہذیب و ثقافت کی بنیادی اکائی کو کالعدم قرار دینے کے بعد مغربی مفکرین زبان کے لسانی شعور اور بیان کی روایتی تفہیم کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لفظ و معنی اور ادب وفن کی آفاقی قدروں میں تفہیم کا سقم پیدا کیا جاسکے۔ سائنس و ٹکنالوجی، سیاست اور معیشت کا تصور مشرق نے مغرب سے مستعار لیا ہے لہٰذا تہذیب و ثقافت کے جدید تصوراتِ فن بھی مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے درآمد کیے جاتے ہیں جس نے بیان کی تمام صورتوں میں جذبات و احساسات کی شفافیت کا فقدان پیدا کردیا ہے۔ دل ونگاہ کے تصورات اور فکر وفن کی آفاقیت عقل کے نزدیک بے معنی ہے۔ 'فیضانِ نظر'، 'عذاب وثواب' کے تصورات سے بھی مغربی فلسفی اور فنکار ناواقف ہیں۔ 'مردہ ضمیری' عام ہے۔ لوگ جانتے ہی نہیں کہ 'احتسابِ عمل' کیا ہوتا ہے۔ 'خدا کے خوف' سے اب کوئی دل لرزتا نہیں ہے۔ خلوص ومحبت کا معیار صداقت بھی دولتِ نفسی اور اقتدار و اختیار پر منحصر ہے۔ لفظوں کی صداقت چونکہ فطری اور جذباتی آواز کی ترجمان ہے لہٰذا فنِ موسیقی کے روایتی طرزِ بیان پر پرشور اور بے اصول غیر انسانی آوازوں کو مسلط کردیا گیا ہے۔ لایعنی اور غیر فصیح آوازیں لفظ و بیان سے اپنی تفہیمی صراحت کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اخلاقی صداقت اور جذباتی شعور کے بغیر... خواہشاتِ نفسانی کا اظہار امیجری کے نئے اسالیب تلاش کرتا ہے۔ جس نے بیان کی سرسبز وادیوں میں صحرائی خطے تعمیر کردیے ہیں۔ الفاظ کی خوشبو ماند پڑگئی ہے۔ فلسفی اور فنکار کا ذاتی، قومی اور نسلی تفاخر نفس اور مادہ کے مرئی تخیلات کا ترجمان ہوگیا ہے۔ جذبۂ انسانیت سے خالی قلب ونظر کی بوسیدہ عمارتوں میں نفسِ ناطقہ کی غیر تخلیقی آواز سنائی دیتی ہے — بیان اپنی امیجری کے ساتھ فطرت کے نہاں خانوں میں نہ جانے کہاں گم ہے؟

ایسے میں تجھ کو ڈھونڈ کے لاؤں کہاں سے میں!

■

Dr. Mehmood Shaikh. 592, Naya Mohalla, Mirza Ghalib Marg, Jabalpur - 482002 (M.P.)

محمد قمر سلیم

ڈی بونو کی چھ مفکرانہ ٹوپیاں اور اردو تدریس

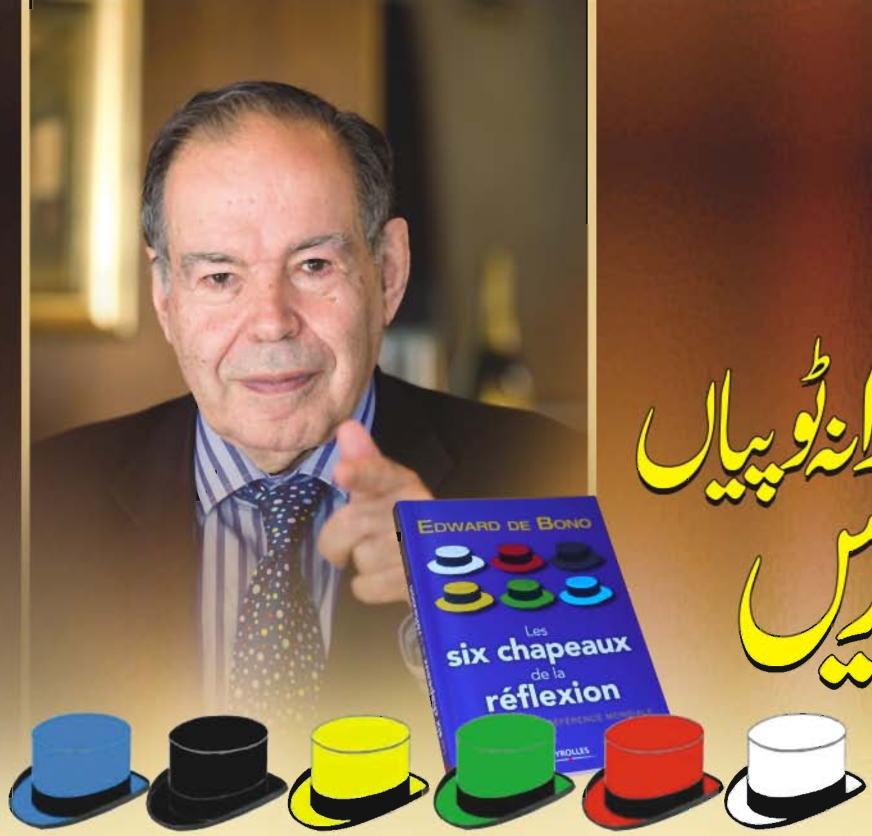

ڈی بونو ایک ماہر نفسیات تھا۔ وہ مالٹا میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے تقریباً 70 کتابیں لکھیں جن کا ترجمہ 40 زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ڈی بونو نے فکر اور تخلیق کو ایک نئی سمت دی اور اپنی اس فکر کی وجہ سے اس نے ایک الگ مقام حاصل کیا۔ ڈی بونو ضمنی فکر (Lateral Thinking) اصطلاح کا بانی ہے۔ اس نے تخلیقی فکر کی ایک شکل بتایا ہے۔ ضمنی فکر نئے خیالات اور نئے رجحانات سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کے مطابق جب کوئی خیال ذہن میں آتا ہے تو وہ اطمینان بخش ہونا چاہیے اور اس خیال کی افادیت کو عمل میں لانے سے پہلے سوچنا چاہیے۔ اس کام کو کرنے کے لیے (Vertical thinking) عمودی یا انتصابی فکر کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈی بونو نے 1985 میں ایک کتاب 'سکس تھنکنگ ہیٹس') چھ مفکرانہ ٹوپیاں لکھی۔ اس نے لکھا کہ فکر کی سب سے بڑی دشمن پیچیدگی ہے جس کی وجہ سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہماری سوچ صاف اور آسان ہے تو ہم اس کو زیادہ اچھی طرح سے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اسی لیے اس نے چھ مفکرانہ ٹوپیوں کے نظریے کو رائج کیا۔ اس میں چھ مختلف رنگوں کی ٹوپیاں ہیں اور ہر ٹوپی کی اپنی ایک الگ فکر ہے۔ ڈی بونو نے اپنے نظریے کو پختگی دینے کے لیے رنگوں کی مطابقت کے ساتھ ٹوپیوں کے لیے رنگوں کا انتخاب کیا۔ اس نے جن رنگوں کو چنا ان میں سفید، لال، ہرا، پیلا، کالا اور نیلا رنگ شامل ہے۔ اس کے مطابق سفید ٹوپی علیحدگی پسند اور حقیقت پسند ہے۔ اس کا تعلق حقیقت اور فکر سے ہے۔ لال ٹوپی جذباتی ہے۔ ہری ٹوپی تخلیق اور نئے خیالات سے تعلق رکھتی ہے۔ پیلی ٹوپی مثبت سوچ رکھتی ہے۔ کالی ٹوپی بہت محتاط رہتی ہے اور نیلی ٹوپی سرد مزاج رکھتی ہے۔

میں نے پہلی بار ڈی بونو کی چھ مفکرانہ ٹوپیوں کو اردو کی تدریس میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری نظر سے ابھی تک اس طرح کی تکنیک کا اردو تدریس میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ ہر ایک ٹوپی کی خصوصیت بتائی گئی ہے اور کس طرح ان ٹوپیوں کے ذریعے اردو کی تدریس ممکن ہے۔

سفید ٹوپی: سفید ٹوپی کا کام ہے کہ کیا اطلاع حاصل کرنا ہے؟ سفید ٹوپی یہ اطلاع کیوں حاصل کرنا چاہتی ہے؟ کہاں سے یہ اطلاع حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا مکمل اطلاع

کی ضرورت ہے؟ غرض یہ کہ یہ ٹوپی سچائی جاننے کی کوشش کرتی ہے۔ بچوں کے سامنے کوئی بھی حادثہ یا واقعہ پیش کیا جائے اور انھیں سوچنے پر مجبور کیا جائے۔ بچوں کو بتانا چاہیے کہ سفید ٹوپی کی سوچ میں تجزیہ، فیصلہ اور نتیجہ شامل ہے۔ یہ ٹوپی اطلاع کو، تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے بہت محتاط طریقے سے، رقم کرتی ہے۔ یہ بہت متوازن فکر رکھتی ہے۔ یہیں سے رپورٹ یا مضمون لکھنے کی شروعات ہوتی ہے۔

نیچے کی تصویر کو دیکھیے اور سوالات کے جواب دیجیے:

1. پولس انسپکٹر اس آدمی سے کس طرح کی معلومات حاصل کرے گا؟
2. رپورٹ لکھنے کے لیے پولس انسپکٹر کون کون سی معلومات حاصل کرے گا؟
3. اگر آپ سے رپورٹ لکھنے کے لیے کہا جائے تو آپ کیا کیا باتیں بیان کریں گے؟
4. 'شہروں میں حفاظتی انتظامات' پر رپورٹ لکھتے وقت آپ کیا کیا معلومات فراہم کریں گے؟

سفید ٹوپی کی فکر کے مطابق ایک پیراگراف دیا جا رہا ہے۔

''اس کارنامے پر ہمارے فوجیوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ بدقسمتی سے دشمن کی نظر عبدالحمید پر پڑ گئی اور دشمن کی بندوق سے نکلی ہوئی دو گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے مضبوط جسم میں گھس گئیں۔ عبدالحمید اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ تیسری گولی ان کے چوڑے چکلے سینے میں جا گھسی، جس سے وہ زمین پر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔''

عبدالحمید وطن کی حفاظت میں مر کر امر ہو گئے۔

عبدالحمید کی جواں مردی اور بے مثال بہادری کے صلے میں حکومتِ ہند نے انھیں سب سے بڑے فوجی اعزاز 'پرم ویر چکر' سے نوازا۔ سفید ٹوپی والے سوچیں اور جواب دیں:

❖ کیا عبدالحمید کے بارے میں معلومات اخبار کی رپورٹ ہے، کسی شخص کی آپ بیتی ہے یا ایک مضمون؟
❖ کیا فراہم کی گئی اطلاع مکمل ہے؟
❖ اگر آپ مصنف ہوتے تو آپ اور کن باتوں کو اس میں شامل کرتے؟
❖ کیا یہ اقتباس کون، کیا، کیوں، کب، کہاں اور کیسے تمام سوالوں کا احاطہ کرتا ہے؟
❖ اگر آپ عبدالحمید کے ساتھ جنگ کے میدان میں ہوتے تو اس واقعہ کو کس طرح بیان کرتے؟

آپ کو اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ آپ کو کیا معلومات حاصل کرنا ہے۔ معلومات حاصل کرنے کے پیچھے آپ کا کیا مقصد ہے۔ آپ کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوگی اور کیا معلومات مکمل ہے۔

لال ٹوپی: لال ٹوپی کی فکر میں احساس، ردِعمل اور وضاحت شامل ہے۔ یہ ٹوپی انسان کے جذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فکر کا تعلق ہمیشہ دماغ سے نہیں رہتا ہے بلکہ اس میں دل کو کافی حد تک دخل ہے۔ اس طرح لال ٹوپی کی سوچ میں منطق، وجہ، حقیقت کے بجائے جذبات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اس حالت میں لیے گئے فیصلوں کا وجوہات پر مبنی ہونا ممکن نہیں ہے۔

لال ٹوپی کا کام ہے کہ میں کسی بھی موضوع پر کیا محسوس کرتا ہوں؟ میں اپنے جذبات کا اظہار کتنی سچائی کے ساتھ کر رہا ہوں؟ کیا میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں پر اعتماد ہوں؟ مندرجہ ذیل تصاویر کو غور سے دیکھیے۔ ان کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں:

لال ٹوپی کی فکر کو علامہ اقبال کی اس نظم کے ذریعے بہتر طریقے سے بیان کیا جاسکتا ہے:

ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا
مالک نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے — آتے ہیں جو کام دوسروں کے

مندرجہ بالا نظم کو غور سے پڑھنے کے بعد لال ٹوپی والے جواب دیں:

❖ نظم کا کون سا شعر شاعر کے جذبات کی عکاسی کر رہا ہے؟
❖ کیا نظم کی چاشنی برقرار رہتی اگر شاعر اپنے جذبات کی عکاسی نہیں کرتا؟

❖ کیا نظم کا مفہوم بدل جاتا اگر صرف بلبل اور جگنو کی گفتگو کو بیان کیا جاتا؟
❖ اس نظم میں لال ٹوپی کس حد تک سوچتی ہے؟
❖ کیا لال ٹوپی کی سوچ اس نظم کا ضروری حصہ ہے؟

یاد رکھیے لال ٹوپی کے سوچنے کا دائرہ ہے کہ:

1. میں اس موضوع پر کیا محسوس کرتا ہوں؟
2. میں کتنی دیانت داری کے ساتھ اپنے جذبات کو اجاگر کرتا ہوں؟
3. کیا میں اپنے احساسات کو بیان کرنے میں پر اعتماد ہوں؟

پرانے خیالات سے ہٹ کر کچھ نیا سوچنا۔ اس ٹوپی کا کام نئی سوچ کو جنم دینا ہے۔ کسی بھی مسئلے کا ایک انوکھا اور نیا حل تجویز کرنا۔ ہری ٹوپی کی سوچ کا انحصار (Divergent, thinking) اختلاف یا پھیلاؤ پر مبنی فکر پر ہے۔ یہ مسائل کو نئے راستے، نئی سمتیں دیتی ہے۔ اس ٹوپی کا کام ہے کہ میں کون کون سے نئے خیالات تلاش کرسکتی ہوں؟ کون سے مختلف رائیں دے سکتی ہوں؟ کون کون سے مختلف حل تلاش کیے جاسکتے ہیں؟ میں نئے خیالات کے لیے کیا تحریک دے سکتی ہوں؟

ہری ٹوپی: ہری ٹوپی کی فکر تخلیق سے تعلق رکھتی ہے۔ ہری ٹوپی کا کام فکر میں تبدیلی لانا ہے۔ پرانے خیالات سے ہٹ کر کچھ نیا سوچنا۔ اس ٹوپی کا کام نئی سوچ کو جنم دینا ہے۔ کسی بھی مسئلے کا ایک انوکھا اور نیا حل تجویز کرنا۔ ہری ٹوپی کی سوچ کا انحصار (Divergent, thinking) اختلاف یا پھیلاؤ پر مبنی فکر پر ہے۔ یہ مسائل کو نئے راستے، نئی سمتیں دیتی ہے۔ اس ٹوپی کا کام ہے کہ میں کون کون سے نئے خیالات تلاش کرسکتی ہوں؟ کون سے مختلف رائیں دے سکتی ہوں؟ کون کون سے مختلف حل تلاش کیے جاسکتے ہیں؟ میں نئے خیالات کے لیے کیا تحریک دے سکتی ہوں؟

یہ صاحب مندرجہ ذیل حروف اور الفاظ کی مدد سے ان تصویروں کو نئے نام دینے کی کوشش کر رہے ہیں آپ بھی ان کی مدد کیجیے۔ آ۔ گاہ۔ ت۔ جال۔ وال۔ چمن۔ ی۔ کار۔

ہری ٹوپی کی فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اقتباس کو پڑھیے اور سوالات کے جواب دیجیے۔

لسانی کمیٹی نے بہت سی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ساتویں جماعت کا نصاب تیار کیا جیسے بچوں کی ذہنی سطح، زبان کے مختلف پہلو، اساتذہ کے پڑھانے کی صلاحیتیں، بچوں کی قدر پیمائی، کتاب کی قیمت وغیرہ۔ لیکن جب کتاب چھپ کر آئی تو یہ محسوس کیا گیا کہ طلبا اس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ ہری ٹوپی کو اپنے سر پر رکھ کر جواب دیں:

1. نصاب کی اصلاح کے لیے کون سے نئے خیالات آپ کے ذہن میں ہیں؟
2. کون کون سے مشورے آپ دے سکتے ہیں؟
3. کون کون سے متبادل طریقے آپ بتا سکتے ہیں؟
4. آپ بچوں کو اکسانے کے لیے کون سی ایسی باتیں کہیں گے کہ وہ نئے خیالات کا اظہار کریں؟

آپ کو یاد رکھنا ہے کہ ہری ٹوپی:

– مختلف انداز میں سوچتی ہے۔
– یہ ایک سے زیادہ صحیح حل یا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔
– یہ امکانات پر زور دیتی ہے۔

- یہ ہر تخلیق کی بنیاد ہے۔

پیلی ٹوپی: پیلی ٹوپی ہمیشہ کسی بھی موضوع پر مثبت طریقے سے سوچتی ہے۔ کسی بھی مسئلے، خیال، واقعہ وغیرہ پر مثبت رائے دیتی ہے اور کس طرح حالات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس ٹوپی کی سوچ ہے کہ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اور فوائد جاننے کے بعد اس کے نقصانات پر بھی نظر ثانی کرلینا چاہیے۔ یہ ٹوپی بتاتی ہے کہ کیوں ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہے اور اس سے ہمیں کیا فائدے ہیں۔ پیلی ٹوپی کا زیادہ تر دھیان اس بات پر رہتا ہے کہ کسی بھی کام سے کیا فائدہ ہے؟ اس سے کس کو فائدہ ہوگا؟ اور اسے کیوں کام کرنا چاہیے؟

نیچے دی گئی تصویروں کو غور سے دیکھیے اور ان کے فائدے بیان کیجیے:

مندرجہ ذیل اقتباس کو پڑھیے اور مثبت باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے سوالوں کے جواب دیجیے۔ یاد رکھیے کہ آپ نے پیلی ٹوپی پہن رکھی ہے۔

"کوپن لے کر اس دن کے بعد سے میں نے آئس کریم کھانا شروع کردیا۔ دو مہینے میں تین سو کوپن جمع کرلیے۔ اگلے ماہ پچاس اور بڑھ گئے، لیکن اب مجھ سے آئس کریم کھائی نہیں جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میں آئس کریم نہیں کوپن کھا رہا ہوں یا آنے والی فی ایٹ کار کے پرزے چبا رہا ہوں۔ پھر پچاس کوپن اور بڑھ گئے۔ یہ کوپن بڑی مشکل سے کھائے گئے۔ میرا مطلب ہے آئس کریم بڑی شکل سے چبائی گئی۔ روز رات کو کھٹی ڈکاریں آتیں، زکام ہوجاتا۔"

مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

1. کیا اس اقتباس سے آپ کو کوپن اور کار سے متعلق پوری معلومات حاصل ہورہی ہے؟
3. اس اقتباس میں آپ کو کس بات کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

یاد رکھیے پیلی ٹوپی ہمیشہ مثبت پہلو پر کام کرتی ہے۔ پیلی ٹوپی کی سوچ تجزیہ کرتی ہے اور منطق کا استعمال کرتی ہے۔

کالی ٹوپی: کالے رنگ کا تعلق فیصلے سے ہے۔ اس میں کوئی شخص کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے تمام منفی پہلوؤں کو دیکھتا ہے۔ یہ ٹوپی ہمیشہ صحیح بات کو جاننے اور سچائی معلوم کرنے کی جستجو میں رہتی ہے۔ اس کا کام غلطیاں نکالنا ہے۔ یہ آنے والے خطروں سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کا تعلق اس بات سے ہے کیا یہ سچ ہے؟ کیا یہ صحیح رہے گا؟ اس کے کیا کیا خطرے ہیں؟

نیچے دی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھیے۔ اس میں اکبر بادشاہ کام میں مصروف ہے۔ لیکن فنکار نے کچھ غلطیاں کی ہیں ذرا بتائیے وہ غلطیاں کیا ہیں؟

مندرجہ ذیل اقتباس کو غور سے پڑھیے:

"کہا تو بھائی، اس وقت نہیں دیکھ سکتی۔ پھر کسی وقت آنا۔"

"آپا جان! مارا خاطر سے دیکھ لو۔ پھر کہنا کشمیری بھیا سچ بولا یا جھوٹ بولا۔"

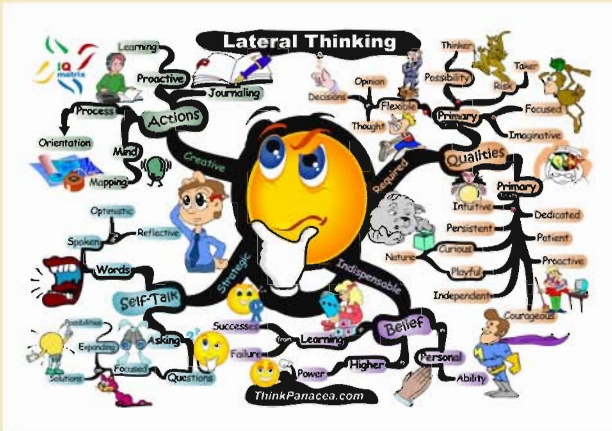

......میں نے ایک سفید شال کے دام پوچھے۔

"ساڑھے چار سو" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہ تو بہت ہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں احتجاج کیا۔

"یہ تو ام کہتا۔ اب آپ بولو آپا جان۔ اس کا کتنا دے گا۔"

"اس کے دو سو بھی بہت ہیں۔"

......اچھا۔ آپ اس کے دو سو پچھتر روپیہ دے دو۔ اب کچھ نہ کہنا۔ اپنا کشمیری بھیا کی بات مان لو۔ تم کو بہوت سستا دے دیا۔"

اب کالی ٹوپی لگا کر جواب دیجیے:

- مصنفہ اور شال فروش میں کیا تکرار ہوئی؟
- ان کی تکرار میں غلطیاں کہاں تھیں؟
- کس طرح وہ دونوں نتیجے پر پہنچے؟

آپ کو دھیان رکھنا ہے کہ کالی ٹوپی کی سوچ میں۔

1. موازنہ، مقابلہ اور نتیجہ اخذ کرنا شامل ہے۔
2. یہ منطق اور درجہ بندی پر مبنی ہے۔
3. کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایسی سوچ کی ضرورت ہے۔

نیلی ٹوپی: نیلی ٹوپی تمام ٹوپیوں میں سب سے اہم ہے۔ یہ ٹوپی سوچ اور فکر کے ایک عمل سے گزرتی ہے جبکہ دوسری ٹوپیاں اپنے اپنے دائرے میں کام کرتی ہیں۔ یہ ٹوپی صحیح سمت اور صحیح سوچ اور فکر کو تقویت دیتی ہے۔ اس ٹوپی کی سوچ ہے کہ کون سی بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے؟ کس طرح کی سوچ مفید ہے؟ کس طرح کی سوچ کن حالات میں موزوں ہے؟ فکر کے عمل پر کون سی رائے اور مشورے دیے جاسکتے ہیں؟ مندرجہ ذیل تصویروں کو دیکھیے کہ کس طرح مسئلوں کو حل کیا جاسکتا ہے:

- یہ کس کے قدموں کے نشاں ہیں؟
- اس تصویر میں کس بات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے؟
- یہ کس رنگ یا کس طرح کی فکر سے تعلق رکھتی ہے؟

اس بیل کے منھ میں ٹائم بم ہے۔ جو پانچ منٹ میں پھٹنے والا ہے۔ اگر آپ لال ٹوپی کا استعمال کریں گے تو حالات کیسے ہوں گے اور اگر آپ ہری ٹوپی کا استعمال کریں گے تو حالات کو کیسے بیان کریں گے۔

اس ٹیلی فون میں فنکار نے سات غلطیاں کی ہیں۔ ان غلطیوں کو کون سی ٹوپی بتائے گی۔ لیکن ذرا پیلی ٹوپی کو اپنے سر پر رکھیے۔ کیا آپ کم سے کم تین مثبت باتیں اس فون کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھیے کہ نیلی ٹوپی فکر کے عمل سے گزرتی ہے۔ یہ عمل کی بات کرتی ہے اور اس کے پہننے کے ساتھ ہی سوچ یا فکر کا عمل مکمل ہوجاتا ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ کس طرح فکر کو تکمیل تک پہنچایا جائے۔ اس کا کام زیادہ مشکل ہے کیونکہ یہ نہ تو صرف خامیاں نکالتی ہے، نہ ہی صرف مثبت پہلوؤں کو دیکھتی ہے۔ نہ ہی صرف تخلیقی عمل کو اپناتی ہے۔ نہ صرف جذبات کو مدنظر رکھتی ہے بلکہ اس کا تعلق پورے عمل سے ہوتا ہے۔ یہ ٹوپی ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر فکر کے آخری نتیجے پر پہنچتی ہے یہاں فکر کا عمل مکمل ہوجاتا ہے۔

References:

1. de Bono, Edward (1985), Six Thinking Hats: An Essential Approach to Business Management little, Brown, & Company.
2. Chandrika Ranganathan (2000), Exercises In Education to Creativity: Bon Bosco Communication, Mumbai.
3. Sampat & others (1997) Innovative Teaching through Games: Regency Publication, Delhi

■

Muhammad Qamar Saleem, Associate Professor, Anjuman-i-Islam's Akbar Peerbhoy College of Education, Flat No.2, Atmashanti CHS, Plot No 33, Sector 3, Vashi-Navi Mumbai - 400703 (MS)

انجینئر محی بخش قادری

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

مجروح سلطانپوری
غزل گوئی سے فلمی شاعری تک

مجروح سلطانپوری کو ترقی پسندوں کا میر تقی میر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے جس طرح غزل کو اپنا خونِ جگر دے کر سینچا اسی طرح فلمی نغموں کے لیے فن کی باریکیوں کا پورا خیال رکھا۔ ساحر لدھیانوی کے بعد جس شخص نے فلمی شاعری کو وزن اور وقار عطا کیا ہے اور اسے ادب کے دائرے میں منفرد حیثیت عطا کرائی ہے وہ مجروح سلطانپوری ہی تھے۔ انھوں نے فلمی دنیا کو تو بہت لطیف و موثر نغمے دیے ہیں اور اردو زبان کو بھی ایسا سرمایہ عطا کیا ہے جس کو ادب کی کوئی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ اب وہ ہم میں نہیں ہیں پر ان کے لکھے ہوئے نغمے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ دیکھا جائے تو مجروح سلطانپوری فطرتاً کم گو شاعر تھے۔ ان کا صرف ایک مجموعہ کلام 'غزل' شائع ہوا ہے اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی تو اس کا نام 'مشعل جاں' رکھا گیا۔ اس اشاعت کے بعد بھی انھوں نے بہت کم غزلیں کہیں اور اگر لکھی بھی ہیں تو منظر عام پر نہیں آئیں۔

مجروح صاحب ترقی پسند غزل گویوں کے امام تھے اور تقریباً نصف صدی تک وہ اس مقام پر فائز رہے۔ انھوں نے ترقی پسند افکار سے غزل کو اس وقت آراستہ کیا جب خود ترقی پسندوں کی نظر میں غزل درخور اعتنا نہیں رہی تھی۔ حسن کے معیار طے کیے جا رہے تھے۔ اصلاح سے انقلاب کی طرف جانے والی راہ متعین کی جا رہی تھی۔ ادب اور زندگی کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی شعوری کوششیں کی جا رہی تھیں۔ شاعری کے موضوعات میں مارکسی نظریہ حیات سرمایہ اور محنت کی آویزش، طبقاتی نظام کی کشمکش، استحصالی طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی اور اشتراکی نصب العین ادب میں راہ پا چکے تھے۔ غزل کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صنف سخن نہ ان اوصاف سے متصف ہے اور نہ تصورات وجذبات کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرسکتی ہے۔ مجروح صاحب کلاسیکی غزل کی تہذیب اور جلوہ گری لیے ہوئے ترقی پسندوں کی انجمن میں آئے جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ہر چند کہ انھوں نے شعوری ادب کے ترقی پسند نظریات کو قبول کرلیا تھا لیکن ان کے سامنے سب سے نازک مسئلہ یہ تھا کہ غزل کے قامت پر اس پیرہن کو کس وضع سے سجایا جائے۔ مجروح صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور سیاسی مفاہیم کو جمالیات کے سانچے میں اس طرح ڈھال دیا کہ نہ مضمون کو صدمہ پہونچا اور نہ تغزل کا دامن ہاتھ سے چھوٹا۔ انھوں نے زندگی اور ذہن کی کروٹوں کو اس سلیقے سے غزل کا جامہ پہنایا کہ یہ بحث ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی کہ غزل سیاست کی تاب لاسکتی ہے یا نہیں۔ ان کے چند اشعار ان کے اس فن کا نمونہ ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہیں آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجروح کی شاعری خیال اور جذبے کا امتزاج کا ایک نگار خانہ ہے جس میں زندگی کے کئی رنگ جھلک رہے ہیں۔ انسان کی عظمت میں مجروح کا یقین ایک اٹل یقین ہے اور عظمت انسان کا بیان مجروح کی غزل میں خالی خولی جذباتی انداز کا نہیں ہے بلکہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر مبنی ہے۔

ترقی پسند غزل مجروح صاحب سے منسوب ہے اور ان کی یہ انفرادیت ان کی بقا کی ضامن ہے۔ مجروح کی وفات پر پروفیسر وارث کرمانی نے اپنے تاثرات میں کہا تھا کہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مجروح کا سرمایہ سخن کم رہا۔ جس کی بنا پر اس کی قدر و منزلت میں کمی رہی لیکن ادبی تاریخ اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ انگریزی زبان کا مشہور شاعر Thomas Gray اپنی صرف ایک Elegy کی وجہ سے زندہ رہا بلکہ بڑا

شاعر مانا جاتا ہے۔ John Keats نے چھبیس سال کی عمر میں کتنا سرمایہ سخن اکھٹا کرلیا ہوگا، عمر خیام کی شاعری کا حجم کیا تھا؟ صرف چند رباعیات اور خود مرزا غالب نے کون سا اردو غزل کا ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ ان کے تاثرات کے برعکس موجودہ دور کے مشہور شاعر وادیب ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اپنی کتاب شہرِ سخن (طباعت 1961 اور طبع دوئم 2007) میں مجروح کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے کہ مجروح سلطانپوری نے ادھر چند برسوں میں بہت کم غزلیں کہی ہیں اور بقول خود وہ ''بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را'' کے مصداق بن چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جگر مرادآبادی کے تغزل اور علی سردار جعفری کے تفکر کا ایک عطر مجموعہ جو مجروح سلطانپوری کی غزلوں کی شکل میں سامنے آیا تھا وہ فلم انڈسٹری میں اس طرح ضائع ہورہا ہے کہ نہ روتے بن رہی ہے اور نہ ہنستے بن رہی ہے۔ ایک ایسا ذہن اور باشعور شاعر جس کا سلسلہ قدو گیسو سے دارورسن تک رہا ہو جس سے ضرب موسم، بند بہاراں، رقص ناتمام اور شراب خام جیسی نادر اور چونکا دینے والی ترکیبیں اردو شاعری کو عطا کی ہوں اور جو مجموعی طور پر ہر ترقی پسند تحریک کا سب سے اچھا غزل گو شاعر رہا ہو اس کی جان لیوا کم گوئی اس کے احباب اور چاہنے والوں پر بہت گراں گزر رہی ہے۔ خود مجروح نے اپنے ایک خط میں ملک زادہ صاحب کو یہ لکھا تھا کہ پچھلے دو مہینوں سے دل میں کیا کیا امنگیں اٹھ رہی ہیں کہ کوئی غزل کہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سحر وشام کی مصروفیات ہمیشہ کی طرح ان کا بھی خون کرکے رہے گی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ مجروح اس دور میں بھی غزل کی پیروی کرتے رہے جب لوگوں نے غزل کی گردن زدنی کا فتویٰ صادر کردیا تھا۔ یعنی غزل کو نیم وحشی صنف سخن سمجھ کر نظموں پر توجہ مرکوز کرائی جارہی تھی اور اس دور میں مجروح نے غزل کی حمایت کا علم بلند کیا۔ مجروح نے غزل کو اسی نزاکت اور حسن کے ساتھ اردو شاعری میں زندہ رکھا۔

مجروح کا اصل نام اسرار حسن خاں (ولد محمد حسین خاں) تھا۔ آباو اجداد کا وطن اعظم گڑھ کا قصبہ نظام آباد تھا لیکن سکونت بعد میں سلطانپور منتقل ہوگئی۔ ان کی پیدائش 1 اکتوبر 1919 کو نظام آباد میں ہوئی اور وفات 24 مئی 2000 کو بمبئی میں ہوئی۔ مجروح عربی فارسی مدارس کے فارغ التحصیل تھے اور کامیاب حکیم بھی تھے۔ جدید تعلیم حاصل نہ ہونے کے باوجود ادبیات کا ان کا گہرا مطالعہ تھا۔ میر کو وہ بہت بڑا شاعر مانتے تھے حالانکہ میر کا رنگ اپنی غزل پر انھوں نے چڑھنے نہیں دیا۔ لیکن میر کی ان کی نظر میں خاص وقعت تھی۔ ترقی پسند تحریک کی راہ سے چل کر وہ مارکسی نظریات تک رسائی حاصل کر پائے تھے۔ 1950 میں روس کی راجدھانی ماسکو کو اپنا نظریاتی قبلہ مان کر انھوں نے کہا تھا۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

اور

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہو نہ سکے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا وطن سرخ ترا

ترقی پسند فلمی شاعر شیلیندر نے 1956 میں آوارہ فلم کے ایک گیت میں ''سر پہ لال ٹوپی روسی پھر بھی دل ہے ہندوستانی'' کہہ کر ایک سودیشی دل کی بات تو کہی تھی لیکن وہ بہرحال فلمی گیت تھا۔ مجروح کی شاعری دیرپا اور پرکشش ادبی تہذیبی اور جمالیاتی اقدار کی حامل ہے۔ ان کی غزل تحریک کے باقیات میں سے ہے اور یقیناً اس میں تحریک کی نشانیاں جھلملاتی ہیں۔ اگرچہ ہر جگہ وہ کھلی نہیں ہیں، بیشتر مقامات پر وہ غزل کی رمز واشاریت میں ڈھکی لپٹی اور کلاسیکی

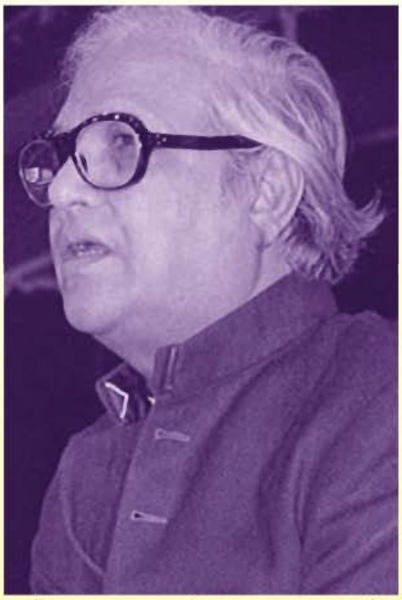

سوز وگداز لیے ہوئے ہیں۔ ان کی تراکیب اور تراشیدہ لفظی نے ان کی غزل کو منفرد بنادیا تھا۔ غزل جن اجزا سے معمور و عبارت ہوتی ہے ان کا ٹھیک تجزیہ کرنا آج بھی مشکل ہے۔ ان کی شاعری عشق، جمالیات اور سیاست کا ایک ایسا محلول ہے جس کا سرور اگر دل ودماغ پر چڑھتا ہے تو صرف رگ وپے میں آگہی کا سنہرا نور پھیلانے کے لیے۔ ان کی غزل کا ہندوستان کی اشتراکی تحریک اور خود غزل کی تاریخ کے سیاق وسباق میں مطالعہ کرکے ہمارے قدم معنی خیزی کی نئی راہ پر چلنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے بہت زیادہ غزلیں نہیں کہی ہیں۔ لیکن ایک دولت بیدار وہ اپنی غزلوں میں چھوڑ گئے ہیں جو ہر دور میں سکہ رائج الوقت تسلیم کی جائے گی۔ اس سنگین صارفی سماج میں جہاں انسان ایک قابل خرید وفروخت شے (commodity) بن چکا ہے اور آنے والے ہزارے میں اس کے گلے میں اسی شناخت کا نرخ نامہ (Price Tag) لٹکنے والا ہے۔ ایک شاعر اس سے زیادہ سچی بات کہہ نہیں سکتا جو مجروح نے کہی ہے:

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح
وہ تو کہیں ہیں اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح
سیدھی ہے راہ شوق پہ یوں ہی کبھی کبھی
خم ہوگئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح
بے تیشہ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح
اب جا کے کچھ کھلا ہنر ناخن جنوں
زخم جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح
مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

اس خوبصورت غزل کو فلم دستک میں لتا منگیشکر نے مدن موہن کی موسیقی کے ساتھ گایا تھا۔

مجروح کو سخن مختصر پر حیرت انگیز عبور تھا۔ دل میں کچھ کہنے کی خواہش سرابھارتی جسے تادیر ٹالتے رہے۔ خیال اگر طاقتور ہوتا تو انھیں لکھنے پر مجبور کردیتا تھا۔ کسی تخلیقی لمحے میں خیال کی سازش بڑی پیاری لگتی ہے۔ مجروح کو یہ تماشا کس قدر پسند تھا:

بہت ہی کم ہے تو خالِ رخِ بہاراں ہے
مری نوا کو ملا ہے وہ داغ پیراہن
ملے جو وقت نواسنجیِ ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی

انھوں نے کلاسیک کی پاسداری کی۔ ساتھ ہی انھوں نے اسلوبِ فکر کو رومانی سانچے میں ڈھال دیا۔ نموناً مجروح کے بہت سے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن اس مضمون کی تکمیل کے لیے ایک غزل کے چند اشعار نقل کررہا ہوں:

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں
دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں
تھامے اس بت کی کلائی اور کہیں اس کو جنوں
چوم لیں منہ اور اسے اندازِ رندانہ کہیں
تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہیں ہم نے دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

اردو شاعری کے اعلیٰ اور بلند معیار یا بہترین ہونے کے لیے جس حسن اور فنکاری کی ضرورت ہوتی وہ تمام خوبیاں مجروح سلطانپوری کے کلام میں بخوبی ہیں جس کا انداز مجروح کی شاعری سے روبرو ہونے سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ مجروح ایک کامیاب حکیم تھے لیکن اس پیشے کو ترک کر دیا۔ ابتدائی دور میں ہی شعر وشاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ مشاعرے میں شرکت کرتے اور مشاعرہ لوٹ لیتے کیونکہ ان کے کلام میں اثر تھا اور ان کی آواز میں وہ جادو تھا کہ سامعین ان کا کلام ترنم کے ساتھ سن کر عش عش کرنے لگتے تھے۔ مجروح کا ترنم بہت پرسوز اور پرسکون تھا۔ ان کو مترنم غزل گو شاعر حضرت جگر مرادآبادی کی سرپرستی حاصل تھی۔

دوبئی کے ایک مشاعرے میں مجروح صاحب کی ایک غزل ان سے ان کے دلکش ترنم کے ساتھ سنی تھی جس کے چند مصرعے ملاحظہ کریں:

گو رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگِ حنا کم تو نہیں ہے
کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں
ہر چند بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے
چاہے وہ کسی کا ہو لہو دامن گل پر
صیاد یہ کل رات کی شبنم تو نہیں ہے
اب کارگہ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے دوست کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے
صحرا میں بگولا بھی ہے مجروح صبا بھی
ہم سا کوئی آوارۂ عالم تو نہیں ہے

مجروح نے جب شاعری کی ابتدا کی تو ان پر کلاسیکی فارسی روایت کے اثرات بہت گہرے تھے۔ وہ جگر مرادآبادی کو اپنا معنوی باپ سمجھتے تھے اور اس تعلق خاطر کے سبب ان کی شاعری میں ساقی، جام، گل وبلبل۔ گلستاں اور صیاد کی علامتیں شیر وشکر ہو چکی تھیں۔ ساتھ ساتھ اردو غزل کے اپنے آداب سے مجروح کی غزل عبارت ہے بقول ان کے:

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

اب مجروح کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔ مجروح آزادی سے قبل ہی ممبئی چلے گئے تھے۔ جہاں وہ ترقی پسند شعرا کی صف اول میں شامل ہو گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے فلموں کے لیے نغمہ نگاری شروع کی۔ اسی وقت سے ساحر اور مجروح نے فلمی گانوں کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ ان کے بہت سے گیتوں کو ادبی اہمیت حاصل ہوئی۔ آپ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیے جہاں ہندوستانی آباد ہیں وہاں آپ کو دور دراز کی پہاڑیوں اور گاؤں اور شہروں میں لتا کی آواز میں گائے

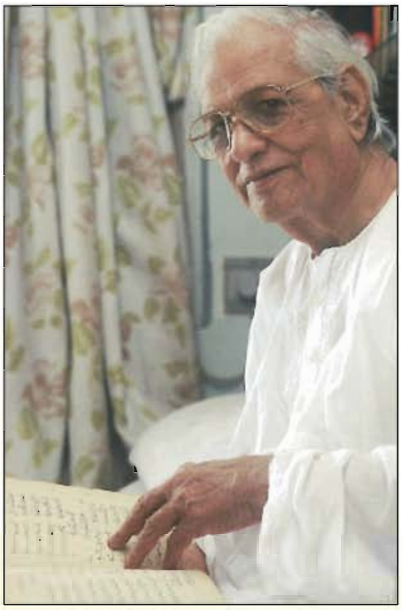

ہوئے مجروح کے نغمے سنائی دیں گے۔ مجروح نے 350 سے زائد فلموں کے لیے تقریباً 2225 نغمے لکھے۔ ان کے قلم کی رفتار شروع سے آخیر تک ایک جیسی بنی رہی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آنے والا ہر دور انھیں یاد کرتا رہے گا۔ ان کے لکھے نغمے لافانی ہیں اور انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ 55 سال کے طویل کیریئر میں مجروح سلطانپوری نے سیکڑوں شاہکار نغمے لکھے۔ ہر چند کہ مجروح آخری دم تک بہت مقبول نغمے لکھتے رہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ 1950 سے 1974 کے دوران ان کے زیادہ تر بہترین نغمے منظر عام پر آئے۔ 1950 سے قبل کندن لال سہگل کا گایا ہوا گیت بہت ہی مقبول ہوا جو فلم شاہ جہاں کا ہے اور اس میں ان کی غزل بھی گنگناتی نظر آتی ہے:

جب دل ہی ٹوٹ گیا
ہم جی کے کیا کریں گے
الفت کا دیا ہم نے اس دل میں جلایا تھا

مجروح نے 350 سے زائد فلموں کے لیے تقریباً 2225 نغمے لکھے۔ ان کے قلم کی رفتار شروع سے آخیر تک ایک جیسی بنی رہی۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ آنے والا ہر دور انہیں یاد کرتا رہے گا۔ ان کے لکھے نغمے لافانی ہیں اور انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ 55 سال کے طویل کیریئر میں مجروح سلطانپوری نے سیکڑوں شاہکار نغمے لکھے۔

امید کے پھولوں سے اس گھر کو سجایا تھا
اک بھیدی لوٹ گیا
ہم جی کے کیا کریں گے۔ جب دل ہی ٹوٹ گیا
معلوم نہ تھا اتنی مشکل ہیں مری راہیں
ارماں کے بہے آنسو حسرت نے بھری آہیں
ہر ساتھی چھوٹ گیا۔ ہم جی کے کیا کریں گے
جب دل ہی ٹوٹ گیا

سہگل کو یہ گیت اتنا پسند تھا کہ انھوں نے اپنی ارتھی کے جلوس میں اس کا ریکارڈ بجائے جانے کی خواہش کی تھی۔ مجروح کے لکھے نغمے ہر بڑے گلوکار نے گائے ہیں جن میں محمد رفیع، لتا منگیشکر، مکیش، کشور کمار، کمار شانو، سونو نگم، الکا یاگنک مخصوص ہیں۔ موسیقی دینے والے موسیقار ایس ڈی برمن، لکشمی کانت پیارے لال اور راجیش روشن ہیں۔ چند شاہکار اور مقبول گانوں کے مصرعے ملاحظہ کریں

1. فلم: میرے ہمدم میرے دوست، گلوکار: محمد رفیع، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال

ہوئی شام ان کا خیال آ گیا
وہی زندگی کا سوال آ گیا
ابھی تک تو ہونٹوں پہ تھا
تبسم کا اک سلسلہ
بہت شادماں تھے ہم ان کو بھلا کر
اچانک یہ کیا ہو گیا
کہ چہرے پہ رنگ ملال آ گیا
ہوئی شام ان کا خیال آ گیا

2. فلم: چھوٹے نواب، گلوکارہ: لتا منگیشکر، موسیقی: آر ڈی برمن

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
چرا کے دل بن رہے ہیں بھولے کہ جیسے کچھ جانتے نہیں
کوئی بتاؤ کہ ہم کریں کیا وہ ہم کو پہچانتے نہیں

3. فلم: پتھر کے صنم، گلوکار: مکیش، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال

توبہ یہ متوالی چال جھک جائے پھولوں کی ڈال
چاند اور سورج آ کر مانگیں تجھ سے رنگ جمال
حسینہ تیری مثال کہاں
یہی جی میں ہے تیرے نزدیک آ کے
ملوں تیری پلکوں پہ پلکیں جھکا کے
جو تجھ سا حسیں سامنے ہو تو کیسے
چلا جاؤں پہلو میں دل کو سجا کے
میری ایسی مجال کہاں

حسینہ تیری مثال کہاں

4. فلم: چراغ، گلوکار/گلوکارہ: محمد رفیع/لتا منگیشکر، موسیقی: مدن موہن

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
یہ اٹھیں صبح چلے یہ جھکیں شام ڈھلے
میرا جینا میرا مرنا انہیں پلکوں کے تلے
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
نہ ہو کہیں ان کا سایہ میرے دل سے جاتا نہیں ہے
ان کے سوا اب تو کچھ بھی نظر مجھ کو آتا نہیں ہے
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

5. فلم: ابھیلاشا، گلوکارہ: لتا منگیشکر، موسیقی: آر ڈی برمن

وادیاں میرا دامن راستے میری باہیں
جاؤ میرے سوا تم کہاں جاؤگے
جب ہنسے گی کلی رنگ والی کوئی
اور جھک جائیگی تم پہ ڈالی کوئی
سر جھکائے ہوئے تم مجھے پاؤگے
جاؤ میرے سوا تم کہاں جاؤگے

6. فلم: میرے لعل، گلوکارہ: لتا منگیشکر، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال

پائل کی جھنکا رستے رستے
ڈھونڈھے تیرا پیار رستے رستے
کرتی ہے فریاد لیکن ہنستے ہنستے
اور ڈھونڈھے تیرا پیار رستے رستے
پتہ پوچھتی ہے سب سے تمھارے کام کا
ہونٹوں پہ ہے اک بلما تیرے نام کا
کہا مان میرے پیار میرے دلدار
چھپنا ہے بیکار رستے رستے
پائل ک ی جھنکار رستے رستے
ڈھونڈھے تیرا پیرا رستے رستے

7. فلم: دوسرا آدمی، گلوکار: کشور کمار، موسیقی: راجیش روشن

بچنا اے حسینو، لو میں آگیا
حسن کا عاشق حسن کا دشمن
اپنی ادا سے اوروں سے جدا
بچنا اے حسینو لو میں آگیا
دنیا میں نہیں ہے میرا سا دیوانہ
حسن والوں کی زباں پر ہے میرا ہی ترانہ
سب کی رنگ بھری آنکھوں میں آج
چمک رہا ہے چمک رہا ہے میرا ہی نشہ
بچنا اے حسینو لو میں آگیا
جام ملتے ہیں ادب سے شام دیتی ہے سلامی
گیت جھکتے ہیں لبوں پر ساز کرتے ہیں غلامی
وہ کوئی پرجا ہو یا بادشاہ
آج تو سبھی ہیں مجھ پہ فدا
بچنا اے حسینوں لو میں آگیا
ایک ہنگامہ اٹھا دوں میں تو جاؤں جدھر سے
جیت لیتا ہوں دلوں کو ایک ہلکی سی نظر سے
محبوبوں کی محفل میں آج
چھائی چھائی ہے میری ہی ادا
بچنا اے حسینو لو میں آگیا

8. فلم: آرتی، گلوکار: محمد رفیع، موسیقی: روشن

مجروح سلطانپوری بطور نغمہ نگار فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے ایوارڈ 'دادا صاحب پھالکے' سے نوازے گئے اور یہ پہلا موقع تھا جب فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا ایوارڈ کسی فلمی شاعر کو دیا گیا۔ شاعری سے وابستگی کے طور پر انہیں 'غالب ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' سے بھی نوازا گیا۔

اب کیا مثال دوں میں تمھارے شباب کی
انسان بن گئی ہے کرن ماہتاب کی
چہرے پہ ڈھل گیا ہے حسیں چاندنی کا نور
آنکھوں میں ہے چمن کی جواں رات کا سرور
گردن ہے اک جھکی ہوئی ڈالی گلاب کی
اب کیا مثال دوں میں تمھارے شباب کی
گیسو کھلے تو شام کے دل سے دھواں اٹھے
چھولے قدم تو جھک کے نہ پھر آسماں اٹھے
سو بار جھلملائے شمع آفتاب کی
اب کیا مثال دوں میں تمھارے شباب کی

9. فلم: پھر وہی دل لایا ہوں، گلوکار: محمد رفیع، موسیقی: او پی نیئر

آنچل میں سجا لینا کلیاں زلفوں میں ستارے بھر لینا
ایسے ہی کبھی جب شام ڈھلے تب یاد ہمیں بھی کر لینا
آیا تھا یہاں بیگانہ سا چل دوں گا کہیں دیوانہ سا
دیوانے کی خاطر تم کوئی الزام نہ اپنے سر لینا

10. فلم: انداز، گلوکار: مکیش، موسیقی: نوشاد

تو کہے اگر جیون بھر میں گیت سناتا جاؤں
مَن بین بجاتا جاؤں
اور آگ میں اپنے دل کی ہر دل میں لگاتا جاؤں
تو کہے اگر جیون بھر میں گیت سناتا جاؤں
میں ساز ہوں تو سرگم ہے
دیتی جا سہارے مجھ کو
میں راگ ہوں تو سرگم ہے
جس دم تو پکارے مجھ کو
آواز میں تیری ہر دم آواز ملاتا جاؤں
تو کہے اگر جیون بھر میں گیت سناتا جاؤں

آج کی ضرورت ہے تو ایک ایسے ادیب کی جو ان کے سارے فلمی نغموں کو اکٹھا کرکے اور ترتیب دیتے ہوئے کتابی صورت میں شائع کرائے۔

مجروح نے اپنے نغموں سے یہ ثابت کر دیا کہ سچویشن کے مطابق بہت اچھے گیت لکھ سکتے ہیں نیز ایسے گیت بھی جو عوام میں بہت آسانی سے قبول کر لیے جاتے ہیں۔ ان کے شاہکار نغموں سے کچھ اہم گلوکاروں نے بھی شہرت پائی۔ طلعت محمود نے ان کا گیت "اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل" (فلم آرزو 1950) گا کر اپنی شہرت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ان کے ایک اور گیت "جلتے ہیں جس کے لئے" (فلم سجاتا 1959) طلعت محمود کی آواز کے جادو نے اس غزل کو جاوداں بنا دیا۔

مجروح سلطانپوری بطور نغمہ نگار فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے ایوارڈ 'دادا صاحب پھالکے' سے نوازے گئے اور یہ پہلا موقع تھا جب فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا ایوارڈ کسی فلمی شاعر کو دیا گیا۔ شاعری سے وابستگی کے طور پر انہیں 'غالب ایوارڈ' اور 'اقبال سمّان' سے بھی نوازا گیا۔ خوش آئند بات ہے کہ مجروح کی شاعرانہ ترقی پسند نظریاتی ترقی پسندی سے زیادہ دیر پا ثابت ہوئی وہ بیسویں صدی کی اہم آواز کی حیثیت سے تاریخِ ادب کے ایوان میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اس شعر کی تفسیر بنے رہیں گے۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

ماخذ:

(1) کلیات مجروح سلطانپوری (مرتب تاج سعید، لاہور)
(2) شہر سخن (ناشر ملک زادہ منظور احمد، لکھنؤ)

Er. Mohi Bakhsh Qadri, 6/48, Vineet Khand, Gomti Nagar, Lucknow-226010

عبدالناصر فاروقی

ابومروان عبدالملک ابن زہر
دنیا کا ایک اہم طبیب

دنیا کے بعض مقامات اور خطے اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث تاریخ میں ایک منفرد اور نمایاں حیثیت کے حامل رہے ہیں۔ یہاں کی مردم خیز زمین سے نہ جانے کتنے یکتائے روزگار اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے فضل و کمالات سے علم کی ایسی شمع روشن کی جس سے صدیوں تک زمانہ روشنی حاصل کرتا رہا۔ یوروپی ملک اسپین یعنی اندلس بھی ان شہرہ آفاق مقامات میں سے ایک ہے جو صرف ایک گہوارۂ علم ہی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت کا ایک ایسا موثر ترین مرکز تھا جہاں کسی زمانے میں علم و ثقافت اور تہذیب و تمدن کے مینار روشن ہوئے تھے جن کی ضوفشانیوں سے بلاتفریق مذہب و قوم سبھی نے استفادہ کیا تھا اور ہزارہا تشنگان علم سیراب ہوئے تھے۔ اس دور میں علمی و فنی اعتبار سے جتنی ترقی ہوئی اسے تاریخ کے ایک سنہرے باب کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

یہ اس دور کا ذکر ہے جب اسپین کئی سو سال تک مسلمانوں کے زیرنگیں رہا۔

دیگر علوم و فنون سے قطع نظر کرکے اگر صرف طبی علوم و فنون پر نظر ڈالی جائے تو اس کی بہت سی روشن مثالیں اس دور میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ابن رشد (وفات 1198)، ابن بیطار (وفات 1248)، ابوالعباس النباتی (وفات 1239)، ابن وحشیہ (وفات قریب 935)، الغافقی (وفات 1146)،

خدمات کے سبب خاصی شہرت و ناموری حاصل کی۔ بلاشبہ اسے اپنے عہد کا ایک عبقری طبیب کہا جاسکتا ہے۔

خاندان بنوزہر کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے اسے صرف ابن زہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے آبا و اجداد عرب سے منتقل ہوکر دسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مشرقی اندلس میں آکر آباد ہوگئے تھے۔

اس خاندان کے تمام افراد کا تعلق علما، روسا، حکما اور وزرا سے تھا اور انھیں شہزادوں کے حاشیہ نشینوں میں بڑا عظمت والا مقام حاصل تھا۔ خاندان بنوزہر نے تقریباً تین سو سال تک اشبیلیہ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ابن زہر اسی عالی مرتبت خاندان کا

کے درمیان متعین کی ہے۔ حکیم غلام جیلانی (وفات 1926) کے مطابق یہ اشبیلیہ کے قریب 1073 میں پیدا ہوا۔ اس تبحر طبیب نے 587ھ/ 1162 میں وفات پائی اور شہر اشبیلیہ میں باب الفتح کے باہر دفن کیا گیا۔

یوروپین مورخ جارج سارٹن نے ابن زہر کو مسیحی اور اسلامی دنیا کا بہت بڑا طبیب بتایا ہے۔ مشہور طبیب اور فلسفی ابن رشد نے ابن زہر کو جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب قرار دیا ہے۔ وکٹر رابنسن کے مطابق ابن زہر ایک سرجن بھی تھا لیکن اسے مغربی خلافت کے ممتاز ترین طبیب کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ابن زہر ان مجتہدین اور محققین اطبا میں سے ایک ہے جو اپنے پیش رو اطباء کی آنکھ بند کرکے کورانہ تقلید نہیں کرتا بلکہ ہر مسئلے کو حتی الامکان سچائی کی کسوٹی پر پرکھتا اور طالبان فن کو غلط نظریات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ابن زہر نے طب اپنے والد ابی العلا زہر (وفات 1131 سے پڑھا اور کم عمری میں ہی اس میں مہارت حاصل کرلی۔ اس کے باپ دادا بھی اپنے زمانے کے نہایت نامور اور فاضل و ماہر طبیب تھے۔ مفرد و مرکب ادویہ کی تحقیق اور ان کے تجربات میں ابن زہر اپنے والد سے بھی زیادہ قابل تھا۔ حصولِ تعلیم کے لیے اس نے مشق کے بجائے شمالی افریقہ کا سفر کیا۔ مرابطوں کے زوال کے بعد ابن زہر الموحدی سلاطین

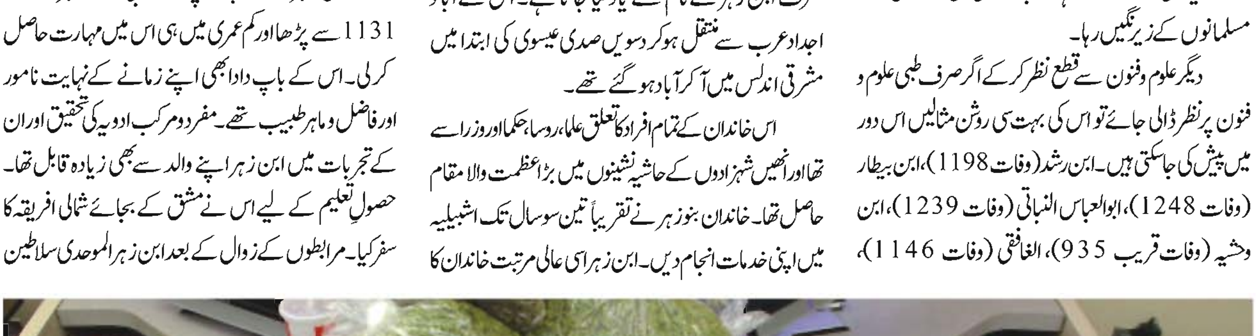

الزہراوی (وفات 1013) اور ابن زہر (وفات 1162) جیسی شخصیتیں اس دور کی یادگار ہیں جن کی فاضلانہ بصیرت ومہارت اور عظیم الشان کارناموں سے آج بھی ہماری نوجوان نسلوں کے اذہان بے بہرہ نہیں۔ اندلس کی ممتاز ترین اور سربرآوردہ اہل علم و ہنر میں ابن زہر کا نام بھی شامل ہے جس نے اپنی گراں قدر اپنے عالی حوصلہ شاگرد عبدالمومن کے ساتھ مل کر مغرب میں داخل ہوا اور اپنی دعوت پھیلا کر مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کرکے اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ مہدی کی وفات کے بعد عبدالمومن اس کا خلیفہ اور مغرب کا عظیم الشان فرمانروا بنا۔ اس کے دربار میں بھی ابن زہر کو شاہی طبابت کی خاص خدمت سپرد ہوئی اور رفتہ رفتہ قلمدان وزارت بھی اس کو مل گیا۔ عبدالمومن بن علی (وفات 1162) طبی معاملات پر اس کے اوپر بہت بھروسہ کرتا تھا اور اسے اپنا مقرب خاص بنائے ہوئے تھا۔ ابن زہر نے عبدالمومن کے لیے تریاق سبعینی ((70 کا نسخہ ترتیب دیا تھا، پھر اس کو مختصر کرکے دس دواؤں کا نسخہ (عشاری) اور بعدازاں سات ادویہ (سباعی) کا مرکب نسخہ رکھا تھا جو تریاق انتلہ کے نام سے مشہور ہے۔

ابن زہر نے اپنی خداداد صلاحیت اور طبی حذاقت کی بنا پر اسپین کے قرب وجوار اور عربی ومغربی ممالک پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ علاج و معالجے میں اسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ دور دور سے مریض شفا کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔ اس کی تشخیص وتجویز بے مثال تھی اور اس کا کوئی نسخہ خطا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی حذاقت کے بہت سے واقعات تاریخی کتب میں مذکور ہیں۔ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالمومن سخت بیمار ہوا۔ اس کا علاج یہ تھا کہ فاسد مادے کو دستوں کی راہ خارج کیا جائے لیکن خلیفہ دست آور دوا لینا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ وہ اس سے گریز کرتا رہا۔ ابن زہر نے جب دیکھا کہ خلیفہ کسی طرح بھی دوا لینے کو تیار نہیں ہے تو اس نے ایک نفیس حیلے سے کام لیا۔ وہ خلیفہ کے باغ میں گیا جہاں انگور کے درخت تھے۔ اس نے درختوں میں دست آور دواؤں کا پانی ڈلوایا۔ درختوں نے جب اس پانی کو جذب کرلیا اور دواؤں کے اثرات انگور میں آگئے تو انگور کا ایک گچھا خلیفہ کے پاس لے کر گیا اور اسے کھانے کے لیے پیش کیا۔ خلیفہ نے طبیب سے خوش اعتقادی کی بنا پر وہ انگور لے کر کھالیے۔ جب وہ پورے دس انگور کھا گیا تو ابن زہر نے خلیفہ سے کہا کہ بس! اتنے ہی آپ کے لیے کافی ہیں۔ اس سے آپ کو دس اجابتیں ہوجائیں گی اور آرام بھی مل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلیفہ کو اجابتیں ہوئیں اور وہ بالکل صحت یاب ہوگیا۔

چشم وچراغ تھا۔ اس کا پورا نام ابومروان عبدالملک ابن ابی العلا زہر تھا۔ اسے Abumaran/ Avenzoar اور عربی کتب میں ابومروان ابن زہر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش اشبیلیہ میں ہوئی۔ مورخین نے اس کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ظاہر کیا ہے لیکن جی کولن نے 1902 سے 1905

> **ابن زہر نے طب اپنے والد ابی العلا زہر (وفات 1131 سے پڑھا اور کم عمری میں ھی اس میں مہارت حاصل کرلی۔ اس کے باپ دادا بھی اپنے زمانے کے نہایت نامور اور فاضل و ماہر طبیب تھے۔ مفرد و مرکب ادویہ کی تحقیق اور ان کے تجربات میں ابن زہر اپنے والد سے بھی زیادہ قابل تھا۔ حصول تعلیم کے لیے اس نے مشق کے بجائے شمالی افریقہ کا سفر کیا۔ مرابطوں کے زوال کے بعد ابن زہر الموحدی سلاطین کے دربار سے وابستہ ہوگیا وھاں اسے منصب، وزارت اور درباری طبیب کا عھدہ تفویض ھوا۔**

علم طب میں بہت سی اولیات بھی ابن زہر کی طرف منسوب ہیں۔ اس نے سب سے پہلے حقنہ یا نرخرے کے ذریعے تغذیہ تجویز کیا اور اس غرض کے لیے اس نے ایک آلہ ایجاد کیا جو بکرے کے مثانہ اور ایک چاندی کی نلکی پر جو مثانہ کی گردن سے مضبوط باندھی جاتی تھی، مشتمل تھا۔ سب سے پہلے معاء مستقیم کو صاف کیا جاتا تھا، پھر اس آلے کے ذریعے انڈا، دودھ اور حریرہ آنت میں داخل کیا جاتا تھا۔ آنتیں اس کو حاصل کرکے معدے تک پہنچادیتی تھیں جہاں وہ ہضم ہوجاتا تھا۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق خارش کے جرثومے (itchmite) کی تحقیقات کا امتیاز بھی اس کو حاصل ہے۔ لیکن محمد الطبری (وفات 985) کے بارے میں کہاجاتا ہے کے دربار سے وابستہ ہوگیا وہاں اسے منصب، وزارت اور درباری طبیب کا عہدہ تفویض ہوا۔ مغرب کے فرمانروا خاندان مرابطین کا یہ شاہی طبیب اور ابراہیم بن یوسف بن تاشقین اس خاندان کے آخری بادشاہ کا طبیب خاص رہا۔ اس کے زمانہ میں ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن تومرت مہدی المغربی کہ وہ جرب کے جرثومے کا محقق اوّل ہے۔ ابن زہر نے لکھا ہے کہ بعض وقت جسم کی بیرونی جلد کے نیچے تھوڑی سی سوجن پیدا ہوجاتی ہے۔ اگر کھال وہاں سے ہٹا دی جائے تو مختلف حصوں سے چھوٹا سا کیڑا برآمد ہوتا ہے جو مشکل سے دکھائی دیتا ہے اور بہت سی دوائیں ایسی ہیں جو اس مرض کو اچھا کردیتی ہیں۔ مائیکرو بایولوجی کی یہ ایک اہم دریافت ہے۔ اگرچہ ابن زہر نے گندھک کو بیان نہیں کیا لیکن اس نے خاص طور پر ایسے لیپ کی سفارش کی ہے جس میں روغن بادام تلخ شامل ہو۔ دل کے بیرونی غلاف پر سوجن کا نمودار ہونا، پھیپھڑوں کے درمیان خالی جگہ پر ورم اور پھوڑے کا پیدا ہونا، کان کے درمیانی حصے کا متورم ہونا، حلق کا فالج، ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے اور اکھڑی ہڈی کے جوڑ کو بٹھانے کا طریقہ، غیر معتدل ہوا اور پانی کی وجہ سے بیماریوں کا لاحق ہونا، پھیپھڑے میں مچھر کی پیدائش کی وجہ سے کھانسی اور قطع قصبۃ الریہ (Tracheotomy) کا حوالہ وغیرہ ایسی اختراعات ہیں جن پر اس سے پہلے کسی نے بحث نہیں کی۔ جہاں تک اندرونی بیماریوں کا تعلق ہے وہ بقراطی طریقہ استدلال سے کام لیتا ہے لیکن جراحی کے معاملے میں وہ فوری مشاہدات اختیار کرتا ہے۔ ابن زہر کا خود بیان ہے کہ اس نے علم العظام (Orthopaedics) کا مطالعہ کیا ہے۔ ابن زہر نے علاج و معالجے میں تجربے کو بہت اہمیت دی ہے چنانچہ انسانوں پر عمل جراحی انجام دینے سے پہلے اس نے جانوروں کو بطور تجربہ استعمال کیا۔

ابن زہر نے سرجری کو طب کی ایک علیحدہ شاخ کے طور پر متعارف کرایا اور عمل جراحی سیکھنے کے لیے ٹریننگ کی صلاح دی۔ قرونِ وسطیٰ میں انسانی جسم کی چیر پھاڑ کو معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے اطبا اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ ابن زہر نے یہ روش ختم کرکے انسانی جسم کی تقطیع (dissection) پر زور دیا۔ بعض دماغی امراض بھی اس دور میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ابن

زہر نے نہ صرف ان کا ذکر کیا بلکہ ان کے لیے دوائیں بھی تجویز کیں۔

عمل تخدیر کی ایجاد کا سہرا بھی اسپین کے مسلمان طبیبوں کے سر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ابن زہر نے زہراوی کی طرح اہم دریافتیں پیش کیں۔ اس نے منھ کے ذریعے اور سونگھنے کے ذریعے بے ہوش کرنے والی دواؤں کا ذکر کیا اور بہت سے جرحی اعمال میں مخدرات (narcotics) کو اسفنج میں ڈبو کر مریض کے چہرہ پر رکھا۔ سائرل الگڈ لکھتا ہے کہ سرجری کے سلسلے میں اس کی بعض قابلیتوں کا گردہ کی پتھری اور فتح القصبہ کے آپریشن کے بیانات سے اظہار ہوتا ہے۔ یہ اس کا طبع زاد حصہ ہے ورنہ یونانیوں کے ہاں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ گستاؤ لیبان کے مطابق ابن زہر نے تجربے کے ذریعے سے معالجات میں اصلاح کی اور ثابت کیا کہ طبیعت جو کل افعال جسمانی پر حکمراں ہے عموماً بطور خود بلا دوا کے امراض کو دفع کر سکتی ہے۔ اس زمانے کے تعصبات برخلاف ابن زہر نے جراحی، معالجات اور خواص الادویہ تینوں کو یکجا کر دیا۔ اس کی تصنیفات جراحی میں ہڈیوں کے ٹوٹنے اور اکھڑنے کی بابت نہایت درست خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہودی طبیب اور فلسفی میمونائیڈس نے ابن زہر کی بہت تعریف کی ہے اور اسے اپنے عہد کا ایک ممتاز اور دانا طبیب بتایا ہے۔ ابن زہر کی عظمت کی وجہ سے 1968 میں دمشق میں اس کے نام اور تصویر کے ساتھ ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہو چکا ہے۔

ابن زہر کو جہاں ایک طرف علاج و معالجے میں درک حاصل تھا وہاں دوسری طرف تصنیف و تالیف میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ مشہور طبی مورخ ابن ابی اصیبعہ (وفات 1270) کے مطابق چھ کتابیں اس کی یادگار ہیں۔

(1) کتاب التیسیر فی المداوات والتدبیر: انگریزی کتب میں اس کتاب کو ابن زہر کا magnum opus یعنی اس کا سب سے اہم علمی کام کہا گیا ہے۔ اپنے قریبی دوست حکیم ابن رشد کی ایما پر اس نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس کا دو بار لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب سولہویں صدی تک یورپ کی طبی یونیورسٹیوں میں بنیادی طبی کتب کے طور پر زیر نصاب رہی ہے کیونکہ اس میں طب کے عملی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ 1160 میں John of Capua نے اور دوسری مرتبہ 1280 میں وینس کے طبیب Pata Vinus نے اس کا ترجمہ کیا۔ 1490 اور 1628 کے درمیان تقریباً 138 سال کے وقفے میں لاطینی زبان میں یہ دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ عوام الناس

میں یہ کتاب اس وقت متعارف ہوئی جب ڈاکٹر میخائل الخوری نے اوریجنل عربی متن سے اس کو ایڈٹ کیا اور پھر المنزمہ العربیہ لاتربیہ وثقافت العلوم نے دمشق سے 1983 میں اسے شائع کیا۔ اس کا اردو ترجمہ سنٹرل کاؤنسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی جانب سے 1986 میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم اور امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے اس میں کلینیکی مشاہدات کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ معالجات کی دوسری قدیم کتابیں اس خصوصیت سے خالی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے نہ صرف اپنے تجربات بلکہ اپنے والد، دادا، بقراط اور ارسطو کے مشاہدات کو بھی قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب میں امراض اور ان کے علاج و تدابیر کی جو تفصیل بیان کی گئی ہیں وہ نہایت مدلل اور اہم ہیں جس سے مصنف کی علمی پختگی اور طبی عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔ بقول فرانسیسی مورخ لوکلیئر 'کتاب التیسیر کا مقام محمد بن زکریا رازی کی کتاب الحاوی' اور بوعلی سینا کی 'القانون' سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔"

(2) کتاب الاغذیہ: یہ کتاب خلیفہ ابی محمد عبدالمومن بن علی کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس میں ابن زہر نے اچھی غذاؤں کی معالجانہ خصوصیات اور زہروں کے تریاقات پر اظہار خیال کیا ہے۔

(3) کتاب الزینۃ: یہ کتاب اپنے بیٹے ابوبکر کے لیے سہل دواؤں کے بارے میں بطور یادداشت مرتب کی تھی کیونکہ ابن زہر مریضوں میں مسہلات کے اندھا دھند استعمال کے خلاف تھا۔

(4) کتاب التذکرہ: یہ کتاب بھی اپنے فرزند ابوبکر کی تعلیم کے لیے تالیف کی تھی۔ اس میں امراض کے ابتدائی علاج کا ذکر ہے۔ اپنے بیٹے کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اور اس کی ہمت افزائی کی غرض سے ابن زہر نے یہ کتاب اس کے نام سے معنون کی تھی۔ یہ کتاب معالجات، حمیات اور مسہلات کے محتاط استعمال پر مشتمل ہے۔

(5) رسالہ امراض برص و بہق: یہ رسالہ بھی کسی طبیب کے نام لکھا تھا جس میں ان امراض کے اسباب، علامات اور علاج سے بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ اب دستیاب نہیں ہے۔

(6) مقالہ امراض گردہ: اس میں امراض گردہ سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ بھی دستیاب نہیں ہے۔

ابن زہر کے شاگردوں میں ابوالحسن بن اسدون مشہور بہ المصدوم، ابوبکر بن فقیہ قاضی اشبیلیہ، ابومحمد شذونی اور فقیہ زاہد ابوعمران بن عمران نہایت جلیل القدر اور حاذق اطبا ہوئے ہیں۔

ابن زہر نے علاج و معالجہ اور تصنیف و تالیف کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے ابن زہر کی طبی عبقریت ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی و غیر ملکی طبی مورخین نے اسے زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اس کے طبی کارناموں کو بنیاد بنا کر ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ آج بھی اس کے یہ کارنامے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

کتب محولہ

(1) ارببین میڈیسن (حصہ اوّل)، ڈونالڈ کیمبل، لندن، 1926، ص 19
(2) اسٹڈیز ان عربک اینڈ میڈیکل پرشین لٹریچر، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، کلکتہ 1959، ص 20
(3) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جز سوم)، لوزیک اینڈ کمپنی، 1971، ص 977-978
(4) تاریخ الاطبا، حکیم غلام جیلانی، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، سرکلر روڈ چوک، اردو بازار، لاہور، ص 193
(5) تمدن عرب (جلد دوم)، گستاؤ لیبان، حیدرآباد، دکن، 1315ھ، ص 452
(6) دی اسٹوری آف میڈیسن، وکٹر رابنسن، نیویارک، 1843
(7) ڈکشنری آف سائنٹفک بایوگرافی (جز 11) چارلز کولسٹن، ص 683
(8) قرون وسطی کے مسلمانوں کے طبی کارنامے، ڈاکٹر غلام قادر لون، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ص 74-273
(9) کتاب التیسیر (اردو ترجمہ)، مقدمہ، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، وزارت صحت و خاندانی بہبود، نئی دہلی، 1986
(10) ماہنامہ الحکمت، ایڈیٹر حکیم ظل الرحمن، اکتوبر 1965، ص 4 تا 12، مضمون کتاب التیسیر فی المداوات والتدبیر مصنفہ ابومروان عبدالملک ابن زہر اندلسی، از حکیم عبداللطیف فلسفی۔

Dr. Abdun Nasir Farooqui, Galaxy Apartment, RZ-2001B/24, F.F. Left Side, Tughlakabad Extn. New Delhi - 110019

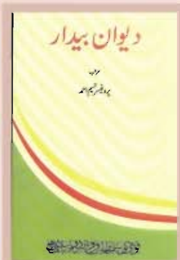

دیوان بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256، قیمت: 122 روپے، سال اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: عبدالسمیع، ریسرچ اسکالر
ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

میر وسودا کے عہد کو اردو شاعری کا سنہرا عہد کہا گیا ہے۔ شیخ عمادالدین شاہ محمدی بیدار کا نام اسی دور سے وابستہ ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد لب و لہجے سے تمام تذکرہ نگاروں اور اس عہد کے اہل نظر کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ زبان و بیان کی صفائی اور شستگی ان کی شاعری کی اہم خوبی تصور کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عہد پر لکھی جانے والی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شاہ محمدی بیدار کی شاعری ہر خاص و عام کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

دیوان بیدار پہلی مرتبہ مولانا محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی کی کوششوں سے 1935 میں منظر عام پر آیا۔ مولانا محوی نے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ اسے مدراس یونیورسٹی سے شائع کیا تھا۔ دوسری مرتبہ دیوان بیدار جلیل احمد قدوائی نے مرتب کر کے شائع کیا لیکن جلیل احمد قدوائی نے دیوان بیدار سے فارسی کلام نکال دیا اور صرف اردو کلام کو شامل دیوان رکھا۔ ان مطبوعہ اڈیشنوں اور عہد میر وسودا کے پر لکھے گئے مقالوں سے شاہ محمدی بیدار کی زندگی اور شخصیت پر کچھ روشنی تو پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود بیدار کی شخصیت اور شاعری کے بہت سے پہلو تحقیق طلب ہیں۔

دیوان بیدار کا تازہ اڈیشن پروفیسر نسیم احمد نے تیار کیا ہے۔ نسیم احمد کا نام تحقیق کی دنیا میں اعتبار حاصل کر چکا ہے۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے میر درد کا کلام مرتب کیا تھا جسے اہل نظر نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔ میر درد پر ان کے کام کی حیثیت حوالے کی ہے۔ پروفیسر نسیم احمد نے جس جانفشانی اور عرق ریزی سے دیوان بیدار مرتب کیا ہے، اس کا اندازہ اختلاف نسخ دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اسے بارہ قلمی نسخوں، اکیس تذکروں اور دو مطبوعہ ایڈیشن کی مدد سے تیار کیا ہے۔ مقدمہ میں انھوں نے شاہ محمدی بیدار کی سوانح اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے تذکروں اور دوسرے ماخذ کی مدد سے شاہ محمدی بیدار کی سال ولادت اور سال وفات متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ محمدی بیدار کی سوانحی زندگی اتنی پیچیدہ ہے کہ ان کا اصل نام تک لوگوں کو نہیں معلوم تھا۔ تخلص کی مماثلت کی وجہ سے کئی لوگوں کو مغالطہ بھی ہوا ہے۔ نسیم احمد نے شاہ محمدی بیدار کی زندگی اور شخصیت کے اس پہلو کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ ساتھ ہی سودا کے ساتھ ان کے کلام کے الحاق کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مقدمہ میں جملہ ماخذ کا تعارف اور ان کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ مقدمہ کے آخر میں مرتب نے دیوان بیدار کی ترتیب میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اسے مختلف سولہ نکات میں درج کیا ہے۔

دیوان بیدار مرتبہ پروفیسر نسیم احمد کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں 212 غزلیں، 6 قطعات، ایک مسدس، 10 مخمس اور 15 رباعیات شامل ہیں اور دوسرے حصے میں 22 غزلیں، ایک مخمس اور 7 مسدس شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں مسدس کے ذیل میں شامل آخری کلام مسدس نہیں بلکہ آٹھ اشعار کی غزل ہے۔

شاہ محمدی بیدار کے کلام کی خوبی اس کی سلاست اور روانی ہے۔ ان کلام کو پڑھ کر کہیں ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ یہ زبان قدیم ہے یا ہمیں کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دیتا نہیں دل لے کے وہ مغرور کسو کا　　سچ ہے کہ نہ ظالم سے چلے زور کسو کا
جاؤ اے ہم سفراں! ہاتھ اٹھاؤ مجھ سے　　میں تو جوں نقش قدم کوچۂ خوباں میں رہا
اس ستم گر سے جو ملا ہوگا　　جان سے ہاتھ دھو چکا ہوگا
عشق میں تیرے ہم جو کچھ دیکھا　　نہ کسی نے کبھی سنا ہوگا

کچھ غزلیں تو ایسی ہیں کہ بس پڑھتے جائیے، خاص طور سے جہاں وہ ردیف استعمال کرتے ہیں۔ 'تو کہا تجھ کو کیا' کی ردیف میں جو غزل ہے اس کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

کہنے لاگا: دل گم گشتہ ہے تیرا مجھ پاس　　جب کہا میں نے کہ کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

اسی طرح جو غزل سودا سے منسوب ہوگئی ہے وہ بھی بہت خوب ہے۔

ہم ہی تنہا نہ تیری چشم کے بیمار ہوئے　　اس مرض میں تو کئی ہم سے گرفتار ہوئے

پروفیسر نسیم احمد نے کلام بیدار درج کرنے کے بعد اختلاف نسخ کا ایک باب قائم کیا ہے۔ اس کے تحت انھوں نے مختلف نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات کو درج کیا ہے اور صحیح متن تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ شامل ہے۔ جس میں کلام بیدار میں در آئے مشکل اور نامانوس الفاظ کی تشریح اور تعبیر درج کی گئی ہے۔

اس طرح پروفیسر نسیم احمد کی کوششوں سے عہد میر و مرزا کا ایک اہم شاعر گمنامی کی دنیا سے نکل آیا۔ اس کام کے لیے پروفیسر نسیم احمد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دونوں قابل مبارک باد ہیں۔

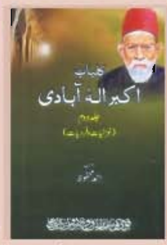

کلیات اکبرالہ آبادی (جلد دوم)

مرتب: ڈاکٹر احمد محفوظ
صفحات: 802، قیمت: 257 روپے، سال اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: رشدہ خاتون، وارڈ نمبر 10، کھڑکا، فقیر آباد، کوشامی

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی شخصیت کثیر الجہات ہے ان کا شمار اردو کے ان سر برآوردہ شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے زبان و ادب کو بے پناہ وسعت دی اور اس کو

متاثر بھی کیا، چاہے وہ ڈکشن کی سطح پر ہو یا پھر لفظیات کی سطح پر، اکبرالہ آبادی کا اختصاص ہی یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں دوسری زبان کے الفاظ کو بھی بخوبی استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لفظیات کی سطح پر اکبر کے یہاں کوئی مخصوص رجحان کے حامل الفاظ اور مصطلحات نہیں پائے جاتے بلکہ ان کے یہاں الفاظ کا وسیع و بسیط کینوس ہے اور چونکہ وہ باتیں طنز و مزاح کے پیرایہ میں کرتے ہیں اس لیے وہ الفاظ میں پوشیدہ معنی کے امکان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کہیں یہ الفاظ ذو معنی پیرایہ میں بیان ہوتے ہیں، کہیں تشبیہ و استعارہ تو کہیں ان میں نحوی تصرف سے کام لیا گیا ہے۔ جہاں اکبرالہ آبادی کی شاعری میں روایتی الفاظ کثرت سے موجود ہیں وہیں اسلامی اصول و معاشرت کے معروف علائم اور تلمیحات و استعارات۔ علاوہ ازیں اکبرالہ آبادی کے یہاں الفاظ و مصطلحات پر مشتمل متعدد بہ حصہ خالص نصوص اسلامی سے بھی ماخوذ ہے، اسی طرح انگریزی الفاظ کا بھی ان کی تخلیقات میں غیر معمولی عمل دخل ہے جو ان کے پیشہ، عہدہ اور حاکم وقت کی زبان تھی، خالص ٹھیٹھ دیسی Colloquial ہندوستانی معاشرت میں ڈوبے ہوئے الفاظ اور رمزو اشارے بھی ان کی شعر گوئی کا حصہ ہیں۔ اس وسیع تر پس منظر کے ساتھ شعری تانے بانے کی صورت میں اکبرالہ آبادی کے یہاں الفاظ میں پوشیدہ معنی کی بازی گری بھی پائی جاتی ہے ''ہوا پر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے'' جس کے پیچھے ایک ہمہ جہت واقف کار ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو نہ صرف اپنے عہد، ماحول، تہذیب اور معاشرتی آداب واطوار سے واقف ہے بلکہ اپنے فن کے ساتھ وہ فکری اور تہذیبی سطح پر استعماری طاقتوں سے برسر پیکار بھی ہے، ماحول کی سخت کوشی اور حاکم وقت کے روبرو ان کا طنزیہ و مزاحیہ پیرایہ محکوم قوم کو غذا فراہم کرتا ہے انھیں ہر لحہ اپنی غلامی کا احساس ہے۔

زیر تبصرہ کلیات اکبرالہ آبادی جلد دوم کے مرتب ڈاکٹر احمد محفوظ ہیں، موصوف کا شمار اردو کے بہترین اسکالرز میں ہوتا ہے وہ ایک اچھے ادیب اور ناقد بھی ہیں ان کا شمار اردو کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے، شاعری کے علاوہ ادبی تنقید میں بھی انھوں نے اپنا لوہا منوایا ہے، ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین جرائد و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ 'کلیات اکبرالہ آبادی' سے قبل وہ 'کلیات میر' تدوین کر چکے ہیں، جس کی نہ صرف ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی بلکہ علمائے ادب نے اس کو میر پر اب تک کی تحقیق و تدوین کے تعلق سے فوقیت دی۔ زیر نظر کلیات اکبرالہ آبادی جلد دوم ایک طرح سے دو حصوں پر مشتمل ہے، جس میں پہلا حصہ غزلیات پر مبنی ہے جس کو مرتب نے ترتیب وار مرتب کیا ہے اور دوسرے حصے میں فردیات ہے، اکبرالہ آبادی کے یہاں فردیات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس کو یکجا کرنا ایک جوکھم بھرا کام تھا لیکن ڈاکٹر احمد محفوظ نے اس میں بھی راہ نکال لی اور فردیات کو عام قاری کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ردیف وار ترتیب دیا ہے۔ مرتب نے اس کا اظہار بھی دیباچے میں کیا ہے ''زیر نظر جلد میں غزلوں کے علاوہ فردیات بھی شامل ہیں۔ اکبر کے کلام میں فردیات کی خاصی بڑی تعداد ہے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چاروں حصوں پر مشتمل یہ ابیات ہی اس جلد کے پونے دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ چونکہ موجودہ صورت میں الگ الگ شعر تلاش کرنا آسان نہ تھا، اس لیے ان اشعار کو بھی ہر حصے میں ہم نے ردیف وار درج کیا ہے۔''

کلیات اکبرالہ آبادی جلد اول جو کہ غزلیات پر مشتمل ہے کی طرح مذکورہ جلد کو بھی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو آسانی ہو جائے گی جو اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں اور کلام اکبرالہ آبادی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ کہ دیوناگری رسم الخط میں اردو کے حروف کو ہجہ کی سطح پر درست لکھنا تا کہ اردو زبان کی روح کہیں بھی مجروح نہ ہونے پائے۔ یہ بات قابل تحسین ہے کہ دیوناگری میں ترتیب دیتے وقت صحت متن اور املا کا پورا خیال رکھا گیا ہے، اس کے لیے ڈاکٹر احمد محفوظ اور قومی اردو کونسل دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

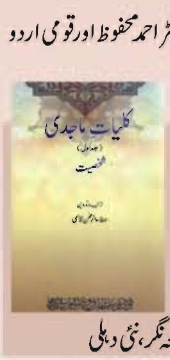

کلیاتِ ماجدی

ترتیب و تدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی

صفحات: 666، قیمت: 196 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان، غوری، ای۔ 62، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک ادیب، فلسفی، صحافی اور ناقد و محقق کی حیثیت سے دنیائے اردو ادب میں اعلیٰ اور معتبر مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو اور انگریزی ادب کے مایہ ناز ادیب کے علاوہ ماہر فلسفہ و نفسیات اور تحریک خلافت کے ایک اہم رکن بھی تھے۔ وہ 'محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق' کے ڈائری نویس ہیں۔ وہ 1912 سے 1931 (وفات مولانا محمد علی جوہر) تک اُن کے معرکۂ صحافت و خلافت میں رفیق کار کی حیثیت سے شریک کارواں رہتے ہیں۔ اسی لیے اس ڈائری کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔ ان کی اس ڈائری میں ضمناً قوم و ملک کی دوسری اہم و قد آور شخصیات بھی جلوہ گر ہیں۔

اردو زبان و ادب میں روزنامچہ یا ڈائری نویسی کی قدیم روایت رہی ہے۔ ڈائری نویسی سیرت نگاری اور سوانح عمری سے قدرے مختلف چیز ہے۔ اس میں اختصار و ایجاز سے کام لیا جاتا ہے۔ مولانا دریابادی نے اس ڈائری میں اختصار و ایجاز بیان سے کام لیا ہے جو اسلوب ماجدی کا خاص رنگ ہے۔

'کلیاتِ ماجدی' کی پہلی جلد صرف ڈائری نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی تاریخ آزادی، تاریخ خلافت، تاریخ صحافت اور تاریخ زبان و ادب کے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ڈائری اپنی معروضیت، سحر نگاری، معنی آفرینی، تجزیہ نگاری اور منظر کشی کے اعتبار سے دیگر ڈائریوں اور روزنامچوں سے افضلیت کی حامل ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا محمد علی جوہر کے شب و روز کے واقعات و حقائق کو خوش اسلوبی اور شگفتہ بیانی سے تحریر کیا ہے۔ ان کے اسلوب اور طرزِ نگارش کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ اس ذاتی ڈائری میں ان کے اسلوب اور طرزِ تحریر کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ وہ نہایت اختصار سے منظر اور پس منظر کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کی اس ڈائری سے تحریک آزادی اور تحریک خلافت پر مکمل روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی اردو زبان، اردو صحافت اور اردو شاعری کا روشن کارنامہ بھی سامنے آتا ہے۔

یہ ڈائری مولانا محمد علی جوہر کی عبقری و ہمہ جہت شخصیت کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس ڈائری کے تاثرات و مشاہدات میں کہیں کہیں ایسے حقیقت پسندانہ اور چبھتے ہوئے فقرے بھی آ گئے ہیں جو محمد علی کی شخصیت کی افتادِ طبع، خد و خال اور ان کی فکر و نظر میں رونما ہونے والے نشیب و فراز کی تفہیم و تعبیر میں بے حد معاون و مددگار اور مولانا دریابادی کی حق پسندی کی واضح دلیل بھی۔

ڈائری کے مندرجہ ذیل چند مشمولات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ایک جامع اور اہم ترین کتاب ہے۔

نظر بندی، قید فرنگ، اسلام سے شیفتگی، شاعری، خلافت و ترک موالات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کانگریس کی صدارت، گاندھی جی کی مہمانی، ہمدرد اور کامریڈ نقش ثانی، خاتمۂ خلافت، سال غم، بی اماں کی وفات، کامریڈ کا خاتمہ، شریفی سعودی جنگ، پیر اور مرید کی آویزش،

شرعی جمہوریت، ڈائری نویس پر ڈانٹ، نئی اودھ خلافت کمیٹی، خلافت کانفرنس، مرشد کی آخری گھڑیاں، حج اور وفد خلافت، بیباکی، شوخی اور فراخ دلی، تنگ دستی، صاحبزادی کی شادی، بیمار کا سفر یورپ، مکتوب مسافر یورپ، مشاہدات فرنگستان، زخمی شیر بپھرا ہوا، سب وشتم کی گرم بازاری، یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے، چھوٹی لڑکی کا عقد، عالم ناسوت میں آخری ملاقات، بیمار مظلوم، مظلوم کی آہ، بیمار کی کراہ، مرنے کے لیے اللہ کے شیر کی آخری گرج، سفر کی کہانی مسافر کی زبانی، ملت یتیم ہوگئی، جوہر میزان جواہر میں، محمد علی کا مقام، اسلام کا دیوانہ، آخری لمحے اور وصیتیں وغیرہ۔ ان عنوانات کے علاوہ بھی بڑے دلچسپ اور دلآویز عنوانات ہیں جو قاری پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری کرتے ہیں۔ دراصل یہ ڈائری ایک عبرت نامہ اور پند نامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ مسلمانوں بالخصوص ملی وقومی قائدین نے جو سلوک کیا وہ بڑا ہی عبرت ناک و المناک ہے اور اس ذاتی ڈائری میں مولانا محمد علی کی المناک زندگی کی پوری پوری تصویر کشی کی گئی ہے۔

'کلیات ماجدیؒ' (جلد اوّل) مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت پر مبنی ایک پر اثر اور دلچسپ ڈائری ہے۔ اس کی کتابت اچھی ہے اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔ اس کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو قارئین پسند فرمائیں گے۔

سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل ودوم)

مصنف: سکٹف اور سکٹف، مترجم: انیس الدین ملک
صفحات: حصہ اوّل 152 وحصہ دوم 183
قیمت: حصہ اول ودوم: 43 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: تنزیل اطہر، 269، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اردو میں تخلیقی ادب کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر دوسرے روز کوئی نہ کوئی شعری یا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آتا رہتا ہے۔ لیکن سائنس پر مبنی کوئی کتاب شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس لحاظ سے زیر نظر کتاب سائنس کی کہانیاں اس خلا کو پر کرنے میں مددگار ثابت ہورہی ہے۔ کتاب میں کوئی جدید سائنسی دریافت نہیں ہے بلکہ قدیم دریافتوں کا احاطہ کیا گیا ہے، جن میں کچھ تو پانچ سات سو سال پرانی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سائنس کے عہد طفلی کی ایجادات کو کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ سائنسی معلومات کو کہانی کی شکل میں پیش کرنے سے کتاب خاصی دلچسپ ہوگئی ہے۔ کہانیوں کے عنوانات بھی افسانوی تاثر فراہم کرتے ہیں۔ کچھ عنوان تو اتنے دلچسپ ہیں کہ ان پر نظر پڑتے ہی پوری کہانی پڑھنے کا تجسس پیدا ہوتا ہے۔ خاص طور سے حسینہ کالی پڑ گئی، کتے کا غار، دھویں سے روشنی اور ایک کیمیا داں نے خواب دیکھا وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ عنوانات کامکس یا داستان کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً بارود اور ایک آتش فشاں پہاڑ، پادری سوڈا واٹر اور چوہے، پھٹکری پوپ اور بادشاہ وغیرہ۔ یعنی کسی ایک واقعے کو موضوع بنا کر اس سے متعلق سائنسی معلومات اور دریافت کو سلسلہ وار بیان کیا گیا ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ کسی مشکل سائنسی کرامات کا مطالعہ کر رہے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی افسانہ پڑھا جا رہا ہے۔ مجموعے میں کل 22 سائنسی کہانیاں ہیں اور ہر کہانی معلومات کا خزانہ ہے۔

دراصل سائنس کی کہانیاں بذات خود اصل کتاب نہیں بلکہ ایک ترجمہ ہے۔ ترجمہ بھی بے حد خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اچھی اردو استعمال کی گئی ہے اور اصطلاحات وغیرہ کا پورا خیال رکھا ہے۔ ایک دو مقام پر لفظی ترجمہ کرنے سے جملہ بے وزن ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لفظ 'گھومنے کے قابل مقام' لکھا گیا ہے، سیاحت کے قابل مقام لکھنا زیادہ بہتر ہوتا۔ ویسے سائنس میں مفہومی ترجمے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ ایسے میں کہا جا سکتا ہے کہ انیس الدین ملک نے اپنا کام بخوبی انجام دیا ہے۔

کتاب کا سب سے منفی پہلو اس کی طباعت ہے۔ طباعت میں برسوں پرانا طریقہ استعمال کیا گیا ہے جو اب عموماً چلن میں نہیں ہے۔ اسے پڑھنے میں خاص طور سے بچوں کو دقت آسکتی ہے۔ تصاویر کی حالت تو اور بھی ناگفتہ ہے۔۔ اس کے علاوہ بیشتر کہانیاں طویل ہیں۔ کچھ کہانیاں تو اس قدر طوالت لیے ہوئے ہیں کہ انھیں پڑھ کر کہیں کہیں اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ جبکہ طبیعت اطفال اختصار پسند ہوتی ہے۔ لیکن اس کا الزام مترجم کے سر نہیں جا سکتا اس نے تو اصل متن کے مطابق ہی ترجمہ کیا ہے۔ آج کے دور میں جب بچوں میں اردو کتابوں کے تئیں عدم دلچسپی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ناقص طباعت اور بے رنگ تصاویر کتاب کی مقصدیت کی راہ میں حائل ہوتی معلوم ہو رہی ہے۔ تاہم سرورق بچوں کی نفسیات کے عین مطابق اور خاصا متاثر کن ہے۔

طباعت سے قطع نظر اگر صرف متن پر توجہ مرکوز کی جائے تو بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی یہ سائنسی معلومات کا عظیم خزانہ ہے۔ امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ کوشش اردو حلقے میں سائنسی مزاج پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

کتاب کے حصہ دوم میں 27 سائنس دانوں اور ایجادات کی کہانیاں دی گئی ہیں۔ دوسرا حصہ 183 صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں گیلیلیو، آرشمیدس، دوربین، بادپیما، نیوٹن، ایکس ریز، تابکاری، بھاپ کے انجن وغیرہ پر عام فہم زبان میں بتایا گیا ہے۔ طالب علموں کے لیے خصوصی طور سے لکھی گئی یہ کتابیں سائنسی اور مختلف ایجادات سے متعلق واقعات اور قصوں پر مبنی ہیں۔ اسلوب اس قدر دلکش ہے کہ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

خوابوں کا جزیرہ 'موریشس'

مصنفہ: ڈاکٹر دردانہ قاسمی
صفحات: 111، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ
تبصرہ: امتیاز احمد، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 202002

ڈاکٹر دردانہ قاسمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عبداللہ گرلس کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انتظامی سطح پر بھی خاصی فعال اور پُر خلوص ہیں۔ اُن کی ان تمام خوبیوں کا اندازہ اس سفرنامے کے مطالعے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ''خوابوں کا جزیرہ موریشس'' موصوفہ کے سفر موریشس کی بہت خوب صورت داستان ہے۔ اس کی خوب صورتی کا اندازہ مصنفہ کے سفرنامے کے اس آخری نوٹ سے بھی ہوتا ہے:

''موریشس کا یہ سفر ہمارے لیے خوابوں کا سفر تھا۔ ایک تو اس سرزمین سے وابستہ یادیں اور پھر وہاں کی طلسمی دنیا، ساحل ہو یا سمندر، خشکی ہو یا آبادی ہر جگہ ایک انوکھا پن ملتا ہے۔ ہندوستانی مہاجرین جو وہاں کی آبادی کی اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں کئی نسلیں گزر جانے کے باوجود ابھی ویسے ہی سادہ لوح اور بے ریا معلوم ہوتے ہیں جیسے ان کے اجداد ہندوستان کے مشرقی خطے سے آئے تھے۔ ان تمام اعتبارات سے موریشس کی یادیں کم از کم میرے لیے خواب وخیال کی طرح ہیں جن کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔'' (ص 111)

اس کتاب کے ہر صفحے پر انسانی محبت، خلوص، دل کشی، بے لوثی اور فطری مناظر سے ہم آہنگی بکھری پڑی ہے۔ اُن کے عزیز شاگردوں اور جاننے والوں کی اتنی بڑی تعداد موریشس کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ سب اس خلوص اور اپنائیت سے بار بار ان سے ملنے آتے ہیں کہ جمال ہم نشیں در من اثر کرد کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ وہ ایک ایک فرد کے خلوص کی، محبت کی، لگن کی، رہن سہن کی، وہاں کے کلچر کی تعریف کرتی ہیں۔

اس سفرنامہ کے ذریعے پڑھنے والا موریشس کی معاشرتی زندگی کی بہت سی خوبیوں سے واقف ہوتا ہے مثلاً یہ کہ:

''گھروں میں ہندوستانی کلچر زندہ ہے۔ وہی ہندوستانی رہائش، وہی طور طریقے اور وہی سادگی اور اپنائیت۔'' (ص 100)

''اکثر لوگوں نے ہندوستان کی علاقائی زبان اور کھانے پینے کی چیزوں کے ان ناموں کا استعمال آج تک جاری رکھا ہوا ہے جو وہ کبھی ہندوستان میں استعمال کیا کرتے تھے۔'' (ص 103)

اس سفرنامے کی اچھی بات یہ ہے کہ اس سے ہمیں خود اس ملک کے بارے میں بھی بہت سی معلومات ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

''ویسے تو موریشس جنوبی افریقہ سے قریب ہے مگر ایک تو جنوبی افریقہ پر عرصے تک برطانوی سامراج کے اثر کی وجہ سے اور دوسرے خود موریشس پر پہلے فرانسیسی غلبے اور بعد کے زمانے میں برطانوی حکومت کے سبب وہاں کا پورا اندازِ زندگی رفتہ رفتہ مغربی ممالک جیسا ہوگیا۔'' (ص 19)

''1833 میں ہندوستانی مزدوروں کا جو پہلا جتھہ موریشس پہنچا تھا اس میں مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ان میں 1120 مرد، 61 خواتین، 22 لڑکے اور گیارہ لڑکیاں تھیں۔ یہ سب لوگ پانچ سال کے معاہدے کے ساتھ موریشس پہنچے تھے اور ان کی تنخواہ ۱۰ روپے ماہوار طے ہوئی تھی جس میں 5 روپے نقد ملتے تھے اور باقی 5 روپے کے عوض کپڑا اور کھانا ملا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر 1833 اور 1922 کے درمیان ہندوستان سے ساڑھے چار لاکھ مزدور موریشس پہنچے تھے۔'' (ص 17)

ان مہاجرین کی زندگی کے بارے میں عنایت حسین عیدن نے چند سال پیشتر 'اپنی زمین' کے نام سے ایک ناول لکھا تھا۔ ہندی میں بھی اس سلسلے میں بعض تحریریں سامنے آئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی محسوس کی جارہی تھی کہ 'اپنی زمین' کی جدوجہد کی زندگی کے بعد آہستہ آہستہ ان مہاجرین کی زندگی کے خوش گوار دنوں کے آنے سے متعلق اور اس کے بعد موجودہ دور میں انہی مہاجرین کے ترقی کر کے ملک کے صدر اور وزیر اعظم وغیرہ بننے کی داستان ایک Triology کی شکل میں لکھی جاتی۔ ڈاکٹر قاسمی کے اس سفرنامے میں وہاں کی دو مختلف نسلوں کی زندگی کی خوب صورت عکاسی ملتی ہے جو مذکورہ Triology کا حصہ ہوسکتے ہیں۔ ان میں ایک طرف لال محمد صاحب، عیدن صاحب، صابر گودر صاحب، جمن صاحب، رابعہ بودھن، ریحانہ عیدن وغیرہ بزرگ ہیں تو دوسری طرف نسرین، ناظرین، شاہین اشرف، مہتاب آرا اور نظیر علی وغیرہ نوجوان ہیں۔ ان سب کی خوشیاں اور غم، ماضی اور حال اور مشرق اور مغرب کی کش مکش اپنی جڑوں سے وابستگی اور مستقبل پر نظر وغیرہ ایک شاندار ناول کا موضوع ہیں۔ ڈاکٹر قاسمی نے جس تفصیل اور جزئیات نگاری کے ساتھ اس سفرنامے میں ان کی زندگیوں کا احاطہ کیا ہے، شاید یہ امید بے جا نہ ہو کہ وہ ان کی زندگی پر ایک بھرپور ناول لکھ سکیں۔ فی الحال اس سفرنامہ میں ہم اس کی ابتدائی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ بعض افراد اور واقعات کا ذکر بار بار آیا ہے ان کی تکرار ناگوار گزرتی ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''خوابوں کا جزیرہ موریشس'' ڈاکٹر قاسمی کی ایک خوب صورت تحریر ہے جسے ہم اردو کے سفرناموں میں ایک خوب صورت اضافہ کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس خوب صورت تحریر کے لیے وہ اور ان کے شریکِ سفر دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اپنے دائرے کا آدمی

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر عظیم راہی

صفحات: 173، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014

مبصر: زین البشر انصاری 19K، احاطہ سنگی بیگ، شاہ گنج، لکھنؤ

ہر عہد میں انسان اپنی دلچسپی کے لیے کچھ نہ کچھ قصے، کہانیاں سننے، لکھنے اور پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ فرصت کے لمحات میں کچھ نہ کچھ لکھتا پڑھتا رہتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے میں کافی تبدیلی ہوتی گئی۔ موجودہ عہد میں لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ طویل قصے کہانیاں، ناول وغیرہ کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اس لیے ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آتی گئی، مختصر افسانے کو اسی تناظر میں بھی دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عظیم راہی کا تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ 'اپنے دائرے کا آدمی' ہے۔ اس میں انھوں نے عوام کے مسائل کو انھیں کی زبان میں بیان کیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں بہت کم وقت میں پڑھا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں کی ایک خاص خوبی ہے کہ مطالعہ کرتے وقت قاری کی دلچسپی کافی بڑھ جاتی ہے۔ یعنی ان افسانوں میں تجسس کا عنصر نمایاں ہے۔ کتاب میں شامل افسانوں میں زندگی کی تڑپ اور اس کا معصوم احساس، خوشی کے آنسوں اور زندگی کے پیچیدہ مسائل کو خاص انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ عظیم راہی کا کمال ہے کہ جن مسائل پر اور لوگ اپنے قلم کا جادو دکھانے سے گھبراتے ہیں انھوں نے انھیں مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر بیان کیا ہے۔ جتنے نازک موضوعات کا وہ انتخاب کرتے ہیں اسے اتنی ہی باریکی سے بیان کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی شروع سے لے کر آخر تک قائم رہتی ہے۔

زیر تبصرہ افسانوں کے مجموعے میں کل افسانوں کی تعداد اکیس ہے جن میں زندگی کا نور، معصوم احساس، دائرے کا آدمی، خوشی کے آنسوں، تیر نیم کش، زندگی کے درمیاں، اپنے حصے کا منظر، زندگی کے راستے پر، مذاق کی حقیقت، سراب زندگی، نئی امید کا سورج، انجام، ایک آئینے کی دو تصویریں، آئینے سے باہر، جاگتی آنکھوں کے خواب، نئی صدی کے موڑ پر، اپنے ہونے کا جواز، حقیقت اور سراب کے درمیان، اجنبی رشتوں کی پہچان، معصوم چہرے کا کرب، رشتے اپنے پرائے، شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ ''نئی امید کا سورج'' میں زندگی کے ان مسائل پر بحث کی ہے جب انسان ساری کوشش کرنے کے بعد تھک جاتا ہے اور وہ ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کو ہر طرف ناامیدی ہی دکھائی دیتی ہے اس کو بہت ہی نئے انداز و زاویہ نگاہ سے پیش کرتا ہے جب تھک جاتا ہے کافی محنت کرنے کے بعد تو اس کو پھر سے ایک نئی امید دکھائی دیتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کو کبھی بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ دور حاضر میں کرپشن اتنا زیادہ ہے کہ رشوت کے بغیر کوئی کام ہی نہیں ہوتا ہے۔ اپنے افسانے 'نئی زندگی' میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ:

''ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نوکری کے لیے تم کتنی رقم دے سکتے ہو؟ اب سمجھے مسٹر ناسمجھ۔ یہ سن کر ایک پل کے لیے وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا لیکن دوسرے لمحے اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا۔ (کتاب: اپنے دائرے کا آدمی، ص 88)

ڈاکٹر عظیم راہی جس طبقے کے مسئلے کو اپنے افسانے میں پیش کرتے ہیں اس طبقہ کی زبان کا خیال بھی کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل ایک افسانہ جس کا عنوان 'اپنے دائرے کا آدمی' ہے اور یہی نام کتاب کا بھی ہے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں مسائل کو ایک نئے انداز سے بیان کیا ہے۔ یعنی آج کا انسان اپنی برتری کے لیے ایسی بہت سی باتیں کرتا ہے جس سے اس کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر وہ کسی نیچی ذات سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اپنی اصلیت بتانے کے بجائے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور اپنے آپ کو اونچی ذات میں شامل کرتا ہے۔ انسان کا یہ احساس بہت سے مسائل کو جنم دیتا ہے۔ اس افسانے کا بنیادی مسئلہ یہی ہے۔

اسی طرح 'معصوم چہرے کا کرب' میں زندگی کے گوناگوں حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو ہر ایک آدمی اپنے معمول کی زندگی میں روزانہ شامل کرتا ہے۔ ان واقعات کو پڑھنے کے بعد سے حقیقتاً انسان کو ایک نئی سوچ اور نئے خیالات کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور معاشرے کو ایک نئی منزل مقصود سے روشناس کراتے ہیں۔

آج ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اسے ہم اطلاعاتی عہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ فی زمانہ اطلاعتی ٹکنالوجی نے زندگی کی مصروفیات کو انگلیوں تک محدود کر دیا ہے۔ دنیا عالمی گاؤں کا منظرنامہ پیش کر رہی ہے۔ تخلیقی ادب اس طرح کی سماجی سچائیوں سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔ ان افسانوں کے درون میں کہیں نہ کہیں نئی دنیا کے ان حوالوں کی گونج ضرور موجود ہے اور ان افسانوں کا اختصار بھی اس بات کا غماز ہے۔

امید ہے افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک اہم ادبی تحفہ ثابت ہوگا۔

تم اب بھی

مصنف: سراج فاروقی

ضخامت: 160 صفحات، قیمت: 150 روپے

ناشر: نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی

مبصر: کوثر جہاں، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سراج فاروقی کا پورا نام سراج الدین فاروقی ہے اور ان کا آبائی وطن الہ آباد یوپی ہے اور وطن ثانی رائے گڑھ مہاراشٹر ہے۔ زیرنظر کتاب 'تم اب بھی؟' سراج فاروقی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں سترہ افسانے اور 'یہ تو آغاز ہے' کے عنوان سے م ناگ، 'سراج فاروقی: جہان افسانہ میں ایک اضافہ' کے عنوان سے اشتیاق سعید اور 'سراج فاروقی کا پہلا قدم' کے عنوان سے عبدالباری ایم کے کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ ان تینوں حضرات نے اپنے الفاظ میں سراج فاروقی کے افسانوں کا تعارف پیش کیا ہے اور کسی حد تک ان پر تبصرہ بھی کیا ہے جو سراج فاروقی کے افسانوں کے مزاج کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔ 'بیان اپنا' کے تحت سراج فاروقی نے افسانہ لکھنے کے وجوہات اور متذکرہ مجموعہ کے زیور طباعت سے آراستہ ہونے کی داستان بیان کی ہے۔

سراج فاروقی نے متوسط طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اس طبقے کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں رشتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ رشتوں کی شکست و ریخت کا بیان مختلف پیرائے میں کرتے ہیں۔ اپنے تجربات و مشاہدات پر مبنی ان افسانوں میں سراج فاروقی نے نہایت ہی سادگی سے رشتوں کی پیچیدگی اور حالات کے الجھاؤ کو پیرویا ہے اور غیر ضروری جزیات سے پرہیز کیا ہے۔ اس مجموعے کے بیش تر افسانوں مثلاً 'وفا کا بدلہ'، 'میں عورت ہوں'، 'فرض'، 'ستیہ پرکاش'، 'ہنومان'، 'آتش نمرود' اور 'ایک کربلا اور' کا موضوع فرقہ وارانہ تشدد ہے، جس میں انھوں نے مختلف زاویہ سے فسادات میں رونما ہونے والے دردانگیز واقعات کو پیش کیا ہے۔ افسانہ 'فرض' میں کچھ تشدد پسند لوگوں نے ایک ہسپتال پر قبضہ کر لیا ہے تاکہ وہاں مسلمان زخمیوں کا علاج نہ ہو۔ اس ہسپتال کے سربراہ اور ڈاکٹر گجیند رسنگھ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ وہاں صرف ہندوں کا علاج کریں مگر ڈاکٹر گجیند رسنگھ کی انسانیت اور ان کا فرض اس بات کو گوارا نہیں کرتا اور کافی پس وپیش کے بعد وہ مسلمان زخمیوں اور مریضوں کو کا علاج کرنا شروع کرتے ہیں اور خود کو مطمئن اور آسودہ پاتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ 'ایک کربلا اور' میں سیف الدین اپنی بستی میں بسے دس پندرہ ہندوں کے گھر کی حفاظت اپنی جان کی قربانی دے کر کرتا ہے۔

اس کے علاوہ طبقاتی کشمکش، مذہبی رنجش اور جنسی استحصال پر بھی سراج فاروقی نے قلم اٹھایا ہے۔ 'یہ نہ تھی ہماری قسمت' اور 'سازش' مذہبی رنجش پر مبنی افسانے ہیں جو پرتاثیر اور دل کو چھونے والے ہیں۔

'گہری چال'، 'شعور آسودگی'، اور 'عزت' جنسی استحصال کا درد بیان کرتے ہیں۔ 'عزت' میں ایک غریب گھر کی لڑکی کا استحصال اس کے گھر والے ہی کرتے ہیں۔ اس کی عزت اس کے اپنے رشتے داروں کے ہاتھ تارتار کی جاتی ہے۔ جس پر اسے افسوس بھی ہوتا ہے مگر بعد میں اسے اس میں مزا بھی آنے لگتا ہے۔ اس مزے کے باوجود وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کے پاس بے حساب دولت ہے پھر بھی وہ خالی ہاتھ ہے۔ 'گہری چال' بھی جنسی استحصال کی کہانی بیان کرتی ہے۔ جس میں ایک معصوم لڑکی کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ افسانہ 'شعور آسودگی' میں جنسی ناآسودگی کے باعث پیدا ہونے والی جنسی کج روی کا تذکرہ ہے۔ جب کہ افسانہ 'تم اب بھی؟' کا مرکزی خیال محبت ہے۔

سراج فاروقی نے افسانے کسی نہ کسی مقصد کے تحت لکھے ہیں۔ زیادہ تر وہ مقصدیت کو اپنے فن پر حاوی ہونے نہیں دیتے مگر کہیں کہیں ان کا مقصد فن پر حاوی ہو گیا ہے جس سے افسانے کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے۔

زبان و بیان پر سراج فاروقی کو قدرت حاصل ہے۔ وہ سادہ اور عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں اور بے جا آرائش سے کام نہیں لیتے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر سراج فاروقی مزید طبع آزمائی کرتے رہے تو ادب میں کچھ اچھی کہانیوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ زیرنظر مجموعے کی سبھی کہانیاں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں اچھی ہیں مگر انھیں اور اچھا بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال سراج فاروقی کو ان کے پہلے افسانوی مجموعے پر دلی مبارک باد!

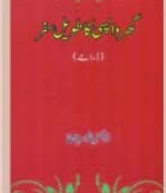

گھر واپسی کا طویل سفر

مصنف: ڈاکٹر بانو سرتاج

صفحات: 368، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف علامہ اقبال اسٹریٹ، یوپی 244302

اردو کے قارئین کو دیگر زبانوں کے علمی اثاثے سے محظوظ و مستفیض ہونے کے مواقع اردو کے قلم کاروں میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ کا ہے۔ ڈراموں پر مشتمل ان کا مجموعہ 'گھر واپسی کا طویل سفر' تعارف و تبصرہ کی حیثیت سے اس وقت راقم کے پیش نظر ہے۔

اس کتاب میں اردو اور دیگر زبانوں سے ترجمہ شدہ کل 21 ڈرامے ہیں۔ جن میں ہندی، مراٹھی، انگریزی، گجراتی اور بنگالی زبانوں میں تحریر کیے گئے کچھ شاہکار ڈراموں کے ساتھ ہی اردو کے بھی چند ڈرامے شامل ہیں۔ فہرست میں ہی اس بات کی نشاندہی کردی گئی ہے کہ کون سا ڈرامہ کس زبان سے لیا گیا ہے کیونکہ فہرست میں ڈرامے کے عنوان کے ساتھ ہی اس کی زبان اور مصنف کے نام دے دیے گئے ہیں۔ اس سے قارئین کو کافی سہولت بھی ہوگئی ہے۔ جیسا کہ مؤلفہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان میں کچھ ڈرامے تو خود ان کی اصل زبان سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چند ڈرامے ایسے بھی ہیں۔ جو پہلے کسی دوسری زبان میں منتقل ہوئے تھے۔ پھر ان کو اردو کا قالب پہنایا گیا ہے۔

کتاب میں شامل سبھی ڈرامے کسی نہ کسی طرح سے اہمیت کے حامل ہیں۔ کچھ ڈرامے تفریحی ہونے کے باوجود سبق آمیز بھی ہیں۔ ان میں اندھیر نگری، فیس واپس کرو، کاؤلے سیکنڈری اسکول، چوری ہوئی ہی نہیں، یہ بچہ کس کا ہے؟ مسٹر مرغا و آؤٹ ٹکٹ، ہڑیا باؤس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ قومی یکجہتی پر مبنی ڈرامہ ''کون ہارا؟ کون جیتا؟'' بہت ہی اچھا ہے۔ جس میں ہندوستان جیسے سیکولر ملک کے باشندوں کے لیے بہت ہی درس چھپا ہوا ہے۔ کاش وطن

[redacted]

اس کو خریدا جائے اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ اردو کے باذوق قارئین اس جانب توجہ دیں گے۔ اور کتاب خرید کر مصنفہ و ناشر کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

لفظ لفظ آسمان

مصنف: انور بارہ بنکوی

صفحات: 164، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت 2014

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: خورشید جہاں، 4A/58، وشال کھنڈ چار گومتی نگر، لکھنؤ 226010

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'لفظ لفظ آسمان' 130 غزلوں پر مشتمل ہے۔ اردو غزل گوئی میں 'انور بارہ بنکوی' مقبول و معروف ہیں۔

اگر یہ کہا جائے انور صاحب کو شاعری وراثت میں ملی تو بے جا نہ ہوگا۔ انور صاحب

[redacted]

زریں نامہ

شاعرہ: عفت زریں
صفحات: 255، قیمت: 250 روپے
ناشر: شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر شمیم احمد، سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

شاعری کا مفہوم متعین کرنے کی غرض سے ہمارے یہاں مختلف ناقدین نے جو بحث کی ہے اس سے یہی نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ شاعری جذبات و احساسات کا اظہار ہے۔ یہ دل کی آواز ہے جو دل تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ عفت زریں کے نزدیک ''شاعری خود اپنی تلاش ہے۔''

میں نے اسی تناظر میں عفت کے نئے مجموعۂ کلام 'زریں نامہ' کا مطالعہ کیا۔ ممکن ہے اپنے کلام کے توسط سے وہ اپنی تلاش و جستجو میں کامیاب رہی ہوں، تاہم مجموعے میں شامل غزلیات کا مطالعہ اسی روایتی غزل گوئی تک میری رہنمائی کرتا ہے جس کے موضوعات اور لفظیات پہلے سے طے شدہ ہیں۔ محبت میں ناکامی، ہجر، بے وفائی، اشک، رنج و الم، بے خوابی، ٹوٹنا بکھرنا، تنہائی، مایوسی، حسرت اور اسی نوع کے دیگر موضوعات مذکورہ مجموعے کے نمایاں موضوعات ہیں۔ اس اعتبار سے عفت ایک سچی فنکار ہیں کہ وہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر موضوعات کی تلاش میں اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتی، وہ اپنے دل کی آواز کی طرف توجہ کرتی ہیں اور سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتی جاتی ہیں۔ وہ واقعات کی دنیا میں رہ کر شاعری کرتی ہیں مفروضات سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ عفت کی غزلیات تین محاسنِ شعری سے عبارت ہیں: اصلیت، سادگی اور بلندیِ خیال۔ 'زریں نامہ' کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ کسی کلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے موضوعات کا تنوع ضروری نہیں، اصل چیز حسنِ بیان ہے۔ عفت کے یہاں مذکورہ محاسن کی مثالیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں:

مکھڑا جو سامنے تھا وہ جانے کہاں گیا
گدلا سا ایک نقش جو تھا کائنات کا

عفت جذبات کے اظہار میں انسانی فطرت کا اتباع کرتی ہیں، وہ جانتی ہیں کہ جذبات فطرت کے خلاف ہوں گے تو کلام میں اصلیت نہیں رہے گی، نتیجتاً کلام اثر سے عاری ہو جائے گا۔ تاہم یہ بھی ہے کہ محض اصلیت کافی نہیں۔ شاعر کا کام ہے اصلیت میں دلکشی پیدا کرنا تاکہ شاعرانہ اصلیت اور حکیمانہ حقیقت میں فرق ہو۔

خیال کا پیچیدگی اور الجھاؤ سے پاک ہونا سادگی ہے اور سادگی دہلوی دبستان کی امتیازی شان رہی ہے۔ عفت دہلوی شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی باطنی سادگی صرف سادہ الفاظ یا سادہ بیانی سے عبارت نہیں ہے بلکہ وہ گناہ گار کو بھی بے قصور بنا دیتی ہے:

بے گناہ وہ بھی تھا بے قصور تھے ہم بھی
کس نے قید کر دی ہے زندگی سوالوں میں

بلندیِ خیال سیدھی سی بات کو پیچ دینا، دور از کار استعارے استعمال کرنا یا خلافِ قیاس مبالغے سے کام لینا نہیں بلکہ یہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور کائنات کے وسیع مشاہدے سے عبارت ہے۔ اس لیے وہ کہتی ہیں:

میں خود الم پسند ہوں کیا کیجیے اسے
دنیا جہاں کے غم تھے جو دل میں سمٹ گئے

'زریں نامہ' میں شامل آزاد نظمیں بھی انھیں داخلی کیفیات کا بیان ہیں۔ یہ مجموعہ کلام قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے اور وہ خود کو ان تجربوں میں شریک محسوس کرتا ہے جن کا بیان عفت نے کیا ہے۔

اُردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت

مصنف: ڈاکٹر محمد عمر رضا
صفحات: 332، قیمت: 400
ناشر: کتابی دنیا، نئی دہلی
مبصر: ترنم جہاں شبنم، R-24/7، چوتھی منزل، ذاکر نگر جوگا بائی ایکسٹینشن، نزد قادری مسجد جامعہ نگر نئی دہلی 25

اُردو نے جس دور میں اپنا وجود قائم کرنا شروع کیا وہ دور شاعری کا دور تھا۔ جس کے نتیجے میں اُردو نے شاعری میں فروغ حاصل کرتے ہوئے ایک لمبا سفر طے کیا۔ اُردو شاعری کی اس مقبولیت کے زیرِ اثر دیگر اصناف شاعری سے کہیں پیچھے رہیں۔ مگر وقت کے ساتھ آئی تبدیلیوں نے بہت کچھ بدلا۔ انگریزوں اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ میر امن کی باغ بہار نے اُردو نثر میں دھوم مچائی تو وہیں 1843 میں دلّی کالج میں ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے تحت نصابی کتابوں کی غرض سے جو کام ہوا اس نے اُردو نثر کو وسعت بخشی۔ غیر افسانوی نثر سے جو لوگوں کی جو عدم توجہی تھی وہ ختم ہوئی اور لوگوں کا دھیان دیگر اصناف کی طرف بڑھا۔

غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے جس نثر کی بنیاد رکھی تھی اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، مولوی چراغ علی، مولوی عبدالحق وغیرہ نے دیگر نثری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جس کے نتیجے میں تنقید، صحافت، انشائیہ نگاری، مضمون نگاری، روزنامچہ نگاری، مکتوب نگاری، سفر نامہ نگاری، خودنوشت نگاری، رپورتاژ نگاری، خاکہ نگاری اور سوانح نگاری جیسی اصناف کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

ایسی بہت سی معلومات فراہم کراتی زیرِ تبصرہ کتاب اُردو میں سوانح ادب: فن اور روایت ڈاکٹر عمر رضا کی 2010 میں شائع اُردو میں سوانح ادب: فن اور روایت: کا ہی ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ 332 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے سوانح ادب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سوانح ادب کی تاریخی، سیاسی و سماجی ثقافتی، نفسیاتی، اخلاقی، اور جمالیاتی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اس کی اقسام کی وضاحت کرتے ہوئے سوانح ادب کی تعریف کچھ اس طرح پیش کی ہے۔

''جدید نثری اصناف میں روزنامچہ نگاری، مکتوب نگاری، سفرنامہ نگاری، خودنوشت نگاری، رپورتاژ نگاری، خاکہ نگاری اور سوانح نگاری کا تعلق سوانح ادب، (Biographical Literature) سے ہے جن میں مصنف خود اپنی یا کسی دوسرے کی زندگی کے کسی ایک گوشے یا مکمل حالات و واقعات کو تحریری طور پر منظرِ عام پر لاتا ہے۔''

سوانح ادب پر اگر کچھ تلاش کریں تو بہت کم مواد حاصل ہوتا تھا۔ ایسے میں سوانح ادب پر بھرپور مواد فراہم کرتی ڈاکٹر عمر رضا کی سوانح ادب پر لکھی گئی کتاب 'اردو میں سوانح ادب: فن اور روایت' قابلِ ستائش ہے۔ اب تک کی سوانح ادب پر لکھی گئی کتابوں میں ایک منفرد مقام حاصل کیے ہوئے ہے۔ جس کو اس کی پہلی اشاعت پر ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور پاکستانی ناشر فکشن ہاؤس نے 2012 میں اس کا عکسی ایڈیشن بھی شائع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں اس پر مصنف نے بھرپور محنت کی ہے۔ سوانح ادب پر کام کرنے والے اسکالرس اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک خوشخبری ہے جہاں ان کی ضرورت

اور دلچسپی کا سارا سامان اس میں انھیں ملے گا۔ مولوی مظہر علی سندیلوی، اختر انصاری دہلوی، خواجہ احمد عباس، اسداللہ خاں غالب، سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی سے اپنا سفر شروع کرتی اس کتاب میں مذہبی خودنوشت، تاریخی خودنوشت، سیاسی وسماجی خود نوشت، افسانوی اور ادبی وفکری خودنوشت کے آغاز وارتقا سے لے کر فن رپورتاژ نگاری میں سجاد ظہیر، کرشن چند، قرالعین حیدر، عصمت چغتائی کو پڑھیں گے تو فن خاکہ نگاری کے حوالے سے مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، مجتبیٰ حسین جیسے بڑے فنکاروں کے فن سے روبرو ہونے کا موقع ملے گا۔

سوانح نگاری کے آغاز وارتقا، سوانح عمری کی قسمیں، مذہبی سوانح عمری، تاریخی سوانح عمری، سیاسی وسماجی سوانح عمری، افسانوی سوانح عمری اور ادبی وفکری سوانح عمری غرض سوانح ادب کے حوالے سے ایسا کیا ہے جسے مصنف نے نظر انداز کیا ہو۔ شاید کچھ نہیں۔ ایسی خوبصورت اور جامع اشاعت کے لیے کتاب کے مصنف ڈاکٹر عمر رضا قابلِ مبارک باد ہیں۔

عالمی یوم اردو یادگار مجلہ

خصوصی پیش کش، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حیات وخدمات
مجلس ادارت: سہیل انجم، جاوید اختر، ڈاکٹر سید احمد خان
صفحات: 104، قیمت: ندارد، سنہ اشاعت: 9 نومبر 2014
ناشر: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا واردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن
D-49 نیو سیلم پور، نزد: شہید اشفاق اللہ خان پارک، دہلی 53
مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، 1210 گلی محل سرائے، پنجابی پھاٹک، بلّی ماران، دہلی 6

9 نومبر شاعر مشرق علامہ اقبال کا یومِ پیدائش ہے جسے عالمی سطح پر یومِ اردو کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا واردو ڈولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے 9 نومبر 1997 سے اسے عالمی یومِ اردو کے طور پر منائے جانے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ اس موقعے پر یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا، اردو ڈولپمنٹ آرگنائزیشن کے اشتراک سے ہر سال ایک تاریخی مجلّہ شائع کیا جاتا ہے جس میں کبھی کسی خاص موضوع پر اور کبھی کسی اہم شخصیت پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس مرتبہ یہ خصوصی مجلّہ معروف مجاہد آزادی، مجاہد ملّت، سابق ممبر پارلیمنٹ وسابق ناظم اعلیٰ جمعیت علماء ہند ’مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، حیات وخدمات‘ عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں کچھ مضامین عصر حاضر کے قلمکاروں کے شامل کیے گئے ہیں اور بقیہ مضامین 1963 میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال کے بعد، روزنامہ ’الجمعیۃ‘ کی جانب سے شائع خصوصی شمارہ ’مجاہد ملّت نمبر‘ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دو درجن سے زائد مضامین پر مشتمل اس خصوصی مجلّے کو ملک کی نصف درجن سیاسی، ادبی و مذہبی سرکردہ شخصیات کے پیغامات سے بھی مزیّن کیا گیا ہے جن میں مولانا کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پیغامات میں سے چند کا ذکر جو مولانا کی شخصیت پر مبنی ہیں یہاں کیا جاتا ہے۔ نائب صدر جمہوریہ جناب محمد حامد انصاری تحریر فرماتے ہیں:

’’مولانا حفظ الرحمٰن تحریک آزادی کے سالاروں میں سے تھے ان کی پر جوش تقریروں علمی انداز بیاں اور منصفانا صحافتی تحریروں نے ملک وقوم کی بڑی خدمات انجام دیں۔ آزادی کے بعد ان کی بے باک تحریروں نے ہمیں بیدار رکھنے اور قومی وقار کو برقرار رکھنے کی ایک ناقابل فراموش راہ دکھائی جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔‘‘

ملک کی نصف درجن سیاسی، ادبی و مذہبی سرکردہ شخصیات کے پیغامات کے علاوہ دیگر جو مضامین اس خصوصی مجلّہ میں شامل کیے گئے ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

(1) ’حرف اول‘ سہیل انجم (2) ’حرف چند‘ ڈاکٹر سید احمد خاں (3) ’سکریٹری اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزشن کے نام ایک خط‘ (4) ’بلند تر ہے ستاروں سے اس کا کاشانا‘ پروفیسر عبدالحق (5) ’مجاہد ملت: بچپن سے طالب علمی تک‘ محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی (6) ’مجاہد ملّت کی ایک پر مغز اور نایاب تقریر‘ صادق علی قاسمی بستوی (7) ’مجاہد ملّت کی علمی وقائدانہ بصیرت‘ عزیز الحسن صدیقی (8) ’مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن کا قائدانہ کردار‘ جلال الدین اسلم (9) ’عہد وتاریخ ساز، ملّت پناہ، حفظ الرحمٰن‘ ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی (10) ’ہر رہ گزر پہ تیرے گزرنے کا حسن ہے....‘ محمد جسیم الدین (11) ’مجاہد ملت: ایک نظر میں‘ مرغوب حسین ناصر (12) ’مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا اسلوب نگارش‘ عبداللہ عثمانی (13) ’مجاہد ملّت: ایک بے باک قائد اور مجاہد رہنما‘ نجیب اللہ قاسمی (14) ’مجاہد ملّت، ہمدرد انسانیت‘ عمران عاکف خان (15) ’اردو کا عاشق، اردو کا خادم، اردو کا مجاہد‘ ابرار احمد اجراوی (16) ’ذات تھی جس کی فہم وفراست وہ حفظ الرحمٰن کہاں؟ (منظوم خراج عقیدت)‘ مولانا مجیب بستوی (17) ’غزل‘ (ارشد غازی)، ’ترانہء اردو زبان‘ (قمر الدین ذاکر)، (18) ’آہ! مولانا حفظ الرحمٰن‘ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب (1) ’مولانا حفظ الرحمٰن‘ مولانا عبدالماجد دریابادی (20) ’میرے مشاہدے‘ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (21) ’ایک عظیم محبّ وطن‘ شام ناتھ (22) ’یاد مجاہد ملّت: ایک سبق آموز عنوانِ حیات‘ علامہ انور صابری (23) ’عالم، مجاہد، مفکر‘ مولانا عبدل وہاب آروی (24) ’مولانا حفظ الرحمٰن کی سیاسی بصیرت‘ ڈاکٹر سید محمود (23) ’مولانا حفظ الرحمٰن: میری نظر میں‘ سری گوپی ناتھ امن لکھنوی (26) ’سراپا درد واخلاص‘ حکیم محمد مختار اصلاحی مرحوم (27) ’اردو اور طب یونانی: لازم و ملزوم‘ پروفیسر حکیم سعد عثمانی (28) ’اردو کے حق میں سپریم کورٹ کا تاریخ ساز فیصلہ‘ سہیل انجم (29) ’فہرست عالمی اردو ایوارڈ انعام یافتگان 2014‘ (30) ’ریٹرننگ آفیسر، الیکشن کمیشن نئی دہلی کے نام ڈاکٹر لال بہادر کا ایک دلچسپ خط‘ (31) ’یومِ اردو (9 نومبر 2013) کی سرگرمیاں: ایک نظر میں‘ ڈاکٹر پرواز علوم (32) ’عالمی یوم اردو، استقبالیہ کمیٹی کی فہرست‘ اور ’ممبرشپ فارم (2014)‘

کسی خطۂ زمیں کے لیے غیر ملکی حکومت کی غلامی ایک لعنت ہے جس سے آزادی حاصل کرنا وہاں کے باشندوں کا فرض ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ملک کی آزادی کی خاطر 7 سال جیل میں گذارے اور ملک کی آزادی کے بعد 1947 اور 1948 میں جب دہلی کی ہوا موت کا پیغام بن گئی تھی، انسانیت کی وہ خدمت انجام دی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آزادی کے بعد ملک کے بنانے اور سنوارنے کا کام ہر ہندستانی کا فرضِ اوّلین تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے، دستور سازی میں حصہ لیا اور اپنی وفات تک تین ٹرم پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ مولانا کی علمی وادبی خدمات میں مولانا کی تصانیف ’قصص القرآن‘، ’اسلام کا اقتصادی نظام‘ اخلاق اور فلسفہ اخلاق کافی اہم ہیں۔ بلاشبہ مولانا کی شخصیت اس بات کی حقدار تھی کہ انھیں یاد کیا جائے۔ قابلِ مبارکباد ہیں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا واردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے موجودہ ذمے داران جنھوں نے اس یادگاری مجلّہ کو نا صرف جاری رکھا بلکہ اس خصوصی مجلّہ کے لیے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی شخصیت کا انتخاب کیا اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی حیات وخدمات پر یہ خصوصی مجلّہ شائع کیا۔

قوی امید ہے کہ علمی وادبی حلقوں میں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا واردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی یہ مشترکہ پیش کش قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اس کی خاطر خواہ پزیرائی ہوگی۔

تعارفی تبصرے

ذاکر فیضی

سلطان علاؤالدین خلجی کی دولت آباد (دیوگیری) آمد

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، صفحات: 120، قیمت 65 روپے

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی یہ کتاب سلطان علاؤالدین خلجی کے تاریخی واقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ تمام ابواب کو مختلف عنوانات دے کر سلطان علاؤالدین خلجی کے دور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان دس ابواب کے عنوانات اس طرح ہیں۔ سلطان علاؤالدین خلجی کی پہلی بار دولت آباد آمد، سلطان علاؤالدین خلجی کی ابتدائی زندگی اور تخت نشینی، سلطان علاؤالدین خلجی کا قتل اور علاؤالدین خلجی، سلطان علاؤالدین خلجی پر الزام تراشیاں، سلطان علاؤالدین خلجی اور بزرگانِ دین سے عقیدت، سلطان علاؤالدین خلجی اور امیر خسرو، دیوگری فزائن الفتوح کی روشنی میں، دیوگری خزائن الفتوح کے آئینے میں قلعہ دولت آباد پر ایک نظر، اور آخری باب دہم سلطان علاؤالدین خلجی ماہ وسال کے آئینے میں ہے۔ مصنف نے علاؤالدین خلجی کے حالات زندگی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

ماں کی آنکھ سے ٹپکتا خون

مصنف: پرویز اشرفی، صفحات: 162، قیمت: 97 روپے

زیرِ تبصرہ کتاب ماں کی آنکھ سے ٹپکتا خون پرویز اشرفی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا افسانوں کا انتخاب 'آخری پڑاؤ کا کرب ہے'۔ یہ افسانے اردو کے مختلف رسائل واخبارات کی زینت بن چکے ہیں۔ پرویز اشرفی کا اصل نام پرویز عالم ہے۔ آبائی وطن سسرام بہار ہے۔ مجموعہ 'ماں کی آنکھ سے ٹپکتا خون' میں کل 34 افسانے شامل ہیں۔ جس کہانی 'ماں کی آنکھ سے ٹپکتا خون' پر مجموعہ کا نام رکھا گیا ہے وہ کہانی مصنف نے سب سے آخر میں رکھی ہے۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ پرویز اشرفی کی کہانیاں اصلاحی کہانیاں ہیں جو قاری کو ایک پیغام دیتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے فن کے ذریعے معاشرے میں پھیلی برائیوں کو دور کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملے میں پرویز اشرفی شائستہ اسلوب رواں زبان اختیار کرتے ہیں اور ان کے بیانیہ میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

ترقی کے زینے سائنس اور ٹیکنالوجی

مصنف: عبدالودود انصاری، صفحات: 152، قیمت: 100 روپے

اردو میں افسانوی اور شعری مجموعوں کے علاوہ دیگر موضوعات، معاشیات، عام معلومات، سیاسیات، سیاحت یا سائنس جیسے موضوعات پر کم کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ عبدالودود انصاری نے اس جانب توجہ دی ہے۔ ان کے سائنسی مضامین بچوں کے رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں مضامین کا یہ مجموعہ 'ترقی کے زینے سائنس اور ٹیکنالوجی' اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ عبدالودود صاحب کے نزدیک سائنس کی تعلیم ایک اہم ضرورت ہے۔ جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ کتاب کے اہم مضامین میں قرآن اور سائنسی باتیں، سائنس مسلمانوں کی میراث، سائنس کی باتیں، پارہ ایک رقیق دھات وغیرہ معلوماتی اور اہم ہیں۔ جو بچوں کے لیے دلچسپی کے ساتھ ان کے علم میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

اسٹاف روم کی سیاست : مسائل اور تدارک

مصنف: ڈاکٹر عبدالماجد انصاری، صفحات: 80، قیمت: 60 روپے

مذکورہ کتاب 'اسٹاف روم کی سیاست: مسائل اور تدارک' اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی اردو میں پہلی اور منفرد کتاب ہے جو کہ تحقیقی اعداد وشمار پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر عبدالماجد انصاری نے ایک سیمینار میں 'اسٹاف روم کی سیاست: خاتمہ کیسے ہو' کے عنوان پر کچھ گزارشات پیش کی تھیں۔ سیمینار پڑھے جانے والے مقالے کی تیاری میں جب عبدالماجد انصاری نے مواد کی تلاش شروع کی تو انھیں حیرت انگیز انکشافات ہوئے، انھوں نے پایا کہ اس موضوع پر اردو میں تو کیا شاید ہندوستان کی کسی زبان میں کتاب موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس موضوع پر مضامین شائع ہوئے اور نہ ہی کسی طرح کے اعداد وشمار کے لیے کوئی سروے کرایا گیا ہے۔ تب ان کے دل میں خیال آیا کہ اس موضوع پر کام ہوسکتا ہے۔ 80 صفحات کی مذکورہ بالا کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کی ترتیب اس طرح ہے۔ اساتذہ کا اسٹاف روم، تعلیمی اداروں اور اسٹاف روم کا ماحول، اسٹاف روم کی سیاست، اسٹاف روم کے ماحول اور اس کے اثرات پر تحقیقی جمع شدہ دلچسپ اعداد وشمار، کچھ اہم تجاویز، مشورے اور سفارشات اور آخری باب مثالی تدریس کے گر وغیرہ ہیں۔

پونا یا ترا

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، صفحات: 48، قیمت: 50 روپے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی درجنوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں جولائی 2013 میں شائع ہوئی ان کی کتاب 'پونا یا تیرا' ا ایک سفرنامہ ہے۔ محض 48 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں 'گفت باہمی' میں نذیر فتح پوری لکھتے ہیں کہ مناظر صاحب کا پونا سے چار دہائیوں کا ادبی رشتہ ہے۔ جب ان کا رسالہ 'کوہسار' جاری ہوا تھا اس کے ساتھ یہ رشتہ استوار ہوا۔ رشتہ ایک ایسا شجر ہے جس کی آبیاری دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ تب جا کر یہ شجر ثمر یاب ہوتا ہے۔ مصنف نے اپنے اس پورے سفرنامے میں پونا کے قابل ذکر مقامات کا اختصار سے ذکر کیا ہے، جیسے شنیوارواڑا، یہ پیشواجی کا مستقر تھا، پروتی ھلاور مندر یہ پونا کے سب سے اونچے مقام ہے۔ یہاں پر چار مشہور مندر ہیں۔ دیویشور، لارڈ کرنیکیا، وشنو اور وپرتھل، ان کے علاوہ پربھات میوزیم، آغا پیلس، سارس باغ اور مندر، برٹش لائبریری کے بارے میں معمولی سی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

گونوجھا کے قصّے اور دوسری کھانیاں

مصنف: صدر عالم گوہر، صفحات: 112، قیمت: 70 روپے

زیرِ نظر کتاب صدر عالم گوہر کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ صدر عالم گوہر کا تعلق مدھوبنی بہار سے ہے۔ آپ اردو ہندی کے علاوہ میتھلی زبان کے بھی ادیب وشاعر وصحافی ہیں۔ ان کی نظمیں، غزلیں، افسانے، بچوں کی کہانیاں، تراجم وغیرہ اردو، ہندی اور میتھلی کے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں گونوجھا کے نام سے ایک مستقل کردار ہے۔ جو اس کتاب کی تمام کہانیوں میں موجود ہے۔ بچوں کے لیے یہ سبق آموز کہانیاں ان کی ذہنی تربیت کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں مزاح کا پہلو بھرپور موجود ہے۔ اس کتاب میں 'نیا دوست' کے نام سے ایک نظم بھی شامل کی گئی ہے۔ جس میں کتاب کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ داستانوی انداز میں لکھی گئی یہ کہانیاں یقیناً بچوں کے لیے ایک اچھا تحفہ ہیں۔

اشرف چاچا کی چودہ کہانیاں

مصنف: چودھری وہاج احمد اشرف، صفحات: 104، قیمت: 65 روپے

کتاب 'اشرف چاچا کی چودہ کہانیاں' ڈاکٹر چودھری وہاج اشرف کے ذریعے لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے اس میں کل چودہ کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ اس میں کئی کہانیاں بچوں کے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور چند کہانیاں غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ آپ کا تعلق سیوہارہ ضلع بجنور سے ہے۔ آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس کتاب کی پہلی کہانی 'کچھوے اور خرگوش کی دوڑ' ہے۔ جس میں کچھوے اور خرگوش کی کہانی کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح دیگر کہانیوں آدھے پیسے کی قیمت، بچہ کی قربانی، چڑیوں کا شکار، دانت کی قیمت اور اشرف چاچا نے چور پکڑا وغیرہ اصلاحی کہانیاں ہیں جو بچوں کو کوئی نا کوئی سبق دیتی نظر آتی ہیں۔

کرناٹک میں جدید اردو نظم

مصنف: علیم صبا نویدی، صفحات: 120

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ مذکورہ کتاب میں کرناٹک میں کی جانے والی جدید اردو نظمیہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف علیم صبا نویدی ہیں۔ علیم صبا نویدی جنوبی ہند کے معروف ادیب، شاعر اور ناقد ہیں۔ انھوں نے کرناٹک میں عصر حاضر میں کی گئی جدید نظم نگاری پر گفتگو کی ہے۔ جن شعرا حضرات کے فن پر بحث ہوئی، ان کی ترتیب میں مصنف نے تاریخ پیدائش کو مدنظر رکھا ہے۔ علیم صبا نویدی نے اس کتاب میں ان شعرا کی فنی وفکری جہتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے نظموں کی داخلی کیفیات وخارجی ماحول پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مذکورہ بالا کتاب میں زیر بحث شعرا کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں، محمود ایاز، ضیا میر، حمید الماس، راز امتیاز، حمید سہروردی، خلیل مامون، خمار قریشی، ماہر بغور، ساجد حمید، جبار جمیل، اکرام کاوش، رزاق اثر، سلیمان خمار، جلیل تنویر، شائستہ یوسف، حامد اکمل، تنہا تماپوری، حسنی سرور اور آفاق عالم صدیقی ہیں۔

حج بیت اللہ شریف

مصنف: ارشد علی انصاری اعظمی، صفحات: 80، قیمت 50 روپے

زیرِ نظر کتاب 'حج بیت اللہ شریف' ارشد علی انصاری اعظمی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے حج پر جانے والے حضرات کے لیے کئی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ بقول مصنف ان کا بچپن اور طالب علمی کا زمانہ دینی اور ادبی ماحول میں گزرا۔ پنج وقتہ با جماعت نماز کی پابندی، مسجد میں اذان دینا اور کلام پاک کی تلاوت ابھی تک قائم ہے۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں بہت سے عناوین قائم کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ 2005 میں جب وہ حج کو گئے تھے، اس وقت ان کے سامنے ایک حادثہ پیش آیا تھا، اس جانکاہ حادثے کا ذکر بھی انھوں نے کیا ہے۔

مصنف نے جو عنوانات قائم کر کے گفتگو کی ہے، وہ کچھ اس طرح ہیں: انڈین ڈسپنسری، زیارت غار ثور، مسجدِ عائشہ، جم غفیر، مدرسہ صولتیہ، مسجد حرام کے مینار اور گیٹ، ہاتھ کٹے معذور لوگ جیب کتروں کے ظلم کے شکار، ایک مسئلہ اور اس کی وضاحت، اوقات پنج وقتہ مسجدِ حرام، ایک چار منزلہ بلڈنگ کا انہدام، منیٰ کے لیے روانگی، میدان عرفات میں، مزدلفہ میں، واپس منیٰ میں، حجرہ عقبہ کی رمی، تینوں جمرات کی کنکریاں مارنا، رمی کے وقت دردناک حادثہ، وغیرہ۔ کتاب کے آخری صفحات میں حج کے مقاصد وفوائد پر علما کی رائے کے عنوان سے حج کے مقاصد اور فوائد کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

ناگپور میں بچوں کا ادب

مصنف: ڈاکٹر اشفاق احمد، صفحات: 136، قیمت 100 روپے

تقریباً بیس کتابوں کے مصنف ڈاکٹر اشفاق احمد پیشے سے مدرس ہیں ان کی کتاب 'ناگپور میں بچوں کا ادب' میں شہر ناگپور میں بچوں کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ناگپور کے ادبی جائزے کے ساتھ ہی وہاں کے معتبر ادیبوں کی مختلف تخلیقات کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کہانیوں میں وکیل نجیب، ڈاکٹر اشفاق احمد، شریف احمد شریف، م ناگ، ڈاکٹر محمد ابوالکلام، فرزانہ اسد اور ڈاکٹر شمیم امبر کی کہانیاں موجود ہیں۔ 'ڈرامے' کے عنوان سے شامل باب میں وکیل نجیب، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، ڈاکٹر اشفاق احمد، ضیاء اللہ خاں لودھی، محمد غلام رسول اشرف وغیرہ کے ڈرامے موجود ہیں۔ نظموں کے حصے میں ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن منشا، وکیل نجیب، شریف احمد شریف، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، محمد غلام رسول اشرف، ظہیر عالم، مسعود احمد جھابڑ، عرفان صدیقی، عبدالصمد قیصر، ریاض الدین کامل، شیخ محمد ہاشم وغیرہ کی خوبصورت اور دلکش نظمیں پیش کی گئی ہیں۔

گستاخی معاف (مجوعہ طنز و مزاح)

شاعر: ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمی، صفحات: 112، قیمت: 200 روپے

صوبہ بہار کے ایک قصبہ سرکی چک ضلع بھوجپور کے ایک ذی علم گھرانے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر مجیب الرحمٰن بزمی کی یہ کتاب طنزیہ ومزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے 'گستاخی معاف!' طنز ومزاح لکھنا یوں ویسے ہی مشکل فن ہے اور اگر وہ نظم میں ہو تو مشکل ترین فن ہو جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن بزمی نے اس کام کو با آسانی انجام دیا ہے۔ یہ طنزیہ ومزاحیہ کلام پڑھتے ہوئے قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ذہن غور وفکر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

اس مجموعے میں 44 غزلیں اور 21 نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چند قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں معاشرے کے مختلف طبقوں اور رہنماؤں کے افعال وکردار کو طنزیہ انداز میں ظاہر کیا ہے۔

ارشد مینا نگری ایک جامع الکمالات قلم کار

مصنف: ڈاکٹر محبوب راہی، صفحات: 112، قیمت: 125 روپے

ڈاکٹر محبوب راہی ایک اچھے شاعر، افسانہ نگار اور ناقد ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب 'ارشد مینا نگری: ایک جامع الکمالات قلم کار' ارشد مینا نگری کی حیات وخدمات پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلے ارشد مینا نگری کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد مصنف ڈاکٹر محبوب راہی کا تعارف دیا گیا ہے۔ آگے کے صفحات میں ارشد مینا نگری کے فکر وفن پر گفتگو ہوئی ہے۔ ارشد مینا نگری کی سب سے پہلی تصنیف ان کا شعری مجموعہ نئے اجالے ہے۔ جو 1999 میں منظر عام پر آیا۔

ڈاکٹر محبوب راہی کی اس کتاب میں بہت سی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان تصاویر میں ارشد مینا نگری اردو کی اہم ادبی شخصیت کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ ارشد مینا نگری اختراعی ذہن کے مالک ہیں، وہ اپنے فن کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے میں تجربات کرتے نظر آتے ہیں۔

146-E، برہم پترہ ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

■

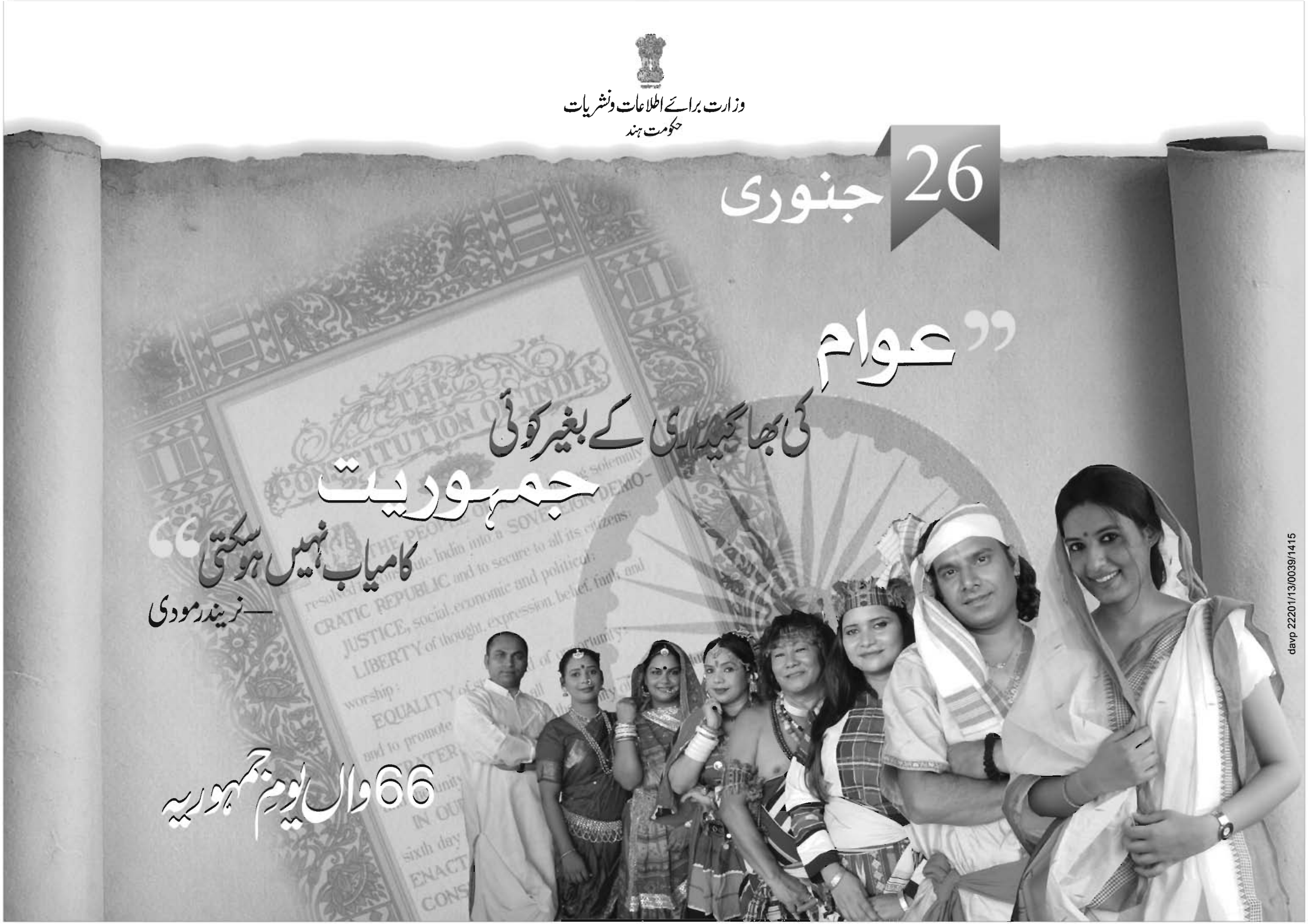
وزارت برائے اطلاعات ونشریات
حکومت ہند
26 جنوری
”عوام کی بھاگیداری کے بغیر کوئی جمہوریت کامیاب نہیں ہوسکتی“
—نریندر مودی
66 واں یوم جمہوریہ
davp 22201/13/0039/1415

عالمی اردونامہ

لاہور میں واقع منٹو کے گھر 'لکشمی مینشن' کی فروخت

لاہور: جنوبی ایشیا کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو جنھوں نے غالب کے شعر کا سہارا لے کر خود اپنے بارے میں کہا تھا ''لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں'' زندگی بھر وہ مشکلوں کا شکار رہے لیکن انھوں نے اردو ادب کا دامن اپنی کہانیوں سے مالا مال کر دیا۔ پاکستان کی حکومت نے ان کی موت کے 50 سال بعد ان کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں ستارۂ امتیاز سے نوازا لیکن منٹو کو آج بھی وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ اصل حق دار تھے۔ سعادت حسن منٹو افسانہ لکھتے ہوئے خود ایک افسانہ بن گئے

اور یہ افسانہ شاید اب بھی نامکمل ہے۔ لاہور میں مال روڈ کے قریب واقع لکشمی مینشن میں منٹو نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ اس گھر میں انھوں نے کُل 7 سال، 8 ماہ اور 9 دن گزارے۔ دکانوں سے گھرے لکشمی مینشن کے اس گھر کے باہر آج بھی سعادت حسن منٹو کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے لیکن سرکاری کاغذوں میں اب یہ گھر ان کی ملکیت نہیں رہا۔ منٹو کی بڑی بیٹی نگہت پٹیل اسی گھر میں رہتی تھیں لیکن اب ان کا خاندان اس گھر کو بیچ کر کسی دوسری جگہ جا چکا ہے۔ برطانوی نشریاتی ادارے سے بات کرتے ہوئے نگہت پٹیل نے بتایا کہ تقسیم کے بعد جب وہ اس گھر میں آئیں تو وہ ایک سال کی تھیں اور منٹو کی موت کے وقت ان کی عمر 9 سال تھی، انھیں افسوس ہے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکیں۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں منٹو کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حق دار تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 19 جنوری 2015

مقصود الٰہی شیخ کی تین کتابوں کا اجرا

مقصود الٰہی شیخ کی تین کتابوں کے اجرا کا منظر

بریڈفورڈ: برطانیہ کے بریڈ فورڈ میں مقیم مشہور و معروف تخلیق کار مقصود الٰہی شیخ کی تین کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ شیشہ ٹوٹ جائے گا، پوپ کہانیاں 3، ادب ساز اور ادب نواز: مقصود الٰہی شیخ، مصنفہ میمونہ روحی کا اجرا بتاریخ 15 جنوری کیا گیا۔ اس تقریب رونمائی کا انعقاد نارک روفٹ ہال، بریڈ فورڈ یونیورسٹی میں کیا گیا۔ اس موقعے پر برطانیہ، پاکستان اور ہندوستان کی عبقری شخصیات کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے محبت رکھنے والے حضرات و خواتین کی کثیر تعداد موجود تھیں۔ ان شرکا نے کتابوں کے تعلق سے اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر چار مقالے بھی پڑھے گئے۔ اس تقریب میں سر جیمس ہل نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے لیے انتہائی مسرت کی بات ہے کہ میں اس پروگرام میں شامل ہوں اور اپنی دوسری مصروفیات کے باوجود مقصود شیخ کی محبت مجھے کھینچ لائی۔ میری نیک خواہشات اور دعائیں ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں۔

پریس ریلیز، مقصود الٰہی شیخ، بریڈ فورڈ برطانیہ، 24 جنوری 2015

اقبال سیمینار

اقبال اکادمی مڈل ایسٹ قطر کے زیرِ اہتمام 11 دسمبر کو اقبال شناسی پر ایک پروگرام منعقد ہوا۔ جس میں کینیڈا کے مشہور اسکالر، محقق، ادیب اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے 'جاوید نامہ: انسان سازی کا شاہکار' کے عنوان پر ایک بصیرت افروز خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ جاوید نامہ ایک ایسا شاہکار ہے جو تیرھویں صدی کے عظیم شاعر سعدی شیرازی کے کلام، چودھویں صدی کے شاعر خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کی دیوانِ حافظ اور جلال الدین رومی کے مثنوی کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ جس میں دانتے کی Divine Comedy رومی کی مثنوی اور دیوانِ غالب کی روح پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسا شاہکار ہے جسے مغربی مفکرین نے سراہا تھا۔ ہندوستان کے شہر مدراس سے تشریف لائے صحافی و شاعر جناب ملک العزیز نے اپنی تقریر میں بتایا کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی روح قرآنِ کریم کی کئی آیات سے حاصل کی تھی، قرآن کی عظمت کے بے حد قائل تھے۔ علامہ کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں نہ صرف قرآنِ شریف کے گہرے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ انھوں نے مغربی دنیا اور افکار کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ آخر

اقبال اکادمی قطر کے زیرِ اہتمام اقبال پر منعقدہ پروگرام کا منظر

بزمِ اردو قطر کے سالانہ طرحی نعتیہ مشاعرے کا منظر

میں ڈاکٹر تقی عابدی اور ملک العزیز کو سپاس نامے اور یادگاری تمغہ جات پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر اقبال کا کلام بھی پڑھا گیا۔

پریس ریلیز، ملک العزیز، چنئی، تمل ناڈو، 4 فروری 2015

فیض سیمینار

قطر کی معروف ادبی تنظیم 'بزمِ اردو قطر' کے زیرِ اہتمام فیض احمد فیض پر 12 دسمبر 2014 کو ایک سیمینار منعقد ہوا۔ کینیڈا میں مقیم عالمی شہرت یافتہ ممتاز دانشور، محقق، ادیب اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی اس سیمینار کے صدر تھے جبکہ تملناڈو سے تشریف لائے صحافی وشاعر ملک العزیز بطور مہمانِ خصوصی شریک رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بتایا کہ اردو ادب کے ناقدین کے نزدیک فیض احمد فیض کو میر، غالب اور اقبال کے بعد جو دادِ تحسین اور عوامی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی اور ان کے کلام نے نصف صدی کا عرصہ اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ مہمانِ خصوصی ملک العزیز نے فیض کے کلام کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان کے اشعار میں بے حد سادگی ہے جو پڑھنے والوں کے دل میں براہِ راست اتر جاتی ہے۔ سیمینار کے بعد ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا جس میں دونوں مہمانوں کے علاوہ قطر میں مقیم شاعروں نے اپنے کلام سنائے۔

پریس ریلیز، ملک العزیز، چنئی، تمل ناڈو، 4 فروری 2015

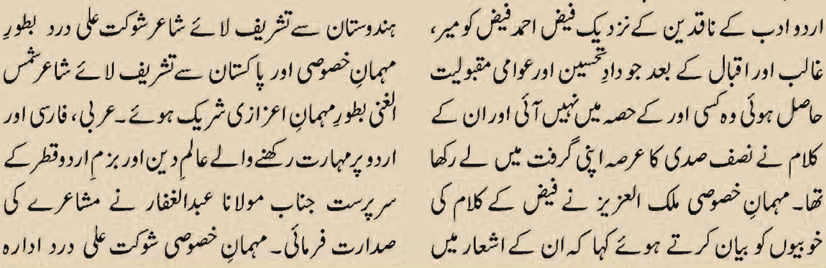

بزمِ اردو قطر کے زیرِ اہتمام فیض احمد فیض پر منعقدہ سیمینار کا منظر

بزمِ اردو قطر کا سالانہ طرحی نعتیہ مشاعرہ 2015

قطر کی قدیم ترین اردو ادبی تنظیم بزمِ اردو قطر نے 16 جنوری 2015 کو علامہ ابن حجر لائبریری فریق بن عمران کے وسیع ہال میں حسبِ روایت ایمان افروز سالانہ نعتیہ طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا۔ مشاعرے میں قطر کے منتخب مقامی شعرا کے علاوہ حیدر آباد دکن، ہندوستان سے تشریف لائے شاعر شوکت علی درد بطورِ مہمانِ خصوصی اور پاکستان سے تشریف لائے شاعر شمس الغنی بطورِ مہمانِ اعزازی شریک ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو پر مہارت رکھنے والے عالمِ دین اور بزمِ اردو قطر کے سرپرست جناب مولانا عبدالغفار نے مشاعرے کی صدارت فرمائی۔ مہمانِ خصوصی شوکت علی درد ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد سے وابستہ ہیں۔ ان کے دو مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں 'متاعِ درد' شامل ہے۔ مہمانِ اعزازی شمس الغنی کا تعلق کراچی پاکستان سے ہے۔ ان کے بھی دو شعری مجموعے 'سانپوں کا نگر' اور 'کوفۂ سخن' شائع ہو کر اہلِ ادب سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے پانچ بڑے شعرا کے سات سو اشعار کا انگریزی ترجمہ کیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔ مشاعرے کی نظامت بزمِ اردو قطر کے رکن مقصود انور مقصود نے کی۔ بزمِ اردو قطر کے جنرل سکریٹری افتخار راغب نے ابتدائی نظامت میں خطبۂ استقبالیہ اور بزم کا مختصر تعارف بھی پیش کیا۔ بزمِ اردو قطر کے نائب صدر فیروز خان نے مہمانان کا استقبال کیا۔

مہمانِ اعزازی شمس الغنی نے اپنے تاثرات میں بزمِ اردو قطر کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں یہاں کی ادبی محفلوں میں ایک خاص قسم کی تہذیب دیکھ رہا ہوں۔ مہمانِ خصوصی شوکت علی درد نے کہا کہ یہاں پیش کی گئی نعتیں بہت ہی صاف ستھری، پاکیزگی سے لبریز اور غلو سے پاک ہیں جو یہاں کے پاکیزہ ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ ای میل سے موصول کلام کا پیش کیا جانا اردو ادب کے فروغ کے لیے ایک بہت اہم اور انوکھا کام ہے۔

صدرِ مشاعرہ اور بزمِ اردو قطر کے سرپرست مولانا عبدالغفار نے صدارتی خطبے میں پیارے نبیؐ، سرورِ کائنات کی سیرتِ مبارکہ کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور آپؐ کی ذاتِ پاک کی اوصافِ حمیدہ کا بڑے ہی عمدہ انداز میں بیان کیا۔

پریس ریلیز: افتخار راغب، جنرل سکریٹری، بزمِ اردو قطر، 1 فروری 2015

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام لٹریچر پینل کی میٹنگ کا انعقاد

مختلف ادیبوں اور قلم کاروں کے مسودات و پروجیکٹس کی اشاعت پر غور وخوض

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام لٹریچر پینل کی میٹنگ فروغ اردو بھون میں منعقد ہوئی جس کی صدارت کونسل کے وائس چیئر مین پدم شری جناب مظفر حسین نے کی۔ ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے پینل اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ معیاری کتابوں کی اشاعت کونسل کے اغراض و مقاصد کا اہم ترین حصہ ہے اور کونسل اب تک بارہ سو سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہے جن میں شعر و ادب کی کتابوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے میٹنگ میں شعر و ادب کے حوالے سے موصول ہوئے پروجیکٹس اور مسودات کی روداد پیش کی اور کہا کہ کونسل کو تقریباً 90 مسودات بشمول پروجیکٹس ملک کی مختلف ریاستوں سے موصول ہوئے ہیں جن کی اشاعت پر اس میٹنگ میں غور وخوض کیا گیا۔

اپنے صدارتی کلمات میں کونسل کے وائس چیئر مین پدم شری جناب مظفر حسین نے کہا کہ ادب میں قومیت کا تصور اجاگر کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور عہدِ حاضر کے قلم کاروں کو اس جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ عظیم مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کی خدمات پر حکومت ہند نومبر میں صد سالہ جلسہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس سلسلے میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل محترمہ اسمرتی زبین ایرانی نے کونسل کو ہدایت کی ہے کہ قومی اردو کونسل اس جلسے کے دوران مولانا آزاد پر ایک جامع کتاب شائع کرے، اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیئر مین پدم شری جناب مظفر حسین نے ملک بھر سے آئے ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی آرا سے کونسل کو مستفید کریں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کا ایک وفد جلد ہی محترمہ اسمرتی زبین ایرانی سے ملاقات کرے گا۔ مولانا آزاد کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے واحد ایسے رکن ہیں جنھوں نے اردو میں دستخط کیے ہیں اس لیے یہ وفد مولانا آزاد کے دستخط پر سکہ جاری کرنے کی بھی تجویز پیش کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ وفد پدم و دیگر حکومتی اعزازات میں اردو والوں کی گھٹتی نمائندگی پر بھی حکومت کی توجہ مبذول کرائے گا۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے متعدد مسائل اور مولانا آزاد کو نصابی کتب میں شامل کیے جانے کی تجویز بھی اس وفد کے ایجنڈے میں شامل ہوگی۔ میٹنگ میں موجود تمام اراکین نے اس پیش رفت کا زبردست خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ ایک خوش آئند قدم ہے۔

میٹنگ میں پینل کے صدر اور مظہر الحق اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد، پدم شری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، جناب نند کشور وکرم، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر حمید سہروردی، پروفیسر مسعود سراج، پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر مشتاق احمد اور کونسل کی رکن محترمہ منوری بیگم کے علاوہ کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محمد انصر، ڈاکٹر قاسم انصاری، ٹی اے محترمہ آبگینہ عارف، محترمہ شہناز نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 جنوری 2015

کونسل کے مالی تعاون سے

سرسید: حیات اور خدمات

چندولی: نسیم میموریل ویلفیئر سوسائٹی سمرا چندولی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون

سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد 23,24 کو جنوری کیا گیا جس میں پرو وائس چانسلر ایس احمد علی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈی ایم چندولی جناب این کے سنگھ نے خوشی کا اظہار کرتے کیا اور کہا کہ سرسید نے ملک وسماج کی ترقی کے لیے جو کچھ کیا ہمارے لیے قابل فخر ہے۔ مہمان خصوصی جناب مونی راج جی ایس پی چندولی نے سرسید کی خدمات کا احساس دلاتے ہوئے اس خطے میں اس طرح کے پروگرام کے انعقاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

اپنے کلیدی خطبے میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے سرسید کی شخصیت اور کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرسید کو مصلح کے طور پر یاد تو کیا جاتا ہے لیکن ان کے ادبی کارناموں پر توجہ کم دی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ سرسید نے اردو ادب خصوصاً اردو نثر کو نئے ذائقے سے آشنا کیا اور مدعا نویسی کی بنیاد ڈالی۔ پروفیسر یعقوب یاور نے سرسید اور بنارس کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے قیام بنارس اور غازی پور کے دوران جو تعلیمی سرگرمیاں انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ کنوینر سیمینار ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سرسید ایک تحریک ایک مشن کا نام ہے۔ انگریزوں کی ظلم اور زیادتیاں دیکھتے ہوئے سرسید نے علم اور تعلیم کو وسیلۂ نجات سمجھ کر اسے عام کرنے کی جدوجہد کی۔

اس سیمینار کے دوسرے مقررین میں ڈاکٹر محمد عارف، جناب افسر احمد، پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر رفعت جمال، ڈاکٹر نفیس بانو، ڈاکٹر تعبیر کلام، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر مشرف علی، پروفیسر اودھیش پردھان، ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر سمیر پاٹھک، پربھاکر اپادھیائے، اوپی دیویدی وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ آخر میں اظہار تشکر حاجی وسیم ڈائریکٹر سینٹ الحنیف کالج، نے کیا۔

پریس ریلیز، جاوید اختر انصاری، چندولی، 30 جنوری 2015

شعبۂ اردو سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم میں یومِ اردو کا انعقاد

2 فروری شعبۂ اردو سی عبدالحکیم کالج میل وشارم اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے یوم اردو اور عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ جناب ایس زیڈ ابرار احمد کرسپانڈنٹ سی عبدالحکیم کالج نے جلسے کی صدارت کی۔ ڈاکٹر ایس محمد یاسر، صدرِ شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم نے مہمانوں کا تعارف اور خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ کالج کے پرنسپل

ڈاکٹر کے مسعود احمد نے اردو زبان کی اہمیت اور اس کے مذہبی سرمایہ کی وقعت بیان کرتے ہوئے خصوصی خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی صاحب، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں ہندوستان میں اردو زبان کے قانونی موقف کو واضح کیا۔ اجلاس کی دوسری نشست میں عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جس کی نظامت پروفیسر پی تنویر احمد، اسلامیہ کالج، وانمباڑی نے کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر یاسر، میل وشارم، 3 فروری 2015

’خبرنامہ‘ اور ’عالمی اردو نامہ‘ کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ہے تاکہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورتِ حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ہیں۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

مدارس کو بااختیار اور جدید بنایا جائے گا

نئی دهلی: ملک کے مدارس کو بااختیار اور جدید بنایا

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں پروگرام کے دوران خطاب کرتے ہوئے فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزیر اسمرتی ایرانی اور اسٹیج پر دیگر مہمانان

جائے گا، تعلیم کا کوئی بھی سیکٹر تب تک ادھورا ہے جب تک طلبا کی کردار سازی اور ان میں ملک اور لوگوں کے تئیں خدمت خلق کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزیر اسمرتی زوبین ایرانی نے کیا۔ وہ یہاں مین اسٹریم کے ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم یافتہ کرنے کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں خطاب کر رہی تھیں۔ اس موقعے پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر ظفر سریش والا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔

سیمینار کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندوستان کے سب سے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ انھوں نے تعلیم کے میدان میں بغیر بھید بھاؤ کے غیر جانبدارانہ طور پر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں بھیک نہیں بھاگیداری چاہتے ہیں۔ اس موقعے پر مولانا یوسف ندوی نے تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کو لے کر اسلام کے پیغام پر خطاب کیا۔ تنویر احمد نے کہا کہ 1857 کی تحریک کے دوران مسلم مین اسٹریم میں تھے۔ اس وقت مسلمان اور ہندو کے درمیان کسی طرح کی تفریق نہیں تھی۔ سبھی خود کو ہندی کہتے تھے۔ سیمینار میں دیگر مقررین نے بھی خطاب کیا۔ اجلاس کے بعد ظفر سریش والا چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں میں صلاحیت کی کمی نہیں ہے، انھیں اپنی صلاحیت مظاہرہ کرنے کے لیے تعلیمی میدان کی ضرورت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو تعلیم کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ نظامت مولانا اعجاز ارشد نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 فروری 2015

مانو کا یومِ تاسیس

نئی دهلی: اردو وہ زبان ہے جس سے تمام مذاہب طبقے اور برادری سے تعلق رکھنے والے افراد نے پیار کیا

اور اس کی ترقی میں تعاون کیا ہے اس کا تعلق کسی خاص مذہب یا ذات برادری سے نہیں ہے۔ یہ خالصتاً ہندوستانی زبان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان جتنی پڑھی جانی چاہیے تھی اس سے کم پڑھی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیت ہے روزمرہ کی بات چیت میں اس کا کافی استعمال ہوتا ہے۔ یہ عام آدمی کی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار اقلیتی امور نیز پارلیمانی امور کے وزیر مملکت مختار عباس نقوی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے یوم تاسیس کے موقعے پر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) نے اس نظریے کو تبدیل کرنے نیز تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم میں اردو کو ذریعہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مانو نے اردو میڈیم کے طلبا کو انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی تعلیم دینے کا موقع فراہم کیا ہے جو کہ یقیناً بڑی حصولیابی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت کو اقلیتوں کو سماجی واقتصادی نیز تعلیمی طور پر بااختیار بنانے کی فکر ہے اس لیے وہ اقلیتوں کی فلاحی اسکیموں اور پروگراموں کے عمل درآمد میں درپیش رکاوٹوں کو سمجھنے کے لیے دور دراز کے علاقوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 جنوری 2015

ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم کا فروغ اور اردو یونیورسٹی

حیدرآباد: اردو زبان کو محض تفریحِ طبع کا ذریعہ بنانے کے بجائے اسے تعلیم کے ذریعہ روزگار سے مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی اردو اور اس کے ذریعہ تعلیم کی بقا کا واحد راستہ ہے۔ اگر ہم اردو کو محض تفریحِ طبع کا ذریعہ سمجھتے ہوئے طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں گے تو یہ بات آنے والی نسلوں کے ساتھ کھلواڑ کے مترادف ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار جناب ظفر سریش والا، چانسلر مانو نے دانشورانہ فورم کے اجلاس بعنوان 'ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ میں اردو یونیورسٹی کا رول' میں اظہار خیال کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کو صنعت اور عالمی جامعات کے ساتھ تعاون اور فروغ اردو و نیز طلبہ کے حصول روزگار کی طمانیت کے درمیان توازن پر بھی زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں انگریزی تعلیم کا بھی معقول انتظام کرنا چاہیے تا کہ ہمارے طلبہ انگریزی میڈیم طلبہ سے بہتر طور پر مسابقت کر سکیں۔ بااختیاری صرف بہتر تعلیم سے ہی آتی ہے۔ اس لیے یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کو آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم کا ہم پلہ بنائیں۔ موصوف نے کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ ایک لڑکی کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ان

'ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم کا فروغ اور اردو یونیورسٹی' کے موضوع پر منعقدہ اجلاس کا منظر

کی دینی ذمہ داری بھی ہے کہ جو عہدہ انھیں حاصل ہوا ہے اس کے لیے بہتر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے کہا یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ایک فعال چانسلر ہمیں ملا ہے۔ ان کے ذریعہ ہم اپنے دیرینہ مسائل کو ارباب مجاز تک پہنچاتے ہوئے انہیں حل کروالیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری یہ کوشش ہے کہ تعلیم کو روزگار سے جوڑا جائے اور طلبہ کو دینیات کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب سے متعلق بھی معلومات فراہم کی جائیں جس سے انھیں اطراف کے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار نے مختلف اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیمی اداروں تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کی ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں جناب ضیاء الدین نیر، اقبال اکادمی اور جناب نریندر لوتھر، آئی اے ایس (ریٹائرڈ) نے موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ کے اظہارِ تشکر پر جلسے کا اختتام عمل میں آیا۔ عابد عبدالواسع، پبلک ریلیشنز آفیسر نے کارروائی چلائی۔

پریس ریلیز، عابد عبدالواسع، پبلک ریلیشنز آفیسر، مانو، حیدرآباد، 15 جنوری 2015

اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کمیٹی تشکیل

علی گڑھ: حکومتِ ہند کی وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل کے قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارے (نیشنل کمیشن فار مائنارٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز) نے اردو زبان اور اردو زبان والوں کے روزگار کی موجودہ صورتِ حال اور مواقع کی جانچ کے لیے ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی تشکیل دی ہے۔ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارے کی سکریٹری ریتا چٹرجی نے جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر جسیم محمد کو ارسال کردہ اپنے مکتوب میں کہا ہے کہ کمیشن نے اردو زبان کی ترقی اور اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے افراد کے روزگار کی موجودہ صورتِ حال اور امکانات کی جانچ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) کی صدارت میں ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی تشکیل دی ہے۔ ریتا چٹرجی نے اپنے مکتوب کے توسط سے بتایا ہے کہ ممتاز فلم ساز اور سماجی کارکن مسٹر مہیش بھٹ، انگرل یونیورسٹی لکھنؤ کے وائس چانسلر پروفیسر سید وسیم اختر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن پروفیسر رضاء اللہ خاں، اے ایم یو کے شعبۂ ہندی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور راجستھان اردو اکادمی کے سابق رکن ڈاکٹر شمبھوناتھ تیواری، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل) کے قومی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر زبیر شاداب خاں، کالم نگار فیروز بخت احمد، جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی مسٹر فرحت علی خاں اور ڈائرکٹر ڈاکٹر جسیم محمد کو کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا ہے جبکہ ڈاکٹر شبستاں غفار مذکورہ کمیٹی کی کو آرڈینیٹر ہوں گی۔ جسیم محمد نے بتایا کہ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارے اور موجودہ مرکزی حکومت اردو کو ملک میں اس کا مناسب اور جائز مقام دیے جانے کے لیے سنجیدہ ہے۔ حکومتِ ہند نے مذکورہ کمیٹی کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ اردو زبان اور اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے افراد کے لیے روزگار کے امکانات پر غور و فکر کرنے کی غرض سے صحیح ڈاٹا پر مبنی اپنی رپورٹ پیش کرے۔

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 7 جنوری 2015

رضا لائبریری رامپور بورڈ کی میٹنگ

لکھنؤ: رضا لائبریری، رامپور کے بانی نواب فیض اللہ خاں

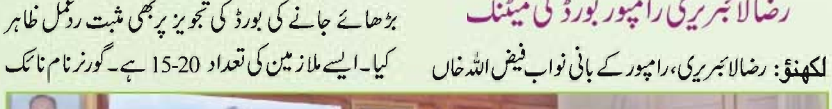

اور ریاست رامپور کے آخری نواب رضا علی خاں کے نام پر ایوارڈ کے لیے کوئی موزوں نام موصول نہ ہونے کے باعث ایک کمیٹی بنا کر نئے سرے سے نام طلب کیے جائیں گے۔ 28 فروری تک ایوارڈ کے لیے نام طلب کیے جائیں گے اور 31 مارچ 2015 تک ناموں کا اعلان کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ لائبریری میں موجودہ چمڑے پر ہاتھ سے تحریر قرآن پاک کے تحفظ کے سلسلے میں کمیٹی بنا کر ماہرین سے مشورہ کرنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ یہ قرآن پاک حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور 7 ویں صدی عیسوی کا ہے۔ یہ دونوں فیصلے رضا لائبریری بورڈ کی میٹنگ میں کیے گئے۔ میٹنگ لائبریری بورڈ کے چیئرمین اور ریاستی گورنر رام نائک کی صدارت میں راج بھون میں ہوئی۔ نواب فیض اللہ خاں اور نواب رضا علی خاں کے نام سے مذکورہ ایوارڈ عربی، فارسی، سنسکرت، عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے میں دیا جائے گا۔

گورنر رام نائک نے میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ایوارڈ کی تشہیر کے لیے سبھی ممتاز یونیورسٹیوں کو خط لکھ کر نام بھیجنے کی درخواست کی جائے اور اس میں لسانی اقلیات کمیشن، حکومت ہند سے بھی مدد لی جائے۔ گورنر نے کہا کہ عام لوگ بھی ممتاز اسکالروں کے نام براہِ راست کمیٹی کو بھیج سکتے ہیں۔ چمڑے پر لکھے قرآن کریم کے تحفظ کے سلسلے میں گورنر نے کہا کہ یہ ایک نادر سرمایہ ہے اس لیے اس بات کا خاص دھیان رکھا جائے کہ اسے کوئی نقصان نہ ہونے پائے۔ جس ایجنسی سے کام کرانے کی تجویز ہوا اس کے بارے میں یہ بھی دیکھا جائے کہ اسے مذکورہ کام کا تجربہ ہو اور مشہور لائبریریوں اور میوزیم سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا جائے۔

گورنر نے لائبریری کی رکھ رکھاؤ کے لیے خریدی جانے والی اشیا کے بارے میں سرکاری مالی ضابطوں پر سختی سے عمل کرنے اور شفافیت لانے کی ہدایت بھی دی۔ گورنر رام نائک نے لائبریری کے یومیہ اجرت والے ملازمین کی اجرت بڑھائے جانے کی بورڈ کی تجویز پر بھی مثبت ردِ عمل ظاہر کیا۔ ایسے ملازمین کی تعداد 15-20 ہے۔ گورنر رام نائک کی صدارت میں ہونے والی میٹنگ میں رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر ایس ایم عزیز الدین، پروفیسر آئی آر

زیدی، پروفیسر عبدالعلی، نوابین رامپور کے کنبہ سے تعلق رکھنے والے اور سوار ٹانڈہ کے کانگریس ایم ایل اے نواب کاظم علی خاں، نواب محمد علی خاں، ریاستی گورنر کی پرنسپل سکریٹری جیوتھیکا پاٹنکر، ضلع مجسٹریٹ رامپور سی ڈی ترپاٹھی، جگدیش پیوش اور پروفیسر آئی ایم خاں شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 29 جنوری 2015

شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد

نئی دہلی: فارسی زبان نے ہندوستان میں صدیوں تک حکومت کی ہے، تحقیقی، تاریخی، علمی اور ادبی کام بھی اسی زبان میں انجام پائے ہیں اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ فارسی منبع کے مطالعے کے بغیر نامکمل ہے۔ شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی میں سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں ایران کلچرل ہاؤس کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی فولادی نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ وہ یہاں بطور مہمان اعزازی مدعو تھے۔ واضح رہے کہ یہ پروگرام یو جی سی کے ڈی آر ایس پروگرام کے تحت عمل میں آیا جس کا مقصد تیرہویں صدی سے سولہویں صدی تک (سلطنت دور) کے علمی، ادبی اور فرہنگی کاموں کا جائزہ لینا تھا۔ پروگرام کی نظامت یو جی سی ڈی آر ایس پروگرام کے ڈپٹی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر علیم اشرف خان نے کی جبکہ صدارت دہلی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر سدیش پچوری نے کی۔ شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر چندر شیکھر نے اپنی تقریر میں ہندوستانی فارسی ادب کے مختلف ادوار کے سلسلے میں شعبۂ میں کیے گئے تحقیقی کاموں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس سلسلے میں بہت سے گوشے معرض اخفا میں ہے جنھیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ مہمان خصوصی کے طور پر شریک آئی سی ایچ آر کے ڈائرکٹر پروفیسر وائی ایس راؤ نے کہا کہ زبان کسی مذہب یا قوم کی زبان نہیں ہوتی بلکہ یہ افہام وتفہیم کا وسیلہ ہے اور کوئی بھی افہام وتفہیم ایسی نہیں ہوتی جو سماج کو شامل کیے بغیر پوری ہوسکے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے سدیش پچوری نے زبان فارسی کی قدامت اور عالمی سطح پر اس کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اس زبان میں جو ذخیرے موجود ہیں وہ پورے ہندوستان کا اثاثہ ہے جس کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک جمہوریہ تاجکستان کے سفیر ایچ ای جلولو مرزا شریف اسام الدین وچ نے فارسی کے فروغ کے لیے منعقدہ اس سیمینار کو اہم بتاتے ہوئے کہا کہ ہندوستان

شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی میں سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کا منظر

فارسی کا عظیم گہوارہ ہے جہاں سے علمی اور فکری کام ہوئے ہیں اور فارسی ادب کا عظیم سرمایہ ہندوستان میں پوشیدہ ہے۔ اس موقع پر نیشنل مین اسکرپٹ مشن کے ذریعے شائع کتاب 'راگ درشن' اور شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر علیم اشرف خان کی ادارت میں شائع ہونے والا شعبے کا سالانہ تحقیقی مجلّہ 'مجلّہ تحقیقات فارسی' کا اجرا عمل میں آتا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 فروری 2015

مخطوطات اور کتابت شناسی پر 21 روزہ ورکشاپ کا انعقاد

وارانسی: مخطوطات کی اہمیت تو سبھی لوگ سمجھتے ہیں مگر ان کی علمی اہمیت اور واقفیت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ فارسی، خط شکستہ اور بغیر نقطے والی عبارتوں کو پڑھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ مذکورہ باتیں مظہرالحق اردو فارسی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے اُڈپا آڈیٹوریم میں شعبۂ فارسی کی جانب سے 'مخطوطات اور کتابت شناسی' کے عنوان پر 21 روزہ ورک شاپ کے افتتاحی پروگرام میں بطور مہمان خصوصی کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر کسی کو کسی مخطوطے کے بارے میں معلوم کرنا ہو کہ یہ مخطوطہ کب وجود میں آیا تو اس کے لیے بڑی عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے مخطوطہ شناس کو کاغذ، طرز تحریر، تحریری نکات، رنگ و روغن، سیاہی، غرض ہر چیز کی معلومات رکھنی ہوگی تبھی وہ مخطوطے کی اصل کو سمجھ پائے گا۔ مہمان اعزازی بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر نسیم احمد نے کہا کہ مخطوطہ کا نام سنتے ہی لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت قیمتی چیز ہے، حالانکہ مخطوطات میں بہت کم اصلی مخطوطے ہوتے ہیں ان میں لوگوں کو غلط فہمی رہتی ہے کہ اگر کوئی قدیم تحریر ہے تو وہ بہت قیمتی ہوگی۔ شعبۂ فارسی بی ایچ یو کی صدر پروفیسر خانم شمیم اختر نے نصابی کتابوں کی تبدیلی اور نصاب میں مخطوطہ شناسی کو شامل کرنے کی بات کی۔ انھوں نے مخطوطات کو اہم تحریر بتایا اور کہا کہ اگر مخطوطات صحیح صحیح پڑھ لیے جائیں تو ملک کی فضا میں قومی یکجہتی کی خوشبو میں اضافہ ہوجائے۔ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدر پروفیسر یعقوب یاور نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب تحریر وجود میں آئی تب انسان نے محسوس کیا کہ وہ اپنی باتوں کو آئندہ نسل کے لیے محفوظ کرسکتا ہے۔ مخطوطات اس کے لیے ایک بہتر ذریعہ تھا۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس کمار پنکج نے کہا کہ مخطوطہ شناسی کتنا مشکل کام ہے، اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہڑپا اور موہن جوداڑو کی تحریریں ابھی تک پڑھی نہیں جاسکی ہیں، جس کی وجہ سے تاریخ کے بہت سے صفحات سے ابھی بھی عوام ناواقف ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمے کی گل پوشی کی گئی اور جامعہ کا ترانہ پڑھا گیا۔ پروگرام کے کوآرڈی نیٹر اور سابق صدر شعبہ فارسی پروفیسر حسن عباس نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ مخطوطات کتنے قیمتی ہوتے ہیں، اس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ عبدالرحیم خان خاناں کے زمانے میں ایک مخطوطہ تحریر کیا گیا جس کی قیمت اس زمانے میں 13 لاکھ روپے آئی تھی۔ پروگرام کے بعد دو کتابوں کا اجرا کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر محمد عقیل نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2015

سرسید اور تعلیم نسواں پر پروفیسر ڈیوڈ کا توسیعی خطبہ

علی گڑھ: امریکہ کی معروف ولیم پیٹرسن یونیورسٹی میں

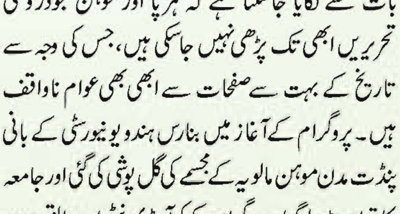

پروفیسر اور عالمی شہرت یافتہ مورخ پروفیسر ڈیوڈ لیلیویلڈ

نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پالی ٹیکنک (بوائز) کے آڈیٹوریم میں 'سرسید اور تعلیم نسواں' پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید نے اپنے دور کے مردوں پر منحصر سماج میں جدید تعلیم اور سائنسی فکر کے فروغ کے لیے جو کام کیے وہ قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرسید بھی اپنے دور کی پردہ کی رسم کے حامی تھے اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی معاشرہ میں ہندو اور مسلمان دونوں میں پردہ کی رسم رائج تھی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید جس وقت لندن جا رہے تھے، تبھی پانی کے جہاز میں ان کی ملاقات میری کارپینٹر سے ہوئی جو ہندوستان میں تعلیم نسواں کے لیے کام کر رہی تھیں۔ سرسید تعلیم نسواں کے تعلق سے ان سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ پروفیسر ڈیوڈ نے 1884 میں سرسید کے پنجاب میں فنڈ جمع کرنے کی غرض سے کیے گئے دورے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے وہاں کی مسلم، ہندو، عیسائی اور سکھ خواتین کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے تعلیم نسواں پر زور دیا۔ یونیورسٹی کے توسیعی خطبے کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ 1857 کے انقلاب کے بعد انگریزی تعلیم کو عیسائی تعلیم کے طور پر دیکھا جا رہا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں سرسید تعلیم نسواں کے تعلق سے کافی فکرمند تھے۔ شعبۂ تاریخ کے سربراہ پروفیسر علی اطہر نے ڈیوڈ لیلیویلڈ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی زندگی کے 50 سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر صرف کیے ہیں اور ان کے تحقیقی کام کو دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پروفیسر ناظم علی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پرو وائس چانسلر برگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) سمیت بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 جنوری 2015

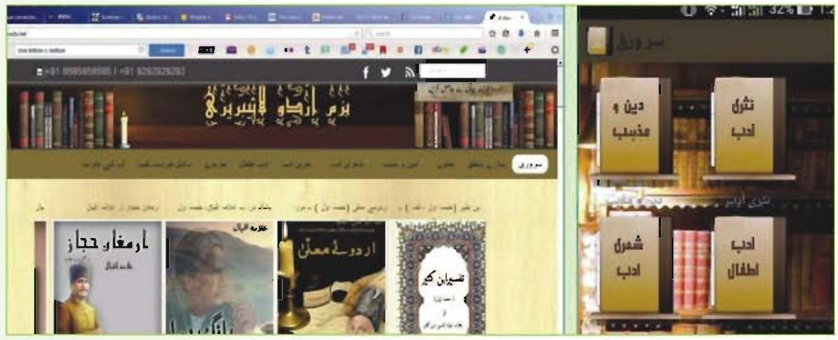

موبائل پر اردو لائبریری کا ایک منظر

موبائل پر اردو لائبریری

نئی دھلی: جدید ٹیکنالوجی میں موبائل فون کی اہمیت و افادیت سے شاید ہی کوئی انکار کرے۔ اردو کتابوں کی جہاں تک بات کی جائے تو تقریباً تمام ہی ایپس اپنے امیج فارمیٹ کی وجہ سے صارفین کو راغب کرنے میں ناکام رہے ہیں لیکن حال ہی میں 'بزم اردو لائبریری' کے نام سے گوگل پلے اسٹور میں ایک ایسی ایپ متعارف کرائی گئی ہے جو محبان اردو کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ یہ کارنامہ ڈاکٹر سیف قاضی نے انجام دیا ہے۔ اس لائبریری میں ہزاروں دینی علمی اور ادبی کتب جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لائبریری ایپ کی سب سے بڑی خصوصیت کتابوں کا یونیکوڈ فارمیٹ میں ہونا ہے۔

یونیکوڈ فارمیٹ کی وجہ سے کتاب کے صفحات کو ڈاؤن لوڈ نہیں کرنا پڑتا بلکہ پوری کتاب چند ساعتوں میں موبائل فون میں نظر آنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے ٹو جی جیسے سست رفتار کنکشن والوں کے لیے بھی یہ ایپ انتہائی مفید ہے۔ اس ایپ کی دوسری بڑی خصوصیت کتابوں کا جملہ حقوق سے آزاد ہونا ہے۔ عام طور سے انٹرنیٹ پر پائی جانے والی لائبریریوں میں مصنّفین و ناشرین کے حقوق کا پاس و لحاظ نہیں رکھا جاتا لیکن اس ایپ میں شامل کتابیں مصنّفین کی اجازت کے ساتھ شامل کی گئی ہیں جو پرانی کتابیں جملہ حقوق سے آزاد ہو جاتی ہیں، ان کتابوں کو لائبریری سے منسلک رضا کار دوبارہ یونیکوڈ فارمیٹ میں ٹائپ کرتے ہیں اور بعد میں یہاں اَپ لوڈ کر دیا جاتا ہے۔ ایپ میں موجود تمام کتابوں کو دین و مذہب، نثری ادب، شعری ادب، بزم اطفال اور متفرقات کے تحت زمرہ جات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دین و مذہب میں کسی ایک مسلک کی نمائندگی کرنے کے بجائے اس ایپ میں تمام مکاتب فکر کی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کی جمع و ترتیب اور انتخاب میں حیدرآباد کی مشہور علمی و ادبی شخصیت اعجاز عبید نے کلیدی رول نبھایا ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے اعجاز عبید نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس ایپ کو متعارف کرانے والے ڈاکٹر سیف قاضی کہتے ہیں کہ اب تک بزم اردو لائبریری محض ویب سائٹ پر دستیاب تھی، اور اب بغیر اس ایپ کے بھی اپنے کمپیوٹر یا موبائل فون کے براؤزر کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے: http://lib.bazmeurdu.net اس ایپ کی وجہ سے بآسانی موبائل فون پر بھی کتابیں پڑھی جا سکیں گی۔ ڈاکٹر سیف خوش ہیں کہ اردو کی خدمت کے لیے انھوں نے یہ خدمت انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جنوری 2015

رضا لائبریری کے 18 لاکھ صفحات ڈیجیٹائز

رام پور: جدید ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں اب ہر چیز انٹرنیٹ پر میسر ہے۔ رضا لائبریری نے بھی اپنے ذخیرہ مطبوعات کو انٹرنیٹ پر ڈالنے کا پروگرام بنایا ہے۔ کتابوں کی ڈیجیٹائزیشن کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔ اب تک مخطوطات کے 18 لاکھ صفحات کو ڈیجیٹائز کیا جا چکا ہے۔ اس بات کا اعلان رامپور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین نے صحافیوں سے گفتگو کے دوران کیا۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کے کیٹلاگ کو انٹرنیٹ پر ڈالنے کا کام کیا جا رہا ہے۔ ارباب علم و دانش اور ہر خاص و عام کو اطلاع دیتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ پہلے مرحلے میں عربی، فارسی و اردو مطبوعہ کتابوں کا کیٹلاگ انٹرنیٹ پر ڈال دیا گیا ہے۔ اب کیٹلاگ کو ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا رضا لائبریری نے اس ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے کیٹلاگ کو رضا لائبریری کی ویب سائٹ پر ڈال دیا ہے۔ واضح رہے کہ رامپور رضا لائبریری اپنے ذخیرہ کتب کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ آزادی سے قبل نوابین رامپور کا ذاتی ذخیرہ تھا۔ جس کو آزادی کے بعد حکومت ہند کے حوالے کر دیا گیا۔ 1975 میں پروفیسر سید نورالحسن سابق وزیر تعلیم حکومت ہند کی کوششوں کے نتیجے میں مرکزی حکومت نے اسے مرکزی حکومت کا ادارہ بنا دیا۔ رضا لائبریری کا ایک بورڈ ہے جس کے چیئرمین گورنر اتر پردیش ہیں۔ رضا لائبریری میں 70 ہزار قیمتی مخطوطات، 5 ہزار مغل تصاویر اور 3 ہزار اسلامی خطاطی کے نمونوں کے علاوہ 70 ہزار مطبوعہ ذخیرے کی اہمیت یہ ہے کہ آدھی سے زیادہ کتابیں 100 سال پرانی ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 6 جنوری 2015

سی سی آر یو ایم کے زیراہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں دوروزہ قومی سیمینار 'غیر متعدی امراض میں یونانی طب کا کردار'

غیرمتعدی امراض میں یونانی طب کا کردار

نئی دهلی: ہرطرح کی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے دورِ حاضر میں آیوروید، یوگا ونیچروپیتھی، یونانی، سدھا اور ہومیو پیتھی (آیوش) بہت کارآمد ثابت ہورہا ہے۔ یہ بات نیلجن سانیال، سکریٹری، وزارت آیوش نے سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم) کے زیراہتمام انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقدہ دوروزہ سیمینار 'غیر متعدی امراض میں یونانی طب کا کردار' کا افتتاح کرتے ہوئے کہا۔ انھوں نے کہا کہ غیر متعدی امراض مثلاً ذیابیطس، کینسر اور قلبی امراض عالمی سطح پر موت کا اہم سبب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت نے ایک نیشنل آیوش مشن بھی شروع کیا ہے جس کا مقصد کفایتی طبی سہولیات کی فراہمی، تعلیمی اداروں کا استحکام اور دواؤں کی فراہمی اور ان کے بہتر معیار کو یقینی بنانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں کل 41 یونانی کالج ہیں جن میں 9 کالجوں میں پی جی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ قبل ازیں پروفیسر سید شاکر جمیل، ڈائرکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم نے اپنے استقبالیہ خطبے میں گزشتہ تین دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط کونسل کی تحقیقی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اطلاع دی کہ کونسل کے کلینکل ریسرچ پروگرام کے تحت اب تک 30 امراض کا تحقیقی مطالعہ کیا جاچکا ہے۔ کونسل نے برص، اکزیما، داء الصدف، دمہ، وجع المفاصل، ورم جگر، گٹھیا اور فائیلیریا سمیت مختلف بیماریوں کے لیے کفایتی اور موثر دواؤں کی دریافت میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں کونسل کو انڈین پیٹنٹ آفس سے اب تک 8 پیٹنٹ مل چکے ہیں، جبکہ پیٹنٹ کی مزید 46 درخواستیں داخل کی جاچکی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ تحقیقی سرگرمیوں کو رفتار دینے کے لیے کونسل میں 'انٹرامیورل ریسرچ پالیسی' اختیار کی گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2015

غالب اکادمی کی تعمیر نو

نئی دهلی: جنوبی دہلی کی گنجان آبادی والے علاقے حضرت نظام الدین بستی میں واقع غالب اکادمی کی عمارت کی تزئین کاری کی جائے گی اور اکادمی کی عمارت کو میوزیم کے طور پر بھی ڈیولپ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اکادمی میں مرزا غالب پر ایک مستقل میوزیم کے قیام کے علاوہ ایک آڈیٹوریم بھی تعمیر کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ لیفٹیننٹ گورنر نے ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں کیا۔ لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے دہلی اربن ہیریٹیج فاؤنڈیشن کے ذریعے کیے جارہے تزئین کاری کے پروجیکٹ کے کاموں کے جائزے کے لیے میٹنگ بلائی۔ اس دوران ایل جی کے ذریعے دہلی کے متعدد علاقوں میں تزئین کاری کے منصوبوں کے کاموں کا جائزہ لیا۔ غالب اکادمی کی تزئین کاری کے تمام کام نیشنل مونومنٹ اتھارٹی کی نگرانی میں روایتی پتھر سے ہی مکمل کرائے جائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 جنوری 2015

نیپال میں اردو کی مقبولیت

نئی دهلی: نیپال میں نوجوان اردو کی شیریں اور چاشنی سے بے حد متاثر ہورہے ہیں اور اردو زبان و ادب سیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ نیپال میں اردو زبان دیوناگری رسم الخط

میں کافی مشہور ہے۔ البتہ فارسی رسم الخط سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہاں مدارس بھی قائم ہیں جس میں اردو زبان باضابطہ طور پر سکھائی جاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار نیپال کے معروف شاعر و ادیب بسنت کمار چودھری نے میڈیا سے مخاطب ہوتے ہوئے کیا۔ وہ یہاں معروف شاعر و کوی دیکشت انکوری کے زیراہتمام منعقد کیے جانے والے 'غزل کنبھ' میں بطور مہمان خصوصی شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان کی غزلوں کی ایک البم 'محبت کے لمحات' (Moments of Love) کا اجرا بھی کیا جاچکا ہے جس میں بالی ووڈ کے معروف گلوکاروں جاوید علی، شریہ گھوشال، شان، موہت چوہان اور روپ کمار راٹھور وغیرہ نے ان کی غزلیں گائی ہیں۔ اردو ہندی کے نیپال کے مشہور شاعر و ادیب بسنت کمار چودھری نے بتایا کہ وہ عالمی شہرت یافتہ ہندوستان کے عظیم شاعر پدم شری بیکل اتساہی سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ نیپالی زبان میں بھی اردو کے کافی الفاظ شامل ہیں اور وہاں کے لوگ سوشل میڈیا وغیرہ میں اردو کا کافی استعمال کرتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 جنوری 2015

کونسل کی سالانہ عالمی اردو کانفرنس ماریشس میں کرانے کی کوشش

نئی دهلی: ماریشس میں اردو کے فروغ کے لیے سرگرم ادارے 'اردو اسپیکنگ یونین' نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے زیراہتمام منعقدہ ہونے والی

سالانہ عالمی اردو کانفرنس کو ماریشس میں منعقد کرانے کے لیے سفیر ہند مسٹر انوپ کے مدگل سے ملاقات کی۔ وفد کی قیادت کررہے نائب سجادہ نشین خانقاہ اشرفیہ میرانیہ کھمبات گجرات اور جامعہ فیضان اشرف رئیس العلوم عربی کالج، گجرات کے صدر مولانا سید جامی اشرف نے سفیر، ہند سے بتایا کہ ماریشس اردو کی نئی بستی کے طور پر ابھر رہا ہے اور یہاں بڑی تعداد میں اردو پڑھنے والے موجود ہیں بلکہ یہاں کی نصف سے زیادہ آبادی اردو بولتی اور سمجھتی ہے۔ یہاں کی تہذیب وثقافت بھی ہندوستانی ہے، یہاں کے اکثر اسکولوں میں اردو بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے، اس لیے اگر یہاں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے تو عالمی سطح پر اس کے نتائج برآمد ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ماریشس میں اردو کے فروغ میں بڑا معاون ثابت ہوگا۔ مولانا سید جامی اشرف نے مزید کہا کہ اس سے نہ صرف یہ کہ یہاں کے اردو داں طبقے کے اندر اردو کے تئیں مزید بیداری پیدا ہوگی بلکہ ماریشس اور ہندوستان کے درمیان

11ویں سالانہ عالمی امن کانفرنس کا منظر

مرحوم بی ایس عبدالرحمٰن کی حیات و خدمات پر یک روزہ سیمینار کا منظر

مزید بہتر تعلقات پیدا ہوں گے۔

ہندوستانی ہائی کمشنر مسٹر انوپ کے مدگل نے باہمی تبادلۂ خیال کے بعد کہا کہ یہ بہت اچھا خیال ہے، اردو ہماری زبان ہے اور اس میں خالص ہندوستانی تہذیب و ثقافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مجھے اپنی طرف سے ایک درخواست دے دیں اور اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر کریں تا کہ ہم اس کو قومی کونسل کو بھیج کر اس سلسلے میں آگاہ کر سکیں۔ اردو اسپیکنگ یونین کے صدر شہزاد عبداللہ نے ایک درخواست سفیر ہند کو سونپ دی ہے۔ عالمی اردو کانفرنس میں ماریشس سے آئے شہزاد عبداللہ نے اختتامی اجلاس میں آئندہ سال کا پروگرام ماریشس میں کرانے کا مطالبہ کیا تھا جس کے بارے میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں غور کیا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 16 جنوری 2015

11ویں سالانہ عالمی امن کانفرنس

نئی دھلی: سماج میں امن و سلامتی کے قیام کے لیے مذہب کی حقیقت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ کوئی بھی مذہب دہشت کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ امن کا پیغام دیتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار حسن آرا ٹرسٹ کے زیر اہتمام انڈیا اسلامک سینٹر میں منعقد 11ویں سالانہ ورلڈ پیس کانفرنس کے دوران اتر پردیش کے وزیر مولانا جاوید عابدی نے کیا۔ مولانا جاوید عابدی نے ایک بہترین سماج کی تشکیل کے تعلق سے کہا کہ سماج میں محبت کی روشنی پھیلانے کے لیے تعلیمات محمدی کا سہارا لینا بہت ضروری ہے۔ محمد زبیری نے طب نبویؐ کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ مذہب اسلام ایک صحت مند سماج کا حامی ہے۔ پروفیسر نیر جلال پوری نے عالم اسلام میں 'فروغ اتحاد' کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مذہب اسلام جتنا امن و آشتی پر زور دیتا ہے، اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں دیتا۔ اس سے قبل امن کانفرنس کا افتتاح تلاوت کلام الٰہی سے قاری حفظ الرحمٰن نے کیا۔ کمسن نعت خواں محمد عباس نے بارگاہ رسالت میں ہدیہ نعت پیش کیا۔ سابق مرکزی وزیر آسکر فرنانڈیز، مولانا جاوید عابدی، کمشنر چودھری نجیب اشرف، پدم شری ڈاکٹر محسن ولی، حیدر کمال امروہی، رئیس ادریسی، سینئر آئی اے ایس سندیپ ثالث نے شمع روشن کر کے افتتاح کیا۔ ٹرسٹ کے صدر ظہیر زیدی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ صدر جلسہ صفدر حسین خاں نے دعائیہ کلمات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 13 جنوری 2015

دھلی:

ساہتیہ اکادمی کے لٹریری فورم کے زیر اہتمام شعر خوانی

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے لٹریری فورم کے زیر اہتمام اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شعر خوانی کا پروگرام منعقد ہوا، جس میں اردو میں فریاد آزر، ہندی میں دامنی اور انگریزی میں ابھے کے نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ابھے کے نے دہلی کی مختلف تاریخی اور ثقافتی ورثوں کے حوالے سے اپنا کلام پیش کیا جس میں لال قلعہ، قطب مینار، خونی دروازہ کے حوالے سے انھوں نے دلچسپ نظمیں پیش کی۔ اردو میں ڈاکٹر فریاد آزر نے اپنی منتخب غزل پیش کی، ڈاکٹر فریاد آزر نے اپنے غزل سے پوری محفل میں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔ اس کے بعد دامنی نے ہندی میں اپنی نظم اور غزلیں پیش کیں۔ قبل ازیں تمام شعرا کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر دویندر کمار درویش نے کہا کہ یہ تمام شعرا اپنے میدان کے منتخب کار ہیں۔ اخیر میں تحسین منور نے تمام شعرا کے کلام کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے تینوں شعرا کے متعلق اہم نکات کی نشاندہی کی اور کہا کہ تینوں زبانوں میں پیش کیے گئے اشعار اپنی معنویت رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 21 جنوری 2015

بی ایس عبدالرحمٰن: حیات و خدمات

نئی دھلی: ڈاکٹر بی ایس عبدالرحمٰن نے پوری زندگی قوم و ملت کی تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کا وژن بے حد وسیع تھا اس لیے انھوں نے تعلیم کا ایسا جال بچھایا جس کی انفرادی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے مشکل وقت میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کی کافی مدد کی تھی اور آئی آئی سی سی میں تعمیر ایک بڑا آڈیٹوریم انھی کے نام سے منسوب ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے زیر اہتمام مرحوم بی ایس عبدالرحمٰن (مرحوم) کی حیات و خدمات پر منعقد ایک سیمینار میں سراج الدین قریشی نے کیا۔ واضح رہے کہ مرحوم کا انتقال 7 جنوری کو ہوا، مرحوم نے اسلامک سینٹر کو 2 کروڑ 72 لاکھ 25 ہزار روپیہ عطیہ کیا تھا۔ سراج الدین قریشی نے مزید کہا کہ ڈاکٹر بی ایس عبدالرحمٰن ایک کامیاب تاجر اور ماہر تعلیم تھے۔ انھوں نے تمل ناڈو میں بہت سے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ یہاں تک کہ ان کے نام سے ایک بڑی یونیورسٹی بھی قائم ہے۔ اس موقع پر صدر سراج الدین قریشی نے اعلان کیا کہ جلد ہی بی ایس عبدالرحمٰن کی حیات و خدمات پر ایک کتاب شائع کی جائے گی۔ آئی آئی سی سی کے سکریٹری وصی احمد نعمانی ایڈوکیٹ نے کہا کہ ڈاکٹر بی ایس عبدالرحمٰن دنیا کے مقبول ترین مسلمانوں میں سے تھے۔ ای ٹی اے کے سابق ڈائرکٹر طارق رضا نے کہا کہ وہ تعلیم کو تمام کاموں پر فوقیت دیتے تھے، خاص طور سے غریبوں کی تعلیم پر توجہ دیتے۔ چنانچہ وہ تامل ناڈو کے مختلف اضلاع میں پانچ یتیم خانے بھی چلاتے تھے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر ایچ خان نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ضرورت مند

ساہتیہ اکادمی کے لٹریری فورم کے زیر اہتمام شعر خوانی کا منظر

’کتاب الہند‘ پر مذاکرے کا منظر

ایران کلچر ہاؤس میں فارسی لرننگ سرٹیفکیٹ کورس کے کامیاب طلبا و طالبات

طلبہ کے لیے 70 ملین ڈالر کی اسکالرشپ جاری کی تھی، ایسے دردمند لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 14 جنوری 2015

کتاب الہند پر مذاکرہ

نئی دھلی: ایران کلچرل ہاؤس میں انجمن ادبی بیدل کی پندرہ روزہ ادبی نشست بعنوان ’البیرونی کی کتاب الہند پر مذاکرہ‘ میں خصوصی خطاب کرتے ہوئے معروف فارسی اسکالر اور بیرونی شناس مسٹر این ایس شکلا نے کہا کہ ابوریحان البیرونی کا ہندوستان میں آنا اور یہاں سنسکرت سیکھ کر ہندوستان کی تہذیب وثقافت، معاشرت، سیاست اور یہاں کے جغرافیے پر عظیم کتاب ’کتاب الہند‘ لکھنا عظیم کارنامہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ البیرونی نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے تہوار، عقائد، معاملات، جغرافیائی حالات، یہاں کے پھل، پھول، جانور، کاشت اور یہاں کے تمام معاشرتی رسوم و رواج کو لکھا ہے جس سے اس دور کے حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی فولادی نے کہا کہ البیرونی نے یہ کتاب اس وقت تحریر کی جب پوری دنیا میں آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، مقامات بھی دشوار گزار تھے لیکن بیرونی نے ہر طرح کی مصیبتوں کو برداشت کرکے ہمارے سامنے اس دور کے ہندوستان کو پیش کردیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر غفار نے بیدل انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے زیراہتمام منعقدہ البیرونی سیمینار پر رپورٹ پیش کیں۔ پروگرام کی نظامت شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر بلرام شکلا نے انجام دی۔ اخیر میں شمیم الحق صدیقی نے حافظ کی غزل کو ترنم میں پیش کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 21 جنوری 2015

ایران کلچر ہاؤس میں فارسی لرننگ سرٹیفکیٹ کورس کا افتتاح

نئی دھلی: زبان فارسی کے فروغ کے لیے ایران کلچر ہاؤس کے زیراہتمام کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی فولادی نے فارسی لرننگ سرٹیفکیٹ کورس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ اور خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔ واضح رہے کہ اس سرٹیفکیٹ کورس کی بڑی اہمیت ہے جس میں فارسی پڑھنا، لکھنا اور بولنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ کورس پانچ مہینے پر مشتمل ہے۔ اس کورس کی بنیاد پر طلبا مختلف یونیورسٹیوں کے ڈپلومہ کورس میں داخلہ لینے کے مجاز ہوجاتے ہیں۔ اس موقعے پر گزشتہ کورس میں بہتر کارکردگی انجام دینے والے طلبا و طالبات کو سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ کلچرل کونسل علی فولادی کی فارسی تقریر کا ترجمہ مہدی باقر نے کیا جبکہ نظامت فارسی کلاس کے کوآرڈینیٹر علی ظہیر نقوی نے کی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 29 جنوری 2015

بیدل پر ایران کلچرل ہاؤس میں خصوصی نشست

نئی دھلی: انجمن ادبی بیدل کی جانب سے ایران کلچرل ہاؤس میں خصوصی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ سید شاہد مہدی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض جے این یو کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے انجام دیے۔ کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی فولادی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

اس موقعے پر سید شاہد مہدی نے کہا کہ عمر خیام اور سرمد کی رباعیاں صدیوں بیت جانے کے باوجود آج بھی ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں۔ انھوں نے عظیم شاعر اور مسلم سائنس داں عمر خیام اور سرمد کی رباعیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی بہت زیادہ بولی جانے والی بیشتر زبانوں میں ان کی تخلیقات کے تراجم ہوچکے ہیں۔

کلچرل کونسل ڈاکٹر علی فولادی نے سرمد اور عمر خیام کی رباعیات پر اجمالی اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے دونوں عظیم بزرگ شعرا کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے عمر خیام کی ایجاد کردہ تقویم اور ان کے علم نجوم کے کارناموں کو بیان کیا۔ دہلی یونیورسٹی شعبہ فارسی کی سابق استاد ڈاکٹر بلقیس فاطمہ حسینی نے سرمد کے حالات زندگی، ان کی رباعیات، اور تخلیقات سرمد و عمر خیال کی عصری معنویت پر تفصیلی اظہار خیال کیا۔ اخلاق احمد آہن نے پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں عمر خیام کے حوالے سے اردو میں ہونے والی تحقیقات پر روشنی ڈالی۔ اخیر میں سعید عاکف کی کتاب ’خاکہائے نرم کوشک‘ کا اردو ترجمہ ’بابا خدا حافظ‘ ترجمہ از خان محمد صادق جونپوری کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ریفریشر کورس میں شامل ہونے والے طلبہ و طالبات کو سرٹیفکیٹ سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 7 جنوری 2015

ضیا فتح آبادی کا صدسالہ یوم ولادت

نئی دھلی: آنجہانی مہر لال سونی ضیاء فتح آبادی کے صدسالہ یوم ولادت کے موقعے پر لالہ سیمرل جین پبلک اسکول جنک پوری میں ڈاکٹر جی آر کنول کی صدارت میں سیمینار منعقد کیا گیا جس میں شرکا نے ضیاء فتح آبادی کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کی ذات وشعری کائنات پر گفتگو کی۔ پروگرام کی نظامت معروف شاعر سیماب سلطانپوری نے کی۔ اس موقعے پر مہاراشٹرا میں قائم کیے گئے مہر فاؤنڈیشن دھولیہ کی طرف سے شائع (ضیائے مہر) مجلّہ تمام شرکا کو پیش کیا گیا اور مہر فاؤنڈیشن کا مختصر تعارف نامہ بھی دیا گیا۔ سیمینار کے آغاز میں ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے اپنے مقالے کی تلخیص پیش کی۔ مہمان ادیب ڈاکٹر شبیر اقبال مہاراشٹرا نے ضیاء کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ضیاء فتح آبادی کی مختلف اصناف سخن میں 16 کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں 10 شعری مجموعے اور 6 نثری ہیں۔ طلوع، نور مشرق، ضیاء کے سو شعر، نئی صبح گردِ راہ، حسن غزل، رنگ ونور، دھوپ اور چاندنی، سوچ کا سفر، نرم گرم ہوائیں، شعر اور شاعر، سورج ڈوب گیا، سیماب بنام ضیاء زاویہ ہائے نگاہ، ذکرِ سیماب اور مسند صدارت شامل ہیں۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا میں نے ان کی قلمی ضیا دیکھی ہے، ان کی شاعری دبستانِ داغ کی عمدہ شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت کا پیغام ہے۔ صدر سیمینار ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ اردو ادب کا تاریخ داں جب زمانے کی گرد کو ماہ وسال کے اوراق سے ہٹائے گا تو

دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر سیمینار کا منظر

ضیاء کی ادبی روشنی سے متاثر ہوگا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 جنوری 2015

دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر سیمینار کا انعقاد

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ ریسرچ اسکالر سیمینار میں شعبہ کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اپنا معرکتہ الآرا مقالہ 'کفن کا متن اور تعبیر کی غلطیاں' پیش کیں، جبکہ ریسرچ اسکالر شاہین پروین نے اپنا مقالہ 'قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ' پیش کیا۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کفن کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے تعبیر کی غلطیوں کو آشکار کیا۔ انھوں نے کفن کے کردار مادھو، گھیسو اور بدھیا پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس دور کے طبقاتی نظام، زمیندارانہ استبداد، انگریزوں کے ذریعے ہندوستانی سماج کو نظریاتی گروہ میں بانٹنے کی سازش پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مادھو اور گھیسو (باپ اور بیٹا) کا کردار ہندوستانی نہیں ہے، بلکہ یہ انگریزوں کے ذریعے ازبر کرائے گئے وہ تصورات ہیں جس کے ذریعے ہندوستانیوں کو غلط انداز میں پیش کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف تحقیق کو ہی تنقید کے میزان پر نہیں پرکھا جانا چاہیے، بلکہ تنقید کو بھی تحقیق کی عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ شعبہ کے استاد متھن کمار نے کہا کہ مادھو کا کردار ہمارے قدیم ہندوستان کی پیداوار ہے جس نے دلت اور برہمنوں کے درمیان معاشرے میں ذلت آمیز تفریق پیدا کردی تھی۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ابن کنول نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہر عہد میں تحقیق و تنقید کے سلسلے میں زاویے بدل جاتے ہیں اور مختلف زاویہ نظر سے متن کی تحقیق و تنقید کی جاتی ہے جو آج بھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہیں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ریسرچ اسکالرز کو مقالہ میں اپنی رائے اور اپنی تحقیق پیش کرنا چاہیے تاکہ جب یہ منظر عام پر آئے تو اس کی گونج برسوں تک سنائی دے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے شعبہ کے سینئر استاد اور کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ 'کفن' کی تنقید پر ابوبکر عباد نے بڑی باریکی سے تجزیہ کیا ہے، اس میں انھوں نے خود کفن اور کفن کے ناقدین پر تنقید کی ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 جنوری 2015

جامعہ میں مثنوی 'چراغ دیر' پر توسیعی خطبہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کی جانب سے غالب کی شاعری 'چراغ دیر' کے حوالے سے پہلے توسیعی خطبے کا انعقاد عمل میں آیا۔ توسیعی خطبات کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر کلیم اصغر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر صادق نے ہندوستان میں فارسی شاعری کی روایت کے حوالے سے مرزا غالب کی فارسی شاعری کے چند اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مثنوی چراغ دیر کو صنف مثنوی میں جدید طرز کی حامل قرار دیا۔ صدر شعبہ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ غالب نہایت ذہین انسان تھے انھوں نے اہل اردو کو خوش کرنے کے لیے اپنے اردو کلام کو فارسی سے بہتر بتایا۔ انھوں نے کہا کہ بنارس کو اتنا بلند و عظمت والا سمجھتے ہیں کہ اس تک فکر کی رسائی ناممکن ہے۔ آخر میں انھوں نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 جنوری 2015

جدید فارسی شاعری پر توسیعی خطبہ

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقدہ توسیعی خطبہ کے دوران طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فارسی اسکالر پروفیسر شریف قاسمی نے 'جدید فارسی شاعری' کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے جدید فارسی شاعری کو سمجھنے کے لیے قدیم فارسی شاعری کے فہم کو ضروری قرار دیا، جب ہم قدیم فارسی شاعری سے اچھی طرح واقف ہوں گے تبھی جدید کو بھی بآسانی سمجھ پائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ قدیم فارسی خواص، بالخصوص بادشاہوں، امیروں وغیرہ کے لیے تھی جبکہ جدید فارسی شاعری عوام الناس کی ترجمان ہے۔ جدید فارسی کا آغاز ایران میں انقلاب مشروطیت کے ہمراہ یعنی 19ویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ صدارت شعبۂ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سلیم اصغر نے انجام دی۔ اسی موقعے پر اساتذہ کے علاوہ طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 فروری 2015

بلاگنگ اور اردو زبان و ادب

نئی دھلی: انٹرنیٹ اور سائبر ورلڈ اردو زبان و ادب کے فروغ کا اہم ذریعہ بن چکے ہیں۔ بلاگنگ بھی انٹرنیٹ کا اہم حصہ ہے اور دوسری زبانوں میں لوگ اپنے بلاگ بنا کر اپنی تحریریں دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ اردو زبان میں بھی اب اس سلسلے میں پیش رفت ہونے لگی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے Tanseefhaidar.blogspot.com کے توسط سے کچھ ایسے کام سامنے آئے ہیں جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے نئے لکھنے والوں میں اب یہ شعور بیدار ہو رہا ہے کہ بلاگ کے ذریعے کس طرح صحیح معنوں میں اردو زبان و ادب کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ تصنیف حیدر نے اپنے بلاگ پر اجمل کمال (پاکستان)، عذرا عباس (پاکستان)، محمد حمید شاہد (پاکستان)، ناصر عباس نیر (پاکستان)، مشرف عالم ذوقی (دہلی)، رحمان عباس (ممبئی)، علی محمد فرشی اور کاشف رضا جیسے ادیبوں کے انٹرویوز پیش کیے ہیں۔ وہیں عرفان ستار اور زیب غوری وغیرہ کی کئی کئی غزلیں بھی موجود ہیں۔

تصنیف حیدر کے اس بلاگ کے ذریعے اردو کی اہم ترین کتابوں کے لنک بھی دیے گئے ہیں جس سے بڑی آسانی سے اردو زبان و ادب کی اہم کتابوں تک نہ صرف رسائی حاصل کی جاسکتی ہے بلکہ انھیں ڈاؤن لوڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جنوری 2015

آندھرا پردیش:

رائل سیما اردو رائٹرس فیڈریشن کے دفتر کا افتتاح

کڈپہ: شہر کڈپہ میں فورٹ اسٹریٹ میں موجود ستار فیضی منزل کے نچلے حصہ میں رائل سیما اردو رائٹرس فیڈریشن

مولانا آزاد لائبریری میں سیرت نمائش میں وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ و دیگر

کے دفتر کا افتتاح ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کے دست مبارک سے ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر ستار ساحر نے کہا کہ ساغر زیدی نے اس فیڈریشن کی گذشتہ 30 سال قبل بنیاد ڈالی تھی ان کی موت کے بعد اس ادارے کو فعال بنانے کے لیے خسرو، ستار فیضی، سید شکیل احمد وغیرہ نے کئی اقدامات اٹھائے۔ فیڈریشن کے معتمد عمومی ستار فیضی نے کہا کہ ہر سال اس فیڈریشن کے زیر اہتمام بیسٹ ٹیچر، بیسٹ اسٹوڈنٹ اور، بیسٹ پوئٹ کے اعزازات دیے جائیں گے۔

بذریعہ ڈاک، ستار فیضی، 17 جنوری 2015

اتر پردیش:

مولانا آزاد لائبریری میں سیرت نمائش کا انعقاد

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سیرت تقریبات کے تحت مولانا آزاد لائبریری میں سیرت نمائش کا انعقاد عمل میں آیا، جس کا افتتاح وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے کیا۔ اس نمائش میں قرآن کے 25 نادر مخطوطات کے علاوہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی حیاتِ طیبہ پر 710 کتب کی نمائش کی گئی۔ ان کتب میں 245 اردو کتب جو بیشتر حضرت محمد مصطفیٰؐ کی تعلیمات پر مبنی ہیں، ہندی میں 90 کتب، عربی میں 51 اور دس کتب فارسی زبان میں نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ 315 کتب انگریزی میں رکھی گئی ہیں، جس میں بیشتر احادیث اور حضرت محمدؐ کی سیرت پر مبنی ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر امجد علی نے بتایا کہ کتب کے علاوہ قرآن کریم کے نایاب نسخے بھی سیرت نمائش میں رکھے گئے ہیں۔ ان میں غیر مسلم مصنفین کی تصنیف کردہ حضرت محمدؐ کی بایوگرافی، اہم اردو جریدوں کے خصوصی شمارے، قرآن کے نایاب 25 نسخوں کے علاوہ ممتاز خطاط صاحبان کے تحریر کردہ قرآن کے علاوہ حضرت علیؓ کا ہاتھ سے لکھا قرآن، شہنشاہ اورنگ زیب کے لکھے قرآن کے علاوہ قرآن کے بڑے اور سب سے چھوٹے نسخے بھی کشمیری آرٹ کے توسط سے نمائش میں رکھے گئے ہیں جو سنہرے اور نیلے رنگوں کی مدد سے لکھے گئے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 18 جنوری 2015

مانو لکھنؤ کیمپس میں یوم تاسیس کا انعقاد

لکھنؤ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں یوم تاسیس کی تقریب منعقد کی گئی۔ پروگرام کا آغاز کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم صاحبہ نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے بتایا کہ یہ یونیورسٹی کا سترہواں یوم تاسیس ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی ترقی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی اور یہ بھی کہا کہ یونیورسٹی وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں صاحب کی قیادت میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر محمد فائز اور ڈاکٹر نکہت فاطمہ نے یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے اردو کی موجودہ صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ شکریے کی رسم ڈاکٹر سرفراز احمد خان نے ادا کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 13 جنوری 2015

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لائبریری کا قیام

مظفر نگر: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام سانجک (مظفر نگر) میں 66 ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر ایم آر ڈی میموریل پبلک اسکول میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر ایم آر ڈی پبلک اسکول میں بچوں نے جشن جمہوریہ کی مناسبت سے مختلف پروگرام پیش کیے۔ ان بچوں کو آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے انعامات سے نوازا۔ واضح ہو کہ اسکول کی مذکورہ تقریب میں ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ وہی زبان ہے جس نے ملک بھر کے عوام کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ دے کر متحد کیا اور ملک آزاد ہوا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس ملک کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ یہاں لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے مزید کہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جیسے باکردار، حوصلہ مند اور قوم وملت کا درد رکھنے والے قائدین کی آج سخت ضرورت ہے اور ان کی یاد میں حفظ الرحمٰن سیوہاروی لائبریری کا قیام بڑا خراج ہے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (مظفر نگر) کے سکریٹری محمد تحسین نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، عوامی ایکتا ویلفیئر، ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) دہلی، 27 جنوری 2015

یومِ چکبست کا اہتمام

لکھنؤ: ماہنامہ 'امکان' کے دفتر کلیان پور میں عہد قدیم کے عظیم شاعر پنڈت برج نرائن چکبست کے یوم پیدائش پر منعقد تقریب میں آنجہانی پنڈت برج نارائن چکبست کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ چکبست ہمارے ان مشاہیر میں ہیں جو اپنے شاعرانہ کمالات اور نثری امتیازات دونوں کے حوالوں سے ہماری مشترکہ تہذیبی روایات کے امین و پاسداری ہی نہیں بلکہ اس کے شارح و ترجمان رہے ہیں۔ اس موقعے پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ چکبست نے رامائن کے ایک سین کو نظم کے پیکر میں ڈھال کر اردو شاعری کی تہذیبی رواداری کو استحکام عطا کیا۔ انور جلال پوری نے کہا کہ چکبست ان تعمیری و تخلیقی ذہن رکھنے والے شعرا میں ہیں جو ہر دور میں اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ زندہ رہیں گے۔ ناظم مشاعرہ واصف فاروقی نے چکبست کو قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینے والا شاعر قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ، 20 جنوری 2015

بہار:

تحریک اردو ادب کے زیر اہتمام ایک روزہ عظیم الشان اجلاس

کشن گنج: کشن گنج ضلع کے تحت کوچادھامن بلاک کے بشنپور ہائی اسکول کے میدان میں تحریک اردو ادب کے زیر اہتمام فروغ اردو اور تحفظ اردو کے عنوان سے ایک روزہ عظیم الشان اجلاس عام کا انعقاد کیا گیا جس میں

بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ جشن صد سالہ تقریب کا منظر

مہمانِ خصوصی کے طور پر ریاست بہار کے اقلیتی فلاح و بہبود کے وزیر جناب محمد نوشاد عالم، ریاست بہار کے رکن اسمبلی ماسٹر مجاہد عالم کو چادھامن حلقہ کے سابق ایم ایل اے اختر الایمان، مفتی محمد جسیم اختر نے شرکت کی۔ اس عظیم الشان اجلاس عام کی صدارت ریاستی وزیر نوشاد عالم نے کی جبکہ نظامت تحریک اردو ادب کے نائب صدر جناب امتیاز کوثر نے کی۔ اس اجلاس عام میں سونتھا بائی اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر جناب جاوید اقبال کی لکھی گئی کتاب 'لمحات جاوید' کی رسم اجرا ادا کی گئی اور ساتھ ہی کشن گنج ضلع کے یو پی ایس سی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے شہزاد عالم ولد مولانا حنیف عالم جنھیں وزارت کان میں دوسرا محمد صولت عالم ولد جنید عالم جنھیں وزارت دفاع میں فائز ہونا ہے۔ کے والد محترم کو تحریک اردو ادب نے اعزازات سے نوازا۔ ان کے علاوہ دیگر مقامی طلبہ کو بھی انعاموں سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 6 جنوری 2015

کشن گنج ضلع یومِ تاسیس تقریب میں اردو کے فروغ پر زور

کشن گنج: کشن گنج ضلع یومِ تاسیس تقریب کے موقعے پر ضلع مجسٹریٹ انیمیش کمار نے کہا کہ یہ دن یقیناً علاقے کے لوگوں کے لیے مسرت کا دن ہے کیونکہ ہم سلور جوبلی تقریب منا رہے ہیں اور اس تقریب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس پروگرام کے ذریعے ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کی ترقی پر زور دیا جارہا ہے۔ کیونکہ یہ حلقہ اردو آبادی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضلع انتظامیہ کی جانب سے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے زمینی سطح پر کام کیا جائے اور اس کے لیے منسلک محکمہ کے افسران کو اہم ذمے داری سونپی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام زبانوں کی طرح اردو کے فروغ کے لیے میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنی تقریر میں 80 فیصد اردو الفاظ کا استعمال کرتا ہوں۔ اس وجہ سے مجھے سکون حاصل ہوتا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ انیمیش کمار نے سلور جوبلی تقریب کے موقعے پر انسان اسکول شگشا نگر کے بانی پدم شری ڈاکٹر سید حسن سے انسان اسکول میں جا کر ملاقات کی اور کہا کہ سید بھائی سے ملنے کے بعد صحیح معنوں میں مجھے قلبی سکون حاصل ہوا ہے۔ اس موقعے پر مشہور سماجی کارکن محمد کلیم الدین نے کہا کہ ڈی ایم انیمیش کمار نے سلور جوبلی تقریب کو تاریخی بنا کر علاقے کے لوگوں کا دل جیت لیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے اردو دوستی کی جھلک پیش کرتے ہوئے اپنے دفتر اور رہائش پر بھی اردو میں نیم پلیٹ لگایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں بورڈ لگانے کی ہدایت دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ ان کے دل میں اردو کی ترقی کے لیے بے پناہ محبت ہے۔ پدم شری ڈاکٹر سید حسن نے کہا کہ ضلع مجسٹریٹ نے تعلیمی شعبہ میں انسان اسکول کی خدمات کا اعتراف کرکے صحیح معنوں میں مجھے شکریہ کا موقع عنایت کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جنوری 2015

رضا نقوی واہی کا صد سالہ جشن

پٹنہ: رضا نقوی واہی اردو میں طنز و مزاح نگاری کے امام ہیں، ان سے بڑا منظوم طنز و ظرافت نگار کوئی دوسرا نہیں ہے۔ رانچی کالج کے پروفیسر ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے اردو اکادمی کے سیمینار ہال میں رضا نقوی کے فن اور شخصیت پر منعقد جشن صد سالہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے کہا کہ اردو ادب میں طنز و ظرافت کی روایت جعفر زٹلی سے شروع ہوتی ہے۔ کئی دیگر شاعروں نے بھی طنز و مزاح کی اس روایت میں طبع آزمائی کی ہے جس میں فحش گوئی کے عنصر بھی شامل ہیں، مگر واہی نے طنز و مزاح کو فحش گوئی سے پاک وصاف رکھتے ہوئے معیاری طنز و مزاح کی روایت قائم کی۔ پروفیسر عین الحسن نے رضا نقوی واہی کی شاعری اور ادب کے حوالے سے کہا کہ واہی بذات خود ایک اکادمی تھے۔ انھیں صرف طنز و مزاح کے دائرے میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ واہی نے سماجی و معاشرتی اصلاح کے لیے شاعری کی۔ پروفیسر حسن عباس نے واہی کی شخصیت اور ان کے نظم ونثر کے حوالے سے کہا کہ ان کا دائرہ بہت ہی وسیع تھا، ان کی شاعری فنی اور عصری اعتبار سے بھی کافی اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے واہی کی شاعری اور ان کے طنز و مزاح کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے رضا نقوی واہی کی شاعری اور ان کے نثر کے حوالے سے پرمغز باتیں کہیں اس موقعے پر پروفیسر اسلم آزاد نے کہا اکبرالہ آبادی کے بعد واہی ظرافت نگاری کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جنوری 2015

رمز عظیم آبادی یادگاری خطبہ کا انعقاد

پٹنہ: رمز عظیم آبادی کو بھی وہی درجہ حاصل ہونا چاہیے جو پریم چند کو حاصل ہے مگر ادیبوں اور شاعروں نے انھیں وہ درجہ عطا نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ان خیالات کا اظہار راج بھاشا کے ڈائرکٹر رام بلاس پاسوان نے رمز عظیم آبادی کے یوم وفات پر منعقد یادگاری خطبہ کے موقعے پر کہیں۔ مشہور ادیب ممتاز احمد خاں نے کہا رمز اپنی نوعیت کے ایک منفرد شاعر تھے جس کی شاعری کی بڑے بڑے سخن وروں نے پذیرائی کی ہے۔ مشہور افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے ان کی نظم اور غزل کے حوالے سے بات چیت کرتے ہوئے کئی اہم گوشوں کی جانب اشارہ کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی شاعری زیادہ تر استحصال کو اجاگر کرنے کے لیے بے قرار دکھائی دیتی ہے۔ اشرف استھانوی نے رمز سے اپنی گہری وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری اور ان کی شخصیت کے حوالے سے کئی اہم باتیں بتائیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2015

رمز عظیم آبادی یادگاری خطبہ کا منظر

کاروانِ اردو بہار کے زیرِ اہتمام منعقدہ یوم اردو کا منظر

نظام آباد میں اردو تہذیبی وثقافتی میلے کا منظر

مارواڑی کالج میں پانچ روزہ اساتذہ تربیتی پروگرام

بھاگل پور: مارواڑی کالج کے شعبۂ اردو کے زیرِاہتمام کالج کے سیمینار ہال میں پانچ روزہ اساتذۂ کرام کا تربیتی پروگرام 'طریقۂ تدریس، زبان اور اردو سوال سازی' کے موضوع پر سیمینار کا انعقاد ہوا۔ پروگرام کا افتتاح تلکا مانجھی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر آر ایس دوبے، پرووائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر اے کے رائے اور ٹی ایم بی یو کے ڈی ایس ڈبلیو ڈاکٹر گرودیو پوددار وغیرہ نے کیا۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر آر ایس دوبے نے کہا کہ بھاگل پور میں اردو کے لیے پہلی بار تربیتی پروگرام ہو رہا ہے۔ اردو کسی خاص کمیونٹی کی زبان نہیں ہے اس لیے اس کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے اور اس کے فروغ میں سائنٹفک طریقہ اپنایا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہمیشہ سے ملک کی تہذیب کی زبان رہی ہے۔ یونیورسٹی کے پرووی سی پروفیسر ڈاکٹر اے کے رائے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تربیتی پروگرام سے اساتذہ کو نئی معلومات فراہم ہوں گی اور طریقہ تدریس میں نیاپن آئے گا۔ اس موقعے پر مارواڑی کالج کے شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر شاہد رزمی نے کہا کہ اردو کی تعلیم میں نکھار لانے اور اردو کے تئیں طلبہ میں بیداری آنے کے پیش نظر اساتذہ کے لیے پانچ روزہ تربیتی پروگرام منعقد کیے گئے ہیں۔ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور کے ڈاکٹر جی ایم سالک نے اردو اساتذہ میں اردو کے تئیں خامیوں اور اردو کی تعلیم کے طریقہ پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی انھوں نے اساتذہ کو طریقہ تعلیم کے کئی نکات بتائے۔ تربیتی پروگرام کا اہتمام قومی آزمائشی خدمات ہند کے ہندوستانی زبانوں کے مرکزی ادارہ میسور کے مالی تعاون سے ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جنوری 2015

غلام سرور کے یومِ پیدائش پر یومِ اردو منانے کا فیصلہ

پٹنہ: بہار میں یومِ اردو سالارِ اردو غلام سرور مرحوم کے یومِ پیدائش 10 جنوری کو سرکاری سطح پر بھی منایا جائے گا۔ یہ اعلان کاروان اردو، بہار کے زیراہتمام منعقد یوم اردو تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعلیٰ جیتن رام مانجھی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں ضروری کارروائی جلد ہی کی جائے گی۔ مانجھی نے کہا کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ غلام سرور کی قیادت میں چلائی گئی مہم کے نتیجے میں ہی حاصل ہوا۔ وزیراعلیٰ نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں اور ان دونوں کا یکساں فروغ ضروری ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ دوسری سرکاری زبان کے طور پر اردو کا فروغ اس طرح نہیں ہوسکا، جیسا ہونا چاہیے تھا۔ غلام سرور کو سچا خراجِ عقیدت یہی ہوگا کہ ہم ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ وزیراعلیٰ نے کہا ان کی حکومت اردو کے مکمل عملی نفاذ کے لیے کوشاں ہے اور اس سلسلے میں تمام ضروری اقدام کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا اردو اور ہندی پورے ملک میں رابطہ کی زبانیں ہیں۔ تحریک آزادی کے دوران بھی یہ دونوں زبانیں رابطے کی اہم کڑیاں تھیں۔ وزیراعلیٰ نے اردو کو بطور خاص محبت اور بھائی چارہ کی زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ محبت اور بھائی چارہ کے فروغ کے لیے اردو کا فروغ ضروری ہے۔ یوم اردو تقریب سے سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی، راشٹریہ جنتا دل کے ریاستی صدر ڈاکٹر رام چندر پوروے، رکن اسمبلی ڈاکٹر اظہار احمد، پروفیسر عبدالغفور، الحاج حسن احمد قادری اور صحافی اشرف استھانوی سمیت کئی مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیات اور مختلف اضلاع سے آئے کاروان اردو کے نمائندوں نے خطاب کیا۔ صدارت سابق ریاستی وزیر الیاس حسین نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر غلام غوث نے وزیراعلیٰ کو کاروان اردو کی طرف سے 14 نکاتی عرض داشت بھی پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جنوری 2015

تلنگانہ

نظام آباد میں اردو تہذیبی وثقافتی میلے کا انعقاد

نظام آباد: اُردو دلوں کو جوڑنے والی گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ساری دنیا کی مقبول عام زبان ہے۔ اس زبان کے ساتھ اس کا عظیم تر تہذیبی وثقافتی ورثہ جڑا ہے۔ یہ زبان انفارمیشن ٹیکنالوجی' کمپیوٹر' انٹرنیٹ اور سیل فون سے جڑ کر اب ایک عالمی زبان بن چکی ہے۔ اُردو کے اس عظیم لسانی اور تہذیبی ورثے کو اگلی نسل کو منتقل کرنے کے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں تاکہ اردو کا کاروان محبت یوں ہی اپنا سفر طے کرتا رہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب ایم اے فہیم ڈپٹی میئر میونسپل کارپوریشن نظام آباد، نے کریسنٹ اردو میڈیم اسکول میں منعقدہ ایک روزہ اردو میلے کے افتتاح کے موقع پر کیا۔ اس میلے کا اہتمام تحریک اردو تلنگانہ' اردو اسکالرس اسوسی ایشن نظام آباد' کریسنٹ اسکول اور محبان اردو کی جانب سے کیا گیا تھا۔ جناب ایم اے فہیم نے اردو میلے کے انعقاد کو خوش آئند قرار دیا اور اُردو کے فروغ کے اقدامات میں تعاون کی پیشکش کی۔ جناب کرشناراؤ ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر نے طلبا کو میلے کے انعقاد کے لیے مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے کہا کہ اس طرح کے میلے کے کامیاب انعقاد سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے اور اب یہ زبان انٹرنیٹ اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے جڑ کر عالمی سطح کی مقبول زبان بن گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے کہا کہ اردو زبان کے ساتھ اس کی تہذیب وابستہ ہے اور موجودہ دور میں تہذیبی اقدار کو برقرار رکھنا ہو تو اردو کو عام کرنا ہوگا۔ جناب سید مجیب علی نے کہا کہ اُردو میڈیم طلبا کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس میلے کا شاندار انعقاد اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو میڈیم طلبا بھی عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ جناب خان ضیاء نے کہا کہ اس میلے کا انعقاد تلنگانہ اور ملکی وقومی سطح پر اردو کی گمشدہ تہذیب کی بازیافت کی کوشش ہے۔ آخر میں جناب نصیر مدرس کریسنٹ اسکول نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، اسلم فاروقی، نظام آباد، 3 فروری 2015

اردو ذریعہ تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

محبوب نگر: اردو عالمی سطح پر مقبول زبان ہے، اس

شولا پور میں سکندر احمد کی فن اور شخصیت پر سیمینار کا منظر

زبان کی شیرینی اور شعر و ادب نے لوگوں کو بلا لحاظ مذہب وملت اس کی جانب راغب کیا ہے، لوگ اردو شاعری کو پسند کرتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو ذریعہ تعلیم کو اختیار کرنے پر طلبہ کو راغب کریں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر بشیر احمد پرنسپل المدینہ کالج محبوب نگر ادارہ ادب اسلامی کی جانب سے ہیپنز اسکول پر منعقدہ ادبی اجلاس سے کیا وہ 'اردو ذریعہ تعلیم اور ہماری ذمے داریاں' کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بچہ کی ذہنی نشو ونما صرف اور صرف مادری زبان ہی میں ممکن ہے اکیسویں صدی میں ہر فرد کی ترجیح انگریزی زبان اپنے بچوں کو سکھانے کی ہے لیکن یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ انگریز بھی اپنے بچوں کو مادری زبان ہی میں تعلیم دلواتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے اپنے خطاب میں ادارہ ادب اسلامی کو فعال ادارہ قرار دیا جو سارے ہندوستان میں صالح ادب کے فروغ کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر سیادت علی صدر ادارہ ادب اسلامی ہند محبوب نگر نے کہا کہ نئی نسل انسانی کی بہترین پرورش کی ذمہ داری بنیادی طور پر والدین اور دوسرا اساتذہ کو قرار دیا۔ عبدالعزیز سہیل معتمد ادارہ ادب اسلامی محبوب نگر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر معید جاوید کی بحیثیت صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی منتخب ہونے پر تہنیت پیش کی گئی۔

پریس ریلیز، عبدالعزیز سہیل، ادارہ ادب اسلامی محبوب نگر، 17 جنوری 2015

جموں و کشمیر

راجوری میں نعتیہ مشاعرے کا انعقاد

جموں و کشمیر: راجوری/ ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے بزم شعرائے اردو راجوری نے دبستان ہمالہ راجوری اور ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کے چیرمین جناب فاروق مضطر کے تعاون سے لائبریری ہمالین ایجوکیشن سوسائٹی راجوری میں ایک نعتیہ مشاعرے کا انعقاد کیا۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ ادیب ودانشور نذیر قریشی نے فرمائی۔ بزرگ شاعر شہباز راجوروی اور خورشید بسمل نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ بعدہ بزم کے بانی صدر ڈاکٹر شمس کمال انجم نے بزم کی تاسیس اور نعتیہ مشاعرے کی غرض وغایت پر اختصار سے روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ پیر پنجال خطے کے اردو شعرا کے انجماد کو توڑنے، ان کی شعری صلاحیتوں اور شعری جذبوں کو متحرک کرنے کی غرض سے اس بزم کی تاسیس عمل میں لائی گی ہے۔ اور ہر ماہ کے پہلے اتوار کو پابندی کے ساتھ شعری نشستوں کے انعقاد کی کوشش کی جائے گی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر شمس کمال انجم، جموں و کشمیر، 9 جنوری 2015

کرناٹک:

بیدر میں اردو کی ترقی و بقا کی پانچویں نشست

بیدر: بچہ اور مادری زبان کا قریبی تعلق ہوتا ہے اسی لیے اردو والوں کو چاہیے کہ بچوں کو مادری زبان سیکھنے کا موقع فراہم کریں اور اردو میڈیم اسکولوں سے تعلیم دی جائے۔ یہ بات سخاوت علی سخاوت نے کہی۔ وہ ایم آر پلازا، تعلیم صدیق شاہ بیدر میں اردو کی ترقی و بقا کی پانچویں نشست میں 'مادری زبان کی افادیت' پر اپنا خصوصی مضمون پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ بلا لحاظ مذہب و ملت سب کی زبان اردو ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، پریم چند، کنہیا لال کپور، چکبست، جگن ناتھ آزاد کی زبان اردو تھی، جس پر اردو بجا طور پر فخر کرتی ہے۔ انگریزی ہندی، سنسکرت، کنڑا، مراٹھی اور تیلگو سے واقفیت اسی صورت میں ضروری ہے جب بچہ مادری زبان اردو سیکھے۔ اس موقعے جناب یوسف خان مدرس المظہر نے اردو شاعر بھارت بھوشن پنت مضمون بعنوان 'اردو اسی کی ہے جو اسے بولتا ہے: پڑھ کر سنایا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 7 جنوری 2015

مہاراشٹر:

سکندر احمد کے فن اور شخصیت پر سمینار

شولاپور : ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاونڈیشن شولاپور اور شعبہ اُردو سوشل کالج شولاپور کے زیرِ اہتمام معروف نقاد ور دانشور سکندر احمد کے فن اور شخصیت پر 5 جنوری 2014 کو یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس کے افتتاح مالیگاوں کے یعقوب برکت اللہ نے کیا۔ بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر شبیر اقبال دھولیہ، آصف اقبال، ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار شریک تھے۔ تقریب کی صدارت سوشل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم اے دلال نے کی۔ فاونڈیشن کے صدر سلطان اختر نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ معاصر نقادوں میں سکند احمد کا ہم پلہ نقاد نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر شبیر اقبال نے کہا کہ سکندر احمد کی علمی و تنقیدی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جی این شیخ نے انجام دیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت جناب یعقوب برکت اللہ نے کی۔ اس موقعے پر اشفاق انجم مالیگاوں، ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار اور رفیق جعفر پونہ نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ موسیٰ خان بطور مہمان شریک تھے۔ نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر عبدالرافع نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شبیر اقبال دھولیہ، ڈاکٹر غضنفر اقبال گلبرگہ، ڈاکٹر عبدالرشید شیخ شولاپور نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ بطور مہمان میور آر اِنڈی شریک تھے۔ ریسرچ اسکالر شمیہ باغبان نے نظامت کی۔

اختتامی تقریب سابق پرنسپل سوشل جونیر کالج اِعجاز نبی کاریگر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ بطور مہمان ایوب نلامندو شریک تھے۔ نظامت ریسرچ اسکالر شہناز اوسیکر نے کی۔

پریس ریلیز، سلطان اختر، شولاپور، 5 جنوری 2014

مغربی بنگال:

کلکتہ اردو کتاب میلہ

کلکتہ: ایک ایسے وقت میں جب اردو کے مستقبل کے تئیں اہل اردو فکر مند نظر آرہے ہیں، ایسے میں کلکتہ اردو کتاب میلے میں لاکھوں افراد کی بھیڑ اور بڑے پیمانے پر اردو کتابوں کی فروختگی مایوسی کے دور میں بھی اردو کے روشن مستقبل کے لیے امید جگاتی ہے۔ بنگال کی اردو تاریخ کا سب سے کامیاب ترین کلکتہ اردو کتاب میلے کا افتتاح 9 جنوری کو ہوا تھا اور 18 جنوری کو شام 9 بجے آل بنگال مشاعرے کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ممبر اسمبلی نینا اپادھیائے نے کہا کہ اردو ایک طلسماتی زبان ہے۔ اس کا سحر پوری دنیا پر طاری

ہے۔ اردو کے شیریں الفاظ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ نینا اپادھیائے نے کہا کہ ان کے شوہر اور ممبر پارلیمنٹ سدیپ بندو پادھیائے نے اردو کو اس کا حق دلانے کی جدوجہد کی ہے وہ ایک روشن تاریخ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی اردو زبان سے محبت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وزارت اعلیٰ کی کرسی سنبھالتے ہوئے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا، اردو اکادمی کے بجٹ میں سو فیصد اضافہ کردیا اور اردو اسکولوں کی حالت بھی بہتر ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بنگال اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے پورے ملک کو راہ دکھائے گی اور اردو کو ایک نئی منزل دے گی۔ ان دس دنوں میں مختلف ثقافتی و کلچر کا پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں بڑے پیمانے پر طلبا نے حصہ لیا۔ قرعہ کے ذریعے روزانہ ایک طالب علم کو لیپ ٹاپ دیا گیا۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر منال شاہ قادری نے اس سال کے میلہ کو سب سے کامیاب ترین میلہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ پہلی مرتبہ یہاں بڑے پیمانے پر کتابوں کی خرداری ہوئی۔ باہر سے آنے والے پبلشرز خریداری سے مطمئن ہیں۔ ڈپٹی سکریٹری نشاط عالم کے مطابق اس سال کم وبیش 20 لاکھ روپیہ کی کتابوں کی خریداری ہوئی ہے۔ کلکتہ کتاب میلے میں جو ثقافتی پرگرام منعقد ہوئے اس میں ایک شام منور رانا کے نام، شام غزل، قوالی، ڈرامہ، تمثیلی مشاعرہ، خواتین کا مشاعرہ اور آل بنگال مشاعرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ اسکولی طلبا کے لیے تقریری، تحریری اور ڈرائنگ کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 20 جنوری 2015

تہذیب و ثقافت:

صوفی گلوکار وحادت رمیز کی غزل سرائی

گڑگاؤں: میونسپل کارپوریشن اور ہریانہ انسٹی ٹیوٹ آف پرفارمنگ آرٹ کے زیراہتمام صوفی نائٹ کا انعقاد کیا

گیا۔ اس میں پاکستان کے مشہور صوفی گلوکار وحادت رمیز نے اپنے صوفیانہ نغموں، غزلوں سے سائبرسٹی والوں کا دل جیت لیا۔ انھوں نے پروگرام کی شروعات پنجابی گیت 'رانجھا رانجھا کرتی ہیں، میں نی جانا کھیڑیا دی نال' سے کی اور کشور کمار جی کا مشہور گیت 'زندگی کے سفر میں جو گزر جاتے ہیں جو مقام، وہ پھر نہیں آتے' گاکر سامعین کا دل جیت لیا۔ جیسے ہی وحادت نے 'رنجش ہی سہی دل کو دکھانے کے لیے آ، آپھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ' غزل گائی تو سننے والے واہ واہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس سے پہلے ہریانہ انسٹی ٹیوٹ آف پرفارمنگ آرٹ کے چیئرمین وشودیپک ترکھا نے کہا کہ 14 مارچ سے میونسپل کارپوریشن کی طرف سے ہر ہفتہ کے روز سانسکرت پروگرام منعقد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستانی فنکار تین ماہ بعد ایک بار پھر یہاں آئیں گے۔ صوفی گلوکار وحادت رمیز نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ انھیں اس بات کا احساس تک نہیں ہورہا ہے کہ وہ بھارت میں ہیں۔ یہاں اتنا پیار اور اپنا پن محسوس ہورہا ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ پاکستان سے باہر آیا ہوں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 5 فروری 2015

عالمی یوم یونانی میڈیسن ایوارڈ 2015 کا منظر

اعزاز و اکرام:

عالمی یوم یونانی میڈیسن ایوارڈ 2015

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے زیراہتمام منعقدہ عالمی یوم یونانی میڈیسن کے موقعے پر طب یونانی کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دینے والے اطبا اور صحافیوں کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ان میں ہمالیہ ڈرگ کمپنی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، کیور ہربل ریمیڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر قمرالزماں سہارنپوری کو حکیم اجمل خان ایوارڈ برائے معیاری یونانی دواسازی اور پروفیسر ڈاکٹر ایم ایس بانسو (بریلی) کو آیورویدک دواؤں کے لیے دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر جن صحافیوں کو ایوارڈ دیے گئے ان میں ہندوستان ایکسپریس کے بیورو چیف اور آزاد ایکسپریس ڈاٹ کام کے ایڈیٹر اے این شبلی کو اے یو اعظمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ راہل آنند (نوبھارت ٹائمز)، عبدالباری مسعود (مسلم مرر)، خواجہ رشید الدین (ڈرگ ٹوڈے)، مسٹر امت کسانہ (دینک جاگرن) اور ایس ایم فیصل (الائٹ ایڈورٹائزنگ ایجنسی) شامل ہیں۔ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر افضال احمد (سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کہا کہ طب یونانی ہندوستان کے مقبول عام علاج میں سے ہے۔ اس کی اپنی تھیوریز اور فلاسفیز ہیں جن کے تناظر میں صحت کی بقا اور بیماریوں کے انسداد کی تدابیر تلاش کی جاتی ہیں۔ اب یونانی وزارت آیوش میں شامل ہے اور اس کی شناخت اپنے فلسفہ اور تھیوریز کے علاوہ اردو زبان کے ساتھ ہے، جس دن اردو ہٹالی جائے گی طب یونانی کا وجود ختم ہوجائے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ عالمی یوم طب یونانی کے موقعے پر منعقد ہونے والے اس نیشنل سیمینار میں جو عنوان طے کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی طرف سے مجاہد آزادی مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یوم پیدائش کی مناسبت سے 12 فروری کو عالمی یونانی ڈے کے موقعے پر تنظیم کے بانی رکن اور سینئر نائب صدر حکیم صیانت اللہ امروہوی کی حیات اور خدمات پر جو مجلّہ شائع کیا گیا ہے اس کے لیے میں جملہ اراکین طبی کانگریس کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کانگریس پارٹی کے رہنما اور سابق رکن پارلیمنٹ م افضل، ڈاکٹر راشد اللہ خان (نائب صدر، سی سی آئی ایم) نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شبنم انصاری اور ڈاکٹر الکا شرما نے جبکہ مولانا محب اللہ خاں ندوی کی تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ تنظیم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد خاں نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 13 فروری 2015

اردو رابطہ کمیٹی ہاپوڑ کے زیراہتمام فروغ اردو ایوارڈ

ہاپوڑ: ریاست میں اردو کی خستہ حالی دور کرنے اور

اس کی ترویج و ترقی کے لیے اتر پردیش اردو رابطہ کمیٹی آؤ پڑھیں سوسائٹی ہاپوڑ کے زیراہتمام مشاعرہ اور فروغ اردو ایوارڈ پروگرام 2014 میں ریاستی وزیر کابینہ برائے روزگار ومحنت شاہد منظور احمد کو بطور خصوصی مہمان مدعو کیا گیا۔ اس موقعے پر بطور مہمان ذی وقار روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے کہا کہ حکومت مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی حل کردے تو ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی ترقی کی راہیں مزید ہموار ہو سکتی ہیں۔ بطور مہمان خصوصی ریاستی کابینہ وزیر شاہد منظور نے کہا کہ مدرسوں سے اردو کم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے دین کو سمجھنے کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اگر دین و مذہب کو سمجھنا ہے تو اپنی زبان اردو کو زندہ رکھنا ہوگا اور ہمیں اپنی نسلوں کو اردو کی تعلیم دلانی ہوگی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ مدرسوں میں دوبارہ اردو کا نظام قائم کیا جائے تاکہ اردو کی ترقی ہو سکے۔ پروگرام کی صدارت کررہے پدم شری سابق ایم پی راجیہ سبھا بیکل اتساہی نے کہا کہ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ مکمل تہذیب ہے۔ ڈی ڈی اردو سیریل کہاں گئے وہ لوگ کی پروڈیوسر سعدیہ رحمٰن نے کہا کہ اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جس کا تعلق کسی مذہب سے نہیں اور نہ ہی کسی خاص علاقہ سے ہے۔ آؤ پڑھیں سوسائٹی کے چیئرپرسن مشرف چودھری نے بھی اردو کے فروغ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس سے قبل پدم شری بیکل اتساہی کو آؤ پڑھو سوسائٹی اور اتر پردیش اردو رابطہ کمیٹی کی جانب سے فصیح چودھری اور محترمہ مشرف چودھری نے شال اور فروغ اردو ایوارڈ سے نوازا۔ کابینی وزیر شاہد منظور کو بیکل اتساہی نے فروغ اردو ایوارڈ دے کر سرفراز کیا۔ جبکہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی کو کابینی وزیر شاہد منظور نے فروغ اردو ایوارڈ 2014 دے کر ان کی عزت افزائی کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 جنوری 2015

جامعہ طیبات میں تقسیم اسناد کا انعقاد

سہارنپور: لڑکیوں کے تعلیمی ادارہ جامعہ طیبات میں تقسیم اسناد کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ ڈی آئی جی رینج اشوک راگھو علیگ کے ہاتھوں طالبات کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ یہ اسناد جامعہ کے سینٹر پروفشنل اوپن اسکول سے ہائی اسکول، انٹر کے علاوہ فروغ اردو کونسل کے اردو، عربی ڈپلومہ کے علاوہ عربی فارسی مدرسہ بورڈ سے مولوی، عالم اور کامل کرنے والی کل 19 طالبات کو دی گئیں۔ طالبات نے یہ اسناد جامعہ میں زیر تعلیم رہتے ہوئے اضافی طور پر ان کورسیز کا امتحان دینے اور کامیاب ہونے پر حاصل کی ہیں۔ مہمان خصوصی ڈی آئی جی نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے طلبا کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس موقعے پر جامعہ کے ناظم مولانا یعقوب بلند شہری نے جامعہ کے قیام کا پس منظر اور اس کی جدوجہد اور خدمات کی روداد پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ جامعہ میں ملک کی 8 ریاستوں کی 150 طالبات زیر تعلیم ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 جنوری 2015

پروفیسر حمید سہروردی، انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے نئے صدر

گلبرگہ: انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی مجلس عاملہ کی سہ سالہ میعاد کی تکمیل پر جناب لاڈلے پٹیل کی نگرانی میں انتخاب عمل میں آیا۔ حسب ذیل عہدے داران و اراکین مجلس عاملہ بلا مقابلہ منتخب ہوئے جس میں پروفیسر حمید سہروردی صدر، جناب امجد جاوید

ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی نائب صدور، جناب محمد مجیب احمد شریک معتمد، خواجہ پاشاہ انعامدار معتمد تنظیمی اور جناب ولی احمد خازن کے عہدوں پر منتخب ہوئے۔ اراکین عاملہ کے لیے جناب حامد اکمل، ڈاکٹر رفیق رہبر، پروفیسر عبدالحمید اکبر، جناب میر شاہنواز شاہین، ڈاکٹر وحید انجم، ڈاکٹر محمد افتخار الدین اختر، جناب واجد اختر صدیقی اور ڈاکٹر محمد رکن الدین ناصب قریشی بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ اس موقعے پر تمام اراکین عاملہ اور منتخب صدر وسکریٹری اور دیگر ذمے دار عہدے داروں نے ایک دوسرے کو تہنیت و مبارکباد پیش کی اور ادارے کی ترقی کے لیے عہد و پیمان کیا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 11 جنوری 2015

ڈاکٹر عمران احمد عندلیب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر مقرر

نئی دہلی: گذشتہ برسوں میں اشاعتی میدان میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے مکتبہ جامعہ کے نئے مینیجنگ ڈائریکٹر کے طور پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر عمران احمد عندلیب نے باقاعدہ ذمے داری سنبھال لی ہے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد نے اس عہدے پر انھیں مقرر کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل مکتبہ کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر شعبۂ اردو کے سینئر استاد پروفیسر خالد محمود اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، جنھوں نے قومی کونسل کے اشتراک سے 300 کتابوں کی 3 لاکھ سے زائد کاپیاں چھپوا کر مکتبہ کی نشاۃ ثانیہ کی تھی۔ ڈاکٹر عمران احمد عندلیب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 جنوری 2015

شاعر کوثر زیدی کیرانوی کو قومی یکجہتی ایوارڈ

رڑکی: سال نو پر رڑکی کی میونسپل بورڈ کے میٹنگ ہال میں آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں کیرانہ کے شاعر کوثر زیدی کیرانوی کو 'قومی یکجہتی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ مشاعرہ کی نظامت گلزار جگر جبکہ صدارت شہزاد انصاری نے کی۔ مشاعرے کا آغاز عثمان عثمانی کی نعت سے ہوا۔ بعد ازاں سراج پیکر پانی پتی، نعیم اختر، شناور کرتپوری، عبداللہ راز دیوبندی، انصار صدیقی کیرانوی، زکریا گوہر، عظمیٰ پروین کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی اپنے کلام پیش کیے۔ آخر میں کنوینر مشاعرہ قیوم بسمل نے حاضرین اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جنوری 2015

اردو رابطہ کمیٹی کی جانب سے فاروق احمد ایڈووکیٹ کو اعزاز

لکھنؤ: مادری زبان کی حیثیت سے اسکولوں میں اردو کو جو طلبہ پڑھنا چاہیں انھیں سہ لسانی فارمولہ کے تحت اس کا

موقع دیا جانا چاہیے۔ اردو کو اس کا حق اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک کہ اسکولوں میں اردو پڑھانے کا انتظام حکومت نہیں کرے گی۔ آٹھویں درجہ تک اردو کی تعلیم کا نظم ہونا چاہیے۔ اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب ہے۔ یہ باتیں جسٹس حیدر عباس رضا نے جے شنکر پرساد ہال میں منعقد اعزازی جلسہ میں کہیں۔ تقریب کا انعقاد یوپی اردو رابطہ کمیٹی کی جانب سے فاروق احمد ایڈوکیٹ کو اعزاز دینے کے لیے کیا گیا تھا، جن کی قانونی کوششوں سے یوپی میں اردو اکادمی، فخرالدین علی احمد کمیٹی، ریاستی اقلیتی کمیشن اور مدرسہ تعلیمی بورڈ کی تشکیل موجودہ حکومت میں ہوئی۔ فاروق احمد ایڈوکیٹ کی اردو خدمات کے اعتراف میں انھیں ایک مومنٹو اور شال پیش کیا گیا۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ فاروق احمد ایڈوکیٹ نے قانون کے ذریعہ اردو کے گم گشتہ حقوق کی بازیافت کے لیے جدوجہد کی وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان کے حق میں ایک فضا پیدا کی جائے، دکانوں پر اردو میں تختیاں لگائی جائیں۔ اس سے قبل مہمان اعزازی فاروق احمد ایڈوکیٹ نے اردو رابطہ کمیٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ پی آئی ایل کی اہمیت کو میں نے جسٹس حیدر عباس رضا صاحب سے ہی سمجھا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 10 جنوری 2015

قلمکارانِ برار کے اعزاز و اکرام کا منظر

قلم کارانِ برار کو اعزاز و اکرام

اکولہ: کل ہند بزمِ ادب و ثقافت کے بانی رفیق شادندوی کی کاوشوں سے بزمِ ہٰذا ہر سال علاقہ برار کے مستند و معتبر قلمکاروں کو اعزاز و اکرام سے سرفراز کرتی آرہی ہے۔ لہٰذا سال 2014 کے انعامات و اعزازات کے لیے 31 دسمبر کو اکولہ شہر کے پرمیلا تائی اوک ہال میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں علاقہ برار کے بزرگ و کہنہ مشق شاعر حضرت غلام حسین راز بالاپوری کو ان کی شعری و ادبی خدمات اور پانچ شعری مجموعوں کی اشاعت پر بزم کی جانب سے 'شاعر برار' کا ایوارڈ اور مبلغ گیارہ ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ جبکہ مشہور و معروف نقاد ڈاکٹر سید صفدر کو ان کی تنقیدی خدمات کے لیے 'ناقدِ برار' کا خطاب اور مبلغ گیارہ ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ یافتہ عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب و کثیر الجہات فنکار ڈاکٹر محبوب راہی کو ان کی بے مثال ادبی خدمات پر بزم کی جانب سے 'محاصلِ زیست' ایوارڈ اور اکیس ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ اس موقعے پر برار کے بزرگ و کہنہ مشق شاعر اقبال خلش کے تازہ ترین شعری مجموعہ 'یہ خلش یہ سوز آگہی' کا اجرا ڈاکٹر راحت اندوری اور بانی بزم رفیق شاد اکولوی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔ بزم کی جانب سے مذکورہ شعری مجموعے کی کاپی مبلغ پچیس ہزار روپے میں خرید کر اقبال خلش صاحب کو مالی اعانت کی گئی۔ مذکورہ تقاریب کے انعقاد و انصرام کے لیے بانی بزم علامہ مولانا رفیق شاد اکولوی، نعیم فراز، شمیم فرحت، ساجد محشر، ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی، ڈاکٹر ناصر الدین انصار اور اراکین کل ہند بزم ادب و ثقافت و اراکینِ دبستانِ برار نے جدوجہد کی۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی (مدرس)، اکولہ، 15 جنوری 2015

تومیو مزوکامی اور مورا کامی اسوکا کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام

الٰہ آباد: اکھل بھارتی بھاشا ساہتیہ سمیلن کے زیراہتمام ایک اعزازیہ پروگرام کا انعقاد ڈاکٹر یاسمین سلطانہ کی رہائش گاہ سول لائن پر کیا گیا، جس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ اس موقعے پر ادبی و سماجی تنظیم 'سمنوئے' کی بانی ڈاکٹر یاسمین سلطانہ نے جاپان سے آئے مہمان خصوصی تومیو مزوکامی اور مورا کامی اسوکا کا تعارف پیش کیا۔ میزوکامی نے جاپان میں اردو کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو پیار کی بھاشا ہے۔ ہم نے اتنی شیریں زبان کا مشاہدہ ہندوستان میں آکر کیا ہے۔ انھوں نے ہندی اردو کے ملن کو گنگا جمنی تہذیب کا سنگم قرار دیا۔ خیال رہے کہ مورا کامی اسوکا الٰہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ریسرچ کررہی ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو کے حوالے سے کہا کہ اکھل بھارتی بھاشا ساہتیہ سمیلن جہاں ہندی زبان کے فروغ میں کام کررہی ہے وہیں وہ اردو زبان کے ارتقا میں بھی پیش پیش رہتی ہے۔ شکریہ کی رسم ڈاکٹر یاسمین سلطانہ نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 دسمبر 2014

رسم اجرا:

نعتِ محمدی

رامپور: رضا لائبریری کے ذریعے شائع خواجہ ضیاء الدین برنی کی 'نعت محمدی' کا اجرا کرتے ہوئے ڈائرکٹر دارالمصنفین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ ضیاء الدین برنی نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے عالموں سے تعلیم حاصل کی تھی وہ شیخ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔ انھوں نے بتایا کہ خواجہ ضیاء الدین برنی کے صحیفہ نعت محمدی کا ایک ہی مخطوطہ دنیا میں ہے جو اس وقت رضا لائبریری میں ہے اور اسی مخطوطہ کو ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر عزیز الدین حسین نے فارسی میں شائع کرایا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر ظلی نے بتایا کہ 1952 میں پروفیسر سید نورالحسن نے انکشاف کیا تھا کہ رضا لائبریری میں ضیاء الدین برنی کا نعت محمدی کا مخطوطہ ہے جو دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ ہندوستان میں پہلے سیرت نگار ضیاء الدین برنی تھے جنھوں نے نبی آخرالزماں کی شان میں جو تحریر لکھی ہے وہ ایک تاریخی شواہد ہے اور اگر انسان آنکھیں بند کرلے تو ایسا لگے گا جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پروفیسر ابھے سنگھ نے کہا کہ ڈائرکٹر رضا لائبریری نے برنی کا وہ مخطوطہ تلاش کرلیا جو اسکالرز کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جنوری 2015

مگر ایک شاخ نہال غم

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکیڈمک اسٹاف کالج میں جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد کے ہاتھوں ڈاکٹر رخشندہ روحی کی کہانیوں کا مجموعہ 'مگر ایک شاخ نہال غم' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کہانی موجودہ دور کے مسلم معاشرے میں خواتین کے ساتھ مردوں کی طرف سے ہونے والے غیرمساویانہ سلوک پر مشتمل ہے۔

کتاب میں ہندوستان، عراق، سعودی عرب سمیت مختلف ممالک کی خواتین کی 13 کہانیاں ہیں جو مردوں کے خوف سے اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں کرپاتیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 15 جنوری 2015

خواب سحر

نئی دهلی: جامعہ برادری نے اپنے اساتذہ کو خراج تحسین ادا کرنے کی روایت کو نئے انداز سے آگے بڑھاتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انگریزی شعبہ کے سابق پروفیسر انور صدیقی مرحوم کے شعری مجموعہ خواب سحر کے اجرا کی تقریب منعقد کی۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ جامعہ کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ اس کے اساتذہ تدریس کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کے بھی حامل ہیں۔ پروفیسر ایم اسدالدین نے کہا کہ پروفیسر انور صدیقی مرحوم سابق صدر شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اردو اور انگریزی دونوں زبان میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم کے تحریر کردہ شعری مجموعہ 'خوابِ سحر' میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں کتاب کا نام 'خواب سحر' تجویز کر رکھا تھا لیکن انھیں چھپوانے کا موقعہ نہیں ملا۔ ان کی اہلیہ محترمہ قدسیہ نے مذکورہ کتاب کو شائع کر کے ان کے خوابوں کی تکمیل کی ہے۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 14 جنوری 2015

سرکاری احکام نامہ برائے اردو مترجمین

مظفر نگر: اتر پردیش اردو انوادک راجیہ کرمچاری سنگھ کے زیر اہتمام ضلع دفتر پر اردو مترجمین سے متعلق 'سرکاری احکام نامہ برائے اردو مترجمین' کے نام منسوب ایک مجموعہ کا اجرا عمل میں آیا۔ جس میں سنگھ کے ریاستی نائب صدر تحسین علی مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ضلع صدر محمد مستقیم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پہلی مرتبہ ایسی کوشش کی گئی ہے جس میں اردو مترجمین سے متعلق تمام سرکاری احکامات شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے مختلف دفاتر میں تعینات اردو مترجمین کے سامنے آرہی بے ضابطگیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تنظیم نے ریاستی سطح پر ایک مجموعہ نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں اردو مترجمین کو آنے والی مشکلات اور فائدہ مند سرکاری حکم نامے شامل کیے گئے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 جنوری 2015

انتخاب کلام اثر

پانی پت: ہریانہ وقف بورڈ کے صدر دفتر میں منعقد

ایک اہم تقریب میں 20 ویں صدی کے عظیم شاعر نواب امداد اثر کے منتخبہ کلام کے مجموعہ 'انتخاب کلام اثر' کی رسم اجرا عمل میں آئی، یہ انتخاب بلند پایہ محقق اور چوٹی کے انشا پرداز علامہ قیوم خضر کا مرتب کردہ ہے۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے وقف بورڈ کے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر امتیاز خضر نے کہا کہ اس انتخاب کا منظر عام پر آنا گویا شمس العلما نواب امداد امام اثر کی شاعری کی نشاۃ ثانیہ ہے، انھوں نے کہا امداد امام اثر کے کلام میں مرزا اسداللہ غالب کے کلام کی سی تاثیر اور میر کا لہجہ بدرجہ اتم موجود ہے، غزل کی دنیا میں یہ نئی پیش رفت ہے۔ وقف آفیسر عظمت خان نے کہا کہ امداد اثر کی غزلوں میں غالب کا پیغام محسوس ہوتا ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جنوری 2015

کلیاتِ اقبال (گورمکھی رسم الخط)

مالیرکوٹله: پنجابی یونیورسٹی کی منعقدہ تین روزہ بین الاقوامی پنجابی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ناردرن ریجنل لینگویج سینٹر، پنجابی یونیورسٹی کے لیکچرار ڈاکٹر ندیم احمد ندیم کی نئی کاوش کلیات اقبال (گورمکھی رسم الخط) کی رسم رونمائی کی گئی۔ ڈاکٹر ندیم نے بتایا کہ اس کتاب کا مقصد پنجابی قارئین تک رسائی حاصل کرنا ہے تاکہ پنجاب کے ہی نامور سپوت اور عظیم دانشور ڈاکٹر محمد اقبال کا حیات بخش کلام مختلف لوگوں کی فیضیابی کا سرچشمہ بن سکے۔

روزنامہ ہند سماچار، جالندھر، 16 جنوری 2015

ترجمان دل

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور سید اطہرالدین میموریل سوسائٹی کے باہمی اشتراک سے معروف شاعر و ادیب سید اطہرالدین اطہر کے یوم پیدائش کے موقعے پر ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور ڈاکٹر فرقان سردھنوی، نے انجام دی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور مہمانان ذی وقار کے بطور ڈاکٹر کلدیپ اجول، سابق وزیر حکومت اتر پردیش، محترم اسد غالبین، چیئرمین، نگر پنچایت سردھنہ، واجد علی، ڈی آئی جی، بی ایس ایف شریک ہوئے۔ استقبالیہ کی رسم سید معراج الدین اور شکریے کی رسم محترم آفاق احمد خاں نے انجام دی۔ پھلاودہ کے معروف شاعر محترم انوارالحق شاداں کے پہلے شعری مجموعے 'ترجمان دل' کی نقاب کشائی کی گئی۔ یہ مجموعہ سید اطہرالدین میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد میرٹھ کے معروف ادیب و شاعر محترم سید محمد علی طالب زیدی کو ان کی مجموعی ادبی خدمات اور انوارالحق شاداں، پھلاودی کو ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں سند امتیاز، شال اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انوارالحق شاداں کی شاعری مابعد جدید عہد کی ترجمان ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تدبر' دہلی، 8 جنوری 2015

'افہامِ ادب'

هاوڑه: نئی نسل کے تازہ کار شاعر و ادیب ایم نصراللہ نصر کے تازہ تحقیقی و تاثراتی مضامین کا پہلا مجموعہ 'افہامِ ادب' کے اجرا کی تقریب 11 جنوری 2015 زیرِ اہتمام حلقۂ سخنوراں ہوڑہ ہائی اسکول کے خوبصورت ہال میں

منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت استادالشعرا قیصر شمیم نے کی اور نظامت شمس افتخاری (معتمد اعلیٰ ادارہ ھذا) نے کی۔ معروف شاعر و ادیب ایم علی (ہوڑہ) نے اپنے دلکش انداز اور خوبصورت لہجے میں تقریب کا افتتاح کیا۔ معروف سماجی کارکن اور قوم وملت کے ہمدرد جناب بلال حسن (سرپرست بزمِ نشاطؔ کولکاتا) نے کتاب کا اجرا کیا اور اپنی مختصر تقریر میں کتاب کی تعریف کی نیز ایک کتاب موصوف نے پانچ ہزار روپے میں خریدی۔ صدرِ جلسہ قیصر شمیم نے اپنی صدارتی تقریر میں کتاب کی خوبیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔

پریس ریلیز، ایم نصراللہ نصر، ہاوڑہ، 15 جنوری 2015

اجتماع

بنگلورو: منیر احمد جامی مدیر ادبی ایڈیشن روزنامہ 'سیاست' کی منفرد کتاب 'اجتماع' منظومات کا اجرا کرنے کے بعد اپنے صدارتی خطاب میں امیر شریعت مفتی محمد اشرف علی باقوی مہتمم دارالعلوم سبیل الرشاد نے کہا کہ مقالے اکثر نثر میں لکھے جاتے ہیں، مگر منیر احمد جامی نے منظوم مقالہ لکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ مفتی صاحب نے اس کتاب میں موجود بزرگانِ دین کے تعلق سے لکھے گئے کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ کلام میں سلاست اور طوالت واقعی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی مولانا مصطفیٰ رفاعی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ ایک اور مہمانِ خصوصی پروفیسر راہی فدائی نے

ڈاکٹر مظہر احمد کی کتاب 'اقوال یوسفی' کے اجرا کا منظر

بتایا کہ جامی نے منظوم کلام لکھ کر ایک منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ مولانا تاج الدین بابا بندہ نوازی، قاضی انیس الحق، سابق ڈائرکٹر دوردرشن کینڈرا، انور شریف چیئرمین، جمعہ مسجد ٹرسٹ اور جامی بڑے بھائی عبدالرحیم (مقیم امریکہ) نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات رکھے۔ صاحب کتاب منیر احمد جامی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

پریس ریلیز، عبداللہ سلمان ریاض، بنگلورو، 27 جنوری 2015

اردو میڈیا کل آج کل

حیدر آباد: قونصل جنرل ہندوستان متعینہ شکاگو ڈاکٹر اوصاف سعید نے نئی نسل کو اردو سے آشنا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ہم اپنے بچوں میں اردو کے متعلق دلچسپی پیدا کریں تا کہ اردو زندہ رہے اور سوشل میڈیا کے ذریعے اردو کو آگے بڑھائیں۔ آج دنیا بھر میں 85 ملین لوگ اردو بولتے ہیں ڈاکٹر اوصاف سعید کے بدست اتوار 18 جنوری کی شام ہوٹل امنول کانٹی نینٹل روبرو سکریٹریٹ حیدرآباد میں ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز ایڈیٹر گواہ اردو ویکلی کی تصنیف 'اردو میڈیا کل آج کل' کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ منظور الامین ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل دوردرشن نے صدارت کی۔ افتخار شریف ٹرسٹی چیئر فیڈریشن آف انڈیا ایسوسی ایشنس شکاگو، ظفر جاوید جنرل سکریٹری فیڈریشن آف اے پی بیناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنس کے علاوہ محمد اظہر الدین کے فرزند محمد اسدالدین عباس نے اعزازی مہمانوں کے طور پر شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 جنوری 2015

اقوال یوسفی کا اجرا

نئی دھلی: ذاکر حسین دہلی کالج ایوننگ میں اردو کے سینئر استاد ڈاکٹر مظہر احمد کی نئی کتاب 'اقوال یوسفی' کی رسم اجرا شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں عمل میں آئی۔ صدر شعبۂ اردو، پروفیسر ابن کنول نے کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر مظہر احمد کا شمار دہلی یونیورسٹی کے ان اساتذہ میں ہوتا ہے جو انتہائی سنجیدگی سے تنقیدی اور تحقیقی کام انجام دیتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اردو میں طنز و مزاح کی روایت پر بہت اہم کتابیں اردو قارئین کو پیش کی ہیں۔ اردو میں طنز و مزاح پر ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے لیکن ڈاکٹر مظہر احمد نے اس صنف پر خصوصی توجہ دے کر اپنا ایک اہم مقام بنا لیا ہے۔ 'اقوال یوسفی' مشتاق یوسفی کے طرز بیان اور طنز و مزاح کے معیار کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر علی جاوید نے ڈاکٹر مظہر کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے سماج میں طنز و مزاح کی روایت ختم ہوتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر مظہر احمد قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے مشتاق یوسفی پر یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس موقعے پر فکشن نقاد ڈاکٹر خالد اشرف کے علاوہ دوسرے اہم شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 3 فروری 2015

وفیات:

کلیم عاجز

پٹنہ: معروف شاعر و ادیب اور اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین و تبلیغی جماعت (بہار) کے صوبائی امیر ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کا 15 فروری کی صبح تقریباً 8 بجے ہزاری باغ میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 90 برس کے تھے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز

کی پیدائش 1925 میں تلہاڑا، نالندہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے بی اے اور ایم اے پٹنہ یونیورسٹی سے کیا۔ 1965 میں انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر کلیم عاجز نے پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ انھیں ان کی گراں قدر خدمات کے لیے پدم شری سے بھی نوازا گیا تھا۔ کلیم عاجز تقریباً ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی مشہور تصانیف میں: وہ جو شاعری کا سبب ہوا (پہلا مجموعہ کلام)، جب فصل بہاراں آئی تھی (دوسرا مجموعہ کلام) 'پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا (مجموعۂ کلام)، جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی (خودنوشت سوانح)، ابھی سن لو مجھ سے (خودنوشت سوانح)، کوچہ جاناں جاناں! (نظموں اور نعتوں کا مجموعہ، مجلس ادب (شعری نشستوں کی ایک روداد)، دیوانے دو (خطوط کا مجموعہ)، میری زبان میرا قلم (مجموعہ مضامین دو جلد میں)، دفتر گم گشتہ (پی ایچ ڈی کا مقالہ)، یہاں سے کعبہ کعبہ سے مدینہ (سفرنامہ حج)، ایک دیس اک بدیسی (سفرنامہ امریکہ)، کے علاوہ ان کی بھانجی نے اپنے نام خطوط کا مجموعہ اکٹھا کیا جسے خدابخش لائبریری نے شائع کیا ہے۔ ذرائع کے مطابق ڈاکٹر کلیم احمد عاجز حرمین شریفین اور امریکہ کے ساڑھے چار ماہ کے طویل دورے کے بعد حال ہی میں 24 جنوری کو واپس اپنے گھر پٹنہ لوٹے تھے۔ بعد ازاں وہ ہزاری باغ اور دھنباد جانے کے لیے نکلے تھے لیکن وہ دھنباد نہیں پہنچ سکے اور ان کی ہزاری باغ میں ہی طبیعت خراب ہوئی اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ کلیم عاجز کے انتقال سے عظیم آباد کی وہ علمی و ادبی روایت کا ایک باب رخصت ہوگیا جسے بیدل عظیم آبادی، وزیر علی عبرتی، جوشش، شورش، راسخ عظیم آبادی، امداد امام اثر اور شاد عظیم آبادی وغیرہ نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے قائم کیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 فروری 2015

پروفیسر سید محمد انوار احمد

نئی دھلی: پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر ڈاکٹر سید انوار احمد کا 20 جنوری کو علی الصبح مالویہ نگر نئی دہلی میں ان کے اکلوتے فرزند محمد ارمان کے گھر انتقال ہوگیا۔ مرحوم گزشتہ 2 سال سے اپولو اور ایمس میں زیر علاج تھے۔ انھیں مالویہ نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر سید محمد انوار احمد جنوری 1934 کو سبوے گاؤں ضلع جموئی (بہار) میں پیدا ہوئے تھے۔ پروفیسر سید انوار احمد پٹنہ یونیورسٹی سے صدر شعبہ فارسی کی حیثیت سے 1996 میں سبکدوش ہوئے تھے۔ فارسی زبان و ادب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 1995 میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ہاتھوں 'راشٹرپتی ایوارڈ' سے نوازا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ 'شانتی نکیتن شان فارسی ایوارڈ' سے بھی سرفراز کیے گئے۔ 2008 میں ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کی جانب سے انھیں 'سعدی ایوارڈ' عطا کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں ایک لڑکا سید محمد ارمان احمد اور 2 بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جنوری 2015

ڈاکٹر اوصاف احمد

نوئیڈا: مشہور و معروف ماہر اسلامی اقتصادیات ڈاکٹر اوصاف احمد کا طویل علالت کے بعد 22 جنوری کو شام 5 بجے انتقال ہوگیا۔ وہ 70 سال کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ نماز جنازہ اور تدفین نوئیڈا سیکٹر 94 میں (ایمٹی یونیورسٹی کے عقب میں واقع

قبرستان میں کی گئی۔ ان کی اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سے کم وبیش 22 سال تک وابستگی رہی اپنی بے پناہ علمی صلاحیت اور معاشی امور پر گرفت کی وجہ سے وہ ہندوستان کے مختلف تحقیقی اداروں سے منسلک تھے، اسلامک بنکنگ پر ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی بیشتر کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ملیالم، اردوسمیت کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ معروف کتابوں میں اسلامک بنکنگ کو درپیش چیلنج، اسلامی مالیاتی مارکیٹ کی جانب بڑھتا قدم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ایم فل کے بعد امریکہ کی ناردن ایلینوئس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے آئی ڈی بی کے علاوہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، اسلامی فقہ اکادمی نے بھی ان کی متعدد کتابیں شائع کیں، ڈاکٹر اوصاف احمد نے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ اور انٹرنیشنل لیبر آفس جنیوا کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 23 جنوری 2015

حماد انجم

نئی دہلی: سینئر صحافی سہیل انجم کے بڑے بھائی شاعر وادیب حماد انجم کا دل کا دورہ پڑنے سے اپنے آبائی وطن لوہرسن بازار ضلع سنت کبیرنگر اترپردیش میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 58 سال تھی۔ پسماندگان میں بیوہ، دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ ان کی تدفین آبائی قبرستان میں ہوئی۔

دو تین ماہ قبل وہ پھیپھڑے کے ایک عارضے میں مبتلا ہوئے جس کا علاج چل رہا تھا اور کافی افاقہ تھا لیکن اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ حماد انجم پیشے سے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر وادیب بھی تھے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'شمع حرا' ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ان کے دیگر شعری مجموعے 'بہار حمد'، 'شاخ گل تر' اور حال ہی میں شائع ہوا 'نورِ نادیدہ' ہیں۔ ان کے بھائیوں میں سہیل انجم کے علاوہ ڈاکٹر شمس کمال انجم (صدر شعبہ عربی باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں)، قمر جمال انجم اور آصف ہلال انجم ہیں۔ آخرالذکر دونوں بھائی سعودیہ عرب میں مقیم ہیں۔ پریس ریلیز، سلمان فیصل، 9 فروری 2014

ڈاکٹر نواب اقبال

نئی دہلی: سینٹ اسٹیفنز کالج کے شعبۂ اردو اور فارسی کے سابق صدر ڈاکٹر نواب اقبال احمد کا گزشتہ روز انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی تدفین سیدی پورہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں کالج کے اساتذہ اور ان کے سابق طلبا موجود تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے آصف اور شاہد ہیں۔ وہ 72 برس کے تھے اور گزشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ مرحوم نے 33 برس اس کالج میں تدریسی فرائض انجام دیے۔ انھوں نے اپنے کریئر کا آغاز اینگلوعربک اسکول میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے کیا تھا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم جنوری 2015

فیاض ٹانڈوی

ٹانڈہ: ضلع امبیڈکر نگر کے ممتاز نعت گو شاعر فیاض ٹانڈوی کا مورخہ 4 فروری کو 83 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ سکھاں (ٹانڈہ) میں نہ صرف ان کی رہائش تھی بلکہ نعت میں خصوصی انہماک کے سبب آس پاس کے اضلاع میں کافی مقبول تھے۔ ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقعے پر ان کے کسی نعتیہ مجموعے کی اشاعت اور رسم اجرا کی روایت تھی۔ دسویں نعتیہ مجموعہ کا مسودہ 'مدینہ ہر مومن کی جان' کا مسودہ وہ تین ماہ قبل ارسال کر چکے تھے۔ نواں مجموعہ اشاعت کی منزل میں تھا کہ وقت موعود آ گیا۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 5 فروری 2015

قومی اردو کونسل کے کارکن کو صدمہ

اورنگ آباد: 5 فروری 2015 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں ریسرچ آفیسر و سیل سیکشن کے انچارج جناب شاہنواز محمد خرم کے والد محمد سمیع انصاری کا دورانِ سفر بھونیشور میں انتقال ہوگیا۔ ان کی لاش کو ان کے آبائی وطن اورنگ آباد لایا گیا اور ان کی تجہیز وتکفین بعد نماز جمعہ اورنگ آباد کے نواڈیہہ قبرستان میں کی گئی۔ ان کے پسماندگان میں چھ بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔

شاہنواز محمد خرم بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ مرحوم کی پیدائش بہار کے اورنگ آباد ضلع میں ہوئی تھی۔ وہیں سے انھوں نے ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ بی کام پاس کیا۔ اورنگ آباد ہی میں واقع بھارتیہ اسٹیٹ بینک میں برانچ منیجر کے طور پر خدمات دے کر سبکدوش ہوئے۔ سیر وسیاحت ان کی زندگی کا اہم مشغلہ تھا لہٰذا ہندوستان کے کم وبیش تمام تاریخی وسیاحتی مقامات کا انھوں نے دورہ کیا ہوا تھا۔ نوکری سے سبک دوش ہونے کے بعد اپنی رفیق حیات کے ہمراہ 2011 میں حج کی سعادت حاصل کی۔ علاقے میں مرحوم اپنے اچھے اخلاق وفلاحی کاموں کے لیے مقبول تھے۔

پریس ریلیز: شہباز اسلم، اورنگ آباد، 7 فروری 2015

خراج عقیدت:

سید محمد مہدی

نئی دہلی: اردو کے مشہور وممتاز صحافی اور ڈرامہ نگار سید محمد مہدی کا علی گڑھ میں واقع 'ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی رحلت پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے سید محمد مہدی کی وفات کو اردو ڈرامے کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور کہا کہ وہ ایک ممتاز ترقی پسند ادیب تھے جو علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے معاصرین میں شامل تھے۔ سید محمد مہدی 1922 میں اترپردیش کے ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے بھوپال، کانپور اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ وہ بمبئی اور حیدرآباد کے کئی اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے۔ چونکہ انھیں ابتدا ہی سے ڈرامہ نویسی کا شوق تھا، اس لیے، انھوں نے کئی اہم اور مقبول ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کیے جن میں کفن، غالب کون، جانِ غزل، غالب کے اڑیں گے پرزے، اور امیر خسرو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جنوری 2015

سید حامد اور عبدالرحمٰن کو مشترکہ خراج عقیدت

علی گڑھ: جامعہ ہمدرد نئی دہلی کے سابق چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد صرف ایک انسان کا نام نہیں تھا بلکہ وہ اپنے آپ میں سرسید کی طرح ایک تحریک تھے۔ ان کے انتقال سے ملک میں تعلیمی دنیا ہی نہیں بلکہ انسانیت کو بھی زبردست نقصان پہنچا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر رضاء اللہ خاں نے مزمل منزل کامپلیکس میں ماہنامہ دا علی گڑھ موومینٹ، ملت بیداری مہم کمیٹی (ایم بی ایم سی) اور فورم فار مسلم اسٹڈیز اینڈ اینالائسس (ایف ایم ایس اے) کے زیرِ اہتمام منعقدہ خراجِ عقیدت جلسہ کی صدارت کرتے

ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ سید حامد ہی کی طرح پی ایس عبدالرحمٰن کا سانحہ ارتحال بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کسی عظیم خسارہ سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ہی شخصیات ہندوستان میں تعلیم، انسانیت، محبت اور رواداری کی مثال تھیں۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ سید حامد نے اے ایم یو کے وائس چانسلر کی حیثیت سے نہ صرف تعلیمی اور انتظامی اصلاح کی بلکہ کیمپس میں ڈسپلن کی بھی نئی جہات قائم کیں۔

روزنامہ'صحافت' دہلی، 10 جنوری 2015

محی الدین خاں ادیب

رام پور: صولت پبلک لائبریری میں ایک تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کی علمی، ادبی و سماجی شخصیت سابق سٹی کمشنر محکمہ بلدیہ محی الدین خاں ادیب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ہی مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ تعزیتی میٹنگ میں شرکا نے مرحوم کے اوصاف حمیدہ بیان کیے۔ اس موقعے پر شوکت علی خاں ایڈوکیٹ نے کہا کہ مرحوم کا حلقہ عمل صرف علم وادب ہی نہیں تھا بلکہ سماجی معاملات میں بھی خصوصی دخل تھا۔ معروف اسکالر عتیق جیلانی سالک نے کہا کہ مرحوم کی ادب پر گہری نگاہ تھی اور وہ قابل ترین شخصیت تھے۔ ایڈیٹر ضیا وجیہ ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی نے مرحوم محی الدین خاں ادیب کی شخصیت کو متعدد صفات کا مجموعہ قرار دیا۔ دبئی سے تشریف لائے مرحوم کے برادر خورد جاوید خاں نے انتہائی رنجیدہ لب ولہجہ میں بتایا کہ مرحوم نے زندگی کے کسی پل بھی انھیں اپنے والد کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اپنے خطبہ صدارت میں لائبریری کے صدر سین شین عالم نے محی الدین خاں ادیب کو صولت لائبریری کا محسن قرار دیتے ہوئے ان کی شخصیت کو ہمہ جہت پہلودار اور مشفق قرار دیا۔

روزنامہ'عزیز الہند' دہلی، 3 جنوری 2015

سید ظہیر الدین علوی

علی گڑھ: جامعہ اردو کیمپس میں جامعہ اردو علی گڑھ کے بانی سید ظہیرالدین علوی کا 51واں یومِ وفات نہایت

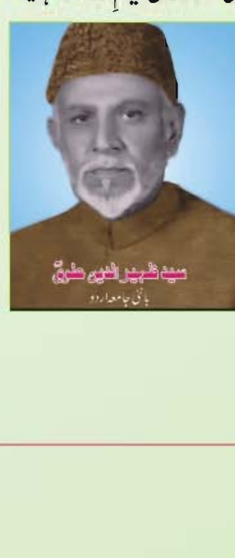

عقیدت و احترام کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر جامعہ اردو مشاورتی کونسل کے رکن پروفیسر ہمایوں مراد، او ایس ڈی فرحت علی خاں، پروفیسر سید اقبال علی، جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائریکٹر جسیم محمد، سید ظہیر الدین علوی کے فرزند سید معین الدین علوی وغیرہ نے بانی جامعہ اردو سید ظہیرالدین علوی کے مزار پر گل ہائے عقیدت پیش کیے۔ جامعہ اردو علی گڑھ میں سید ظہیر الدین علوی کی یاد میں منعقدہ عظیم الشان تقریب جامعہ اردو کی رجسٹرار محترمہ صباخاں، پروفیسر ہمایوں مراد، پروفیسر سید اقبال علی، او ایس ڈی فرحت علی خاں اور جامعہ اردو کے ڈائریکٹر جسیم محمد نے سید ظہیرالدین علوی کے اوصاف حمیدہ بیان کیے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سید ظہیرالدین علوی کے فرزند سید معین الدین علوی نے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ سبھی کو ہمارے والد کی قربانیاں یاد ہیں۔

پریس ریلیز، جسیم محمد، علی گڑھ، 12 جنوری 2015

انجم امروہی کو خراجِ عقیدت

امروهه: افسانوی دنیا میں ممتاز شہرت کے حامل افسانہ نگار انجم امروہی کے گزشتہ دنوں سانحہ ارتحال پر شہر کی ممتاز ثقافتی تنظیم اترپردیش اردو ادب سوسائٹی نے ان کو یاد کیا اور ان کی خدمات کی پذیرائی کی۔ شہر کے محلہ ملانہ میں زیرصدارت کوثر علی عباسی منعقد ہوئے اس جلسے میں اراکین انجمن اترپردیش اردو ادب سوسائٹی نے اپنی انجمن کے سابق رکن عبدالحق انجم کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے ان کے لکھے ہوئے افسانوں کا تذکرہ کیا۔ اس سلسلے میں کوثر علی عباسی نے کہا کہ عبدالحق انجم ایک ممتاز افسانہ نگار تھے جنھوں نے ہمیشہ اپنے قلم کی روشنی میں سماج کے اصلاح کے لیے افسانے لکھے۔ مزمل صدیقی نے اس سلسلے میں کہا کہ عبدالحق انجم نہ صرف ایک عظیم قلمکار تھے بلکہ ایک عمدہ استاد بھی تھے۔

روزنامہ'عزیز الہند'، دہلی، 5 فروری 2015

شاد عظیم آبادی کو خراجِ عقیدت

پٹنه: اہلِ عظیم آباد نے شاد عظیم آبادی کی قدر نہیں کی۔ یہ بات شاد کے 88ویں یوم وفات کے موقعے پر اردو کے اس عظیم شاعر کے مزار پر گلپوشی کے بعد ارباب اردو سے سماجی کارکن اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر ڈاکٹر انیل سلبھ نے کہی۔ انھوں نے اہل عظیم آباد سے کہا کہ انھوں نے شاد کو وہ حق نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ غزل کی آبرو اور ساری دنیا سے اپنی قادرالکلامی کا لوہا منوانے والے اس عظیم شاعر کی قدردانی کرنی چاہیے اور اس کے لیے ہمیں اقدام کرنا چاہیے جبکہ تقریب کے مہمان خصوصی حزب اختلاف کے لیڈر نند کشور یادو نے کہا کہ وہ شاد عظیم آبادی کے نام پر پارک کا نام رکھنے کے معاملے میں پیش قدمی کریں گے۔ یہ تقریب شاد عظیم آبادی اسٹڈی سرکل اور نوشکتی نکیتن نے مشترکہ طور پر شاد عظیم آبادی کے یوم وفات پر شاد منزل حاجی گنج میں منعقد کی تھی۔ شاد کے مزار پر گل پوشی کے بعد معززین نے شاد عظیم آبادی کی زندگی اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ شاد عظیم آبادی کے خانوادہ کے چشم و چراغ اور اسٹڈی سرکل کے سرپرست ڈاکٹر نثار احمد نے شاد منزل کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے والد ماجد سید نقی احمد نے شاد منزل کو بچانے کی کافی کوشش کی مگر سرکار کی عدم توجہی بھی اس کی تباہی کے لیے کم ذمے دار نہیں ہے۔ اس موقعے پر نند کشور یادو نے کہا کہ شاد جیسی ہستی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اس بات کا بھی وعدہ کیا کہ شاد منزل کے کھوئے ہوئے وقار کو لوٹانے میں سرکاری سطح پر مدد کریں گے۔ نوشکتی نکیتن کمیٹی کے سکریٹری کمل نین نے کہا کہ عظیم آباد کے لوگوں کو شاد نے جو سرمایہ عطا کیا ہے وہ بے انتہا بیش قیمتی ہے۔ یہ ہمارا اثاثہ ہے جسے ہمیں سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے شاد عظیم آبادی کے کلام کو ہندی میں بھی شائع کرنے کی صلاح دی تاکہ شاد کا پیغام عام لوگوں تک پہنچ سکے۔ شاد عظیم آبادی کے 88ویں یوم وفات کے موقعے پر مظہر عالم مخدومی اور انیل سلبھ کو سماجی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات سے سرفراز کیا گیا جبکہ اردو کی خدمت کے لیے بالمیکی رام شاد عظیم آبادی ایوارڈ سے، نوازے گئے۔ صدر شعبہ ہندی نالندہ کالج منظر عالم کو بھی ان کے گراں قدر خدمات کے لیے نوازا گیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 8 جنوری 2015

(2)

پٹنه: اردو ڈائریکٹوریٹ میں بھی یادگاری خطبہ پروگرام منعقد کیا گیا جس میں تین معزز ادیب وشاعر نے مقالے پڑھے۔ اس موقعے پر شاد کی پرپوتی پروفیسر شہناز فاطمی نے کی ان کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شاد عظیم آبادی سچے محب الوطن تھے۔ ان کی پیدائش 1846 میں اور وفات 1927 میں ہوئی تھی۔ ان کا پورا نام سید علی محمد تھا اور ان کے والد کا نام سید اظہار تھا۔ انھوں نے 11 برس کی عمر میں انگریزوں کی مخالفت کی تھی اسی زمانے میں انگریزوں نے ہندو مسلم کے مذہبی مقامات پر جانے پر پابندی لگا دی تھی لیکن شاد نے اس وقت اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی طاقت مذہبی آزادی نہیں چھین سکتی۔ دوسرے شرکا نے بھی مقالے پڑھے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 8 جنوری 2015

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) کامرس

ادارہ
صفحات: 306
قیمت: 141 روپے

زندگی نامہ: قرۃ العین

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 296
قیمت: 143 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

باقیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی
صفحات: 498
قیمت: 228 روپے

ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 549
قیمت: -/235 روپے

اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان
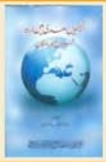

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 349
قیمت: -/163 روپے

عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)
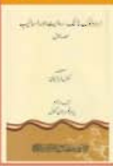

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)
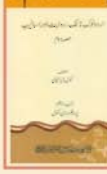

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

جسم وجاں

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 354
قیمت: -/138 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/02/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, March-2015, Vol.17, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

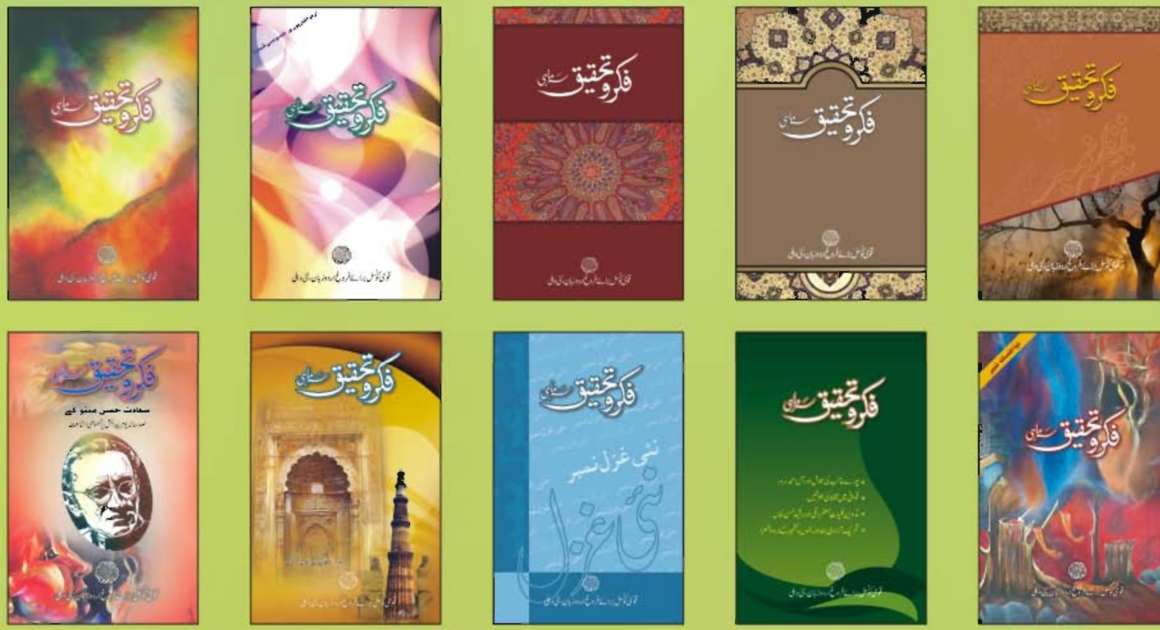

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000